mpire of Knowledge

ونے لال   ترجمہ: شفقت تنویر مرزا

علم کی سلطنت

مغرب کی بے رحم اجارا داری

ونے لال

ترجمہ: شفقت تنویر مرزا

ناشر: مشعل بکس

آر بی۔۵ سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن،

لاہور۔54600، پاکستان

علم کی سلطنت

مغرب کی بے رحم اجارہ داری

ونے لال

ترجمہ: شفقت تنویر مرزا

مشعل بکس

آر بی۔۵ سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن،

لاہور۔54600، پاکستان

فہرست

سر تسلیم

میں اس کتاب کے لیے شکر گزار ہوں اور ایک مدت سے شکر گزار ہوں۔ اپنے متعدد پرانے دوستوں، سیاست اور غور وفکر کی راہ کے ہم سفروں اور دوسرے بے شمار خیر خواہوں کا۔ سب سے پہلے تو میرا بھائی انیل ہے۔ انیل سے میں کوئی بیس برس تک ان موضوعات پر طویل گفتگو کرتا رہا، جو اس کتاب میں شامل ہیں، ان موقعوں پر روبی راجن بھی موجود ہوتا، طویل عرصہ گزرا تب وہ بڑا ترش رُو ہوتا تھا، نہ جانے اب وہ پر سکون ہو چکا ہے کہ نہیں۔ لیکن وہ میرے لیے ہمیشہ ایک دانشور جگری دوست بنا رہا۔ اسے فرقہ پرستوں، تارک الدنیا قسم کے لوگوں اور خود پرست دانشوروں سے بڑی نفرت تھی اور اس کا اظہار بڑے جوش کے ساتھ کیا کرتا۔ میں شکاگو میں اپنے دوستوں میں سے خاص طور پر برنارڈ کوہن اور دیپیش چکر برتی کا انتہائی شکر گزار ہوں۔ مجھے بارنی کی شاگردی پر انتہائی فخر ہے۔ یہی نہیں کہ میں ان کی تحریروں، ان کی داستان طرازی، ان کی پیچ در پیچ گفتار اور یادوں کی رم جھم کے ذریعے نو آبادیاتی عہد کے ہندوستان سے آشنا ہو سکا بلکہ میرے دوستوں میں بارنی ایک سچے ریڈیکل جمہوریت نواز تھے۔ دیپیش نے میری کتاب میں بڑی دلچسپی لی جس کے لیے اس کا بھرپور شکریہ۔

میں نے لاس اینجلز کی کیلی فورنیا یونیورسٹی میں دس سال انتہائی پر سکون ماحول میں گزارے۔ وہاں ایشاڈے، رسل لیونگ، ڈون نا کانشی، پیٹر نیبوکوف اور مائیکل سالمن نے کتاب لکھنے میں میری بڑی مدد کی۔ وہاں ڈینئل اور ارون دھتی نیومین بڑے اچھے دوست تھے۔ ٹیشومے گیبریل سے ایسی دوستی اور فکری قربت تھی کہ اس کے بیان کے لیے الفاظ ناکافی

ہیں۔ زبردست دوستی تو تھی ہی مگر اس کی اور خوبیاں بھی بے شمار ہیں۔ بہت پڑھا لکھا، دانا اور صائبؔ وقت کی چیرہ دستی سے بے نیاز اور مصروفیت کا بہانہ بنانے والوں کا بیری، اس کی فکری زندہ دلی اور چند اشاروں میں یا کسی مقولے یا ضرب المثل کے حوالے سے سارے کا سارا مطلب کھول کر بیان کرنے کی بے پناہ صلاحیت۔ ان اوصاف کے باعث وہ مجھے بہت عزیز ہے اور یقیناً ان کو بھی بہت پیارا ہے جو اس سے تحریک اور جذبہ لینے کے لیے آیا کرتے تھے۔

فکری سطح پر دوستی اور طرح طرح کی امداد کے لیے میں دل سے شکر گزار ہوں رونِدر جین (دہلی) فریڈرک اسپفل مارجیلن (نارتھمپٹن، میسا چوسٹس)، مکرند پرنجاپے (دہلی)، ہنری رنجیت (چنائی) منو کوٹھاری (ممبئی) ڈگلس لیومس (ٹوکیو/اوکیناوا) اور اکیرا اوسوکی (اوساکا) کا۔ چیکو اتسورو نے اوساکا میں میرے چار ماہ کے قیام کا اہتمام کیا۔ اسی قیام کے دوران میں اس کتاب کا خاکہ واضح شکل میں تیار کیا گیا۔ چیکو نے ہر ممکن کوشش کی کہ میرا یہ دورہ بڑا آرام دہ اور سودمند ثابت ہو۔ کتاب کا بہت سا حصہ لکھا جا رہا تھا تو اوانی اور بعد میں ایشان، انجو کے ساتھ بڑے سکون سے وقت گزارتے تھے۔ میں انجو کے ساتھ ساتھ اپنے سسرال والوں رام دھن اور کرشنا ریلن اور اپنے والدین کشوری لال اور شنو دیوی کا بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری اخلاقی اور مادی مدد کی۔

ضیاء الدین سردار اور اس کے خاندان کا بھی شکریہ کہ کئی سال ان کے گھر کے دروازے مجھ پر کھلے رہے۔ ان کی مہمان نوازی بے مثال ہے، مگر اس پر طرۃ ان کی آتش مزاجی، گفتگو کا ذوق اور پھر معاملات کی تہہ تک پہنچنے کا بے باکانہ انداز ہے۔ مجھے امید ہے انہیں یہ کتاب پسند آئے گی۔ اس کتاب کے بارے میں آشیس نندی سے مسلسل پندرہ سال بڑی پُر مایہ اور سیر حاصل گفتگو ہوتی رہی، نندی کی علمی بصیرت، میری فکر اور سوچ کے لئے بہت سودمند ثابت ہوئی۔ اور اس کی دوستی بھی لاجواب رہی۔

اس کتاب کے کچھ حصے مختلف صورتوں میں کچھ اور جگہوں پر بھی چھپتے رہے ہیں۔ ایک چھوٹا سا مضمون ''وقت کی نئی درجہ بندی:۔ ہزاریہ کی دہلیز پر وقت کی سیاسیات'' رسالہ Humanscape (بمبئی) جلد ۶ نمبر ۱۲، (دسمبر ۱۹۹۹) ۱۳۔۶ میں شائع ہوا تھا، اس پر نظر ثانی اور بڑے اضافے کے بعد یہاں کتاب کا پہلا باب بنایا گیا ہے۔ اس رسالے کا بانی بھائی جنیش شاہ بڑا کامیاب سٹاک بروکر تھا، اس نے یہ رسالہ شروع کیا۔ آخر کار آج وہ

ہندوستان کی غیر سرکاری تنظیموں (این جی اوز) کے افق پر حاوی نظر آتا ہے۔ یعنی این جی اوز میں اس نے بڑا نام کمایا ہے۔ اس نے بڑے شوق سے میرے مضمون بارہا چھاپے، اس کے علاوہ اس کی دوستی... دونوں کا شکریہ!

دوسرے باب ''سربسر تشدد'' کے کچھ حصے'' جدید نظام علوم کی عالمگیریت' حکمرانی، ماحولیات اور مستقبل کے درسیاتی علوم'' کے عنوان کے تحت رسالہ Emergences9 نمبرا (مئی ۱۹۹۹) ۹۷-۱۰۳ میں چھپے تھے۔ انسانی حقوق والا کچھ حصہ ''انسانی حقوق کا استعمار'' کے عنوان سے جزوی طور پر Focus on Law Studies 8 نمبر ا (فال ۱۹۹۷) ۵ ایف ایف میں چھپا تھا۔

باب سوئم میں بعض پیرے ''پابندیاں اور غلبے کی سیاست'' تکثیریت اور قانونیت عالمی میدان میں'' کے عنوان سے Social Scientist 25 نمبر ۵-۶ (مئی جون ۱۹۹۷) ۵۴-۶۷ میں چھپا تھا۔

ترقی پر چوتھے باب کے کچھ حصے متذکرہ رسالے ایمرجینسیز میں چھپے ''جدید نظام علوم کی عالمگیریت'' پر مبنی ہیں۔ عالم کے جامعاتی نظام (مضامین کی درمیانی اور علمی تقسیم) والا حصہ مختلف صورت میں Futures (فروری ۲۰۰۲) میں چھپنے والے ایک بڑے مضمون کا حصہ بنا۔

مہاتما گاندھی اور ماحول کا پانچواں باب۔ Envionmental Ethics22 نمبر ۲ (موسم گرما ۲۰۰۰) ۱۴۹-۶۸ میں چھپنے والے مضمون'' گاندھی اور ماحول کے حوالے سے زندگی کا تصور۔ ڈیپ اکالوجی سے آگے کی فکر'' پر مبنی ہے۔ اور چھٹے باب میں شامل کئی پیرے ''ہیومن سکیپ'' میں چھپنے والے کئی مضامین سے ماخوذ ہیں۔

نوٹ (جولائی ۲۰۰۵): اس ہندوستانی ایڈیشن میں (باب ہفتم کو) پہلے ایڈیشن (۲۰۰۲) کے پس نوشت کی جگہ دے دی گئی ہے۔ اس کے پہلے تین حصے اضافے اور نظر ثانی شدہ پس نوشت پر مشتمل ہیں۔ آخری باب میرے مضمون ''سلطنت اور امریکہ کے خواب'' پر مبنی ہے جو پہلی بار گلوبل ڈائیلاگ ۵ نمبر ۲-ا (ونٹر/سپرنگ ۲۰۰۳): ۴۴-۱۳۵ میں چھپا تھا۔

مجھے انتہائی دکھ ہے کہ جب پہلی مرتبہ یہ کتاب چھپی اس وقت برنارڈ ایس کوہن کا انتقال ہو چکا تھا۔ بیسویں صدی میں انڈین ہسٹری اور علم البشریات پر بارنی پہلے عالم ہیں جو میرے لیے استاد کا درجہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے شکاگو یونیورسٹی میں دو نسلوں کو پڑھایا۔ علم و فضل اپنی

جگہ، وہ بڑے نکتہ رَس اور سرعتِ ادراک کے مالک ہیں ۔ یہ صفات انا پرست مگر معروف استادوں میں کم ہی پائی جاتی ہیں۔ وہ سچے جمہوریت پسند (ڈیموکریٹ) تھے۔اس عرصے میں میری خوش قسمتی کہ میری دوستی ایک بے مثال فعال اور نفیس انسان ایس ایم محمد ادریس سے ہوگئی۔ وہ ایسے شخص ہیں جن سے ہر وقت ملنے کو جی چاہے۔ زندگی کا جوش و جذبہ، دلیل اور مکالمہ کے لیے تڑپ، بے پناہ توانائی اور انصاف اور مساوات کی بے تاب جستجو، یہ ان کی صفات تھیں جو مجھ تک پہنچیں۔ عمر کی ساتویں دہائی میں بھی وہ ان مقاصد کے حصول کے بارے میں ایسے سرگرم تھے کہ اپنے سے آدھی بلکہ ایک تہائی عمر والے کو بھی شرمندہ کر دیتے۔ اپنے گھر پنیانگ سے انہوں نے کئی تنظیمیں کھڑی کیں۔ ان کی رہبری کی۔ ان میں سے بعض تنظیموں کے نام ہیں: کنزیومرز ایسوسی ایشن آف پنیانگ (سی اے پی) صحابت عالم ملیشیا (دھرتی کے دوست۔ملیشیا) تھرڈ ورلڈ نیٹ ورک اور سٹیزنز انٹرنیشنل۔ ان تنظیموں نے ہزاروں لوگوں کو زندگی کی خوشیاں دی ہیں۔ انہیں پیار سے انکل ادریس کہا جاتا ہے۔ میں انکل ادریس اور سی اے پی کی اوما کا انتہائی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میرے ملیشیا کے ہر دورے کو خوشیوں سے بھر دیا۔

تعارف

''وہ کرتے جنگ ہیں مگر اسے کہتے ہیں امن'' (ا) پہلی عیسوی ہزاریہ میں ٹیسی ٹس نے یوں لکھا۔ 1999 کے موسم گرما کے اوائل میں جب میں نے یہ کتاب لکھنے کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ غور وخوض شروع کیا تو یہ الفاظ شدت کے ساتھ میرے دماغ میں گونجنے لگے۔ ایک مغربی سلطنت قائم کرنے کا عزم... اسے آپ ریاستہائے متحدہ امریکہ... نارتھ اٹلانٹک ٹریٹی آرگنائزیشن (نیٹو)، یورپین یونین، اِن میں سے کوئی سا بھی نام دے سکتے ہیں۔ یہ مغربی عزم ایک بار پھر مصر ہے کہ اس کی تاریخ ہی انسانیت کی عالمی تاریخ ہے۔ اس وقت علیحدگی اور آزادی کی تحریکوں کے باعث یوگوسلاویہ کے بچے کھچے نصف سے بھی کم حصے پر بموں کی بارش ہورہی تھی۔ جب یہ کتاب تیسری عیسوی ہزاری کے عین شروع میں تکمیل کے قریب پہنچ رہی تھی تو۔ مجھے معاف کیجیے گا۔ اس ہزاریہ کے بارے میں بڑا ہلا گلا ہوا تھا، جو سب کا سب کھوکھلا اور خالی خالی لگتا تھا۔ پندرہ پندرہ ہزار پاؤنڈ کے بڑے بڑے سپر بم طالبان کے پکے ٹھکانوں پر شعلوں کا طوفان اٹھا رہے تھے۔ اس کو دو سال سے اوپر کا عرصہ ہو چکا تھا مگر جنگی مشین اب بھی مصروف کار تھی۔ ٹوماہاکس اور سٹیلتھ فائٹرز طیارے زمینی فورس کے ساتھ ایسے بموں کی ایک نئی قسم یا نسل استعمال کر رہے تھے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ پہاڑوں میں گھرے ہوئے گہرے غاروں کی دیواریں بھی پھاڑ کر رکھ دیتی ہے۔ اس مرحلے پر نیٹو کے ارکان کے ساتھ اٹلی، آسٹریلیا اور کینیڈا کے فوجی بھی شامل کر لیے گئے تھے اور تاریخ میں پہلی بار نیٹو کے منشور کی اس شق کو بھی رُو بہ عمل لایا گیا کہ امریکہ پر حملہ پورے نیٹو اتحادیوں پر حملہ تصور کیا جائے گا۔

یوگوسلاویہ میں جس انداز سے ''امن'' قائم کیا گیا، یعنی ہمارے خیال میں یوگوسلاویہ کے عوام پر آفت نازل کی گئی، اس امن کو بجا طور پر زبردستی اور جبر کا نام دیا جا سکتا ہے۔ بلکہ

اس کا دوسرا نام ریاستی دہشت گردی ہے۔ اب یہی امید کی جا سکتی ہے کہ بالکل اسی قسم کا ''امن'' افغانستان میں قائم کیا جائے گا۔ افغانستان میں امریکہ کی جنگی کارروائی کے بڑے ناقدین کی رضامندی اس وعدے پر لی گئی تھی کہ اب اہل افغانستان کو راتوں کے خوفناک ہوائی حملوں سے نجات مل جائے گی۔ یہ ایسا امن ہے جو کسی دوسرے کی بالادستی قائم کرتا ہے۔ یہ ایسا امن ہے جو فوجیوں کے اتحاد کو برسر اقتدار لے آتا ہے۔ ان فوجیوں میں ایسے دغاباز اور ٹھگ بھی ہیں جنھوں نے ماضی میں افغانستان کو خوفناک انتشار میں مبتلا کر دیا۔ اب مہینوں کی مسلسل بمباری کے بعد یہی حل باقی رہ گیا ہے، باقی سارے دروازے بند ہو گئے ہیں۔

پورے سو سال پہلے امریکہ بھی دوسرے براعظموں میں اپنی سلطنت بنا رہا تھا اور جنوبی افریقہ میں جنگ بوئر میں مخالفوں کو موت کی نیند سلانے کے لیے قتل و غارت کا سلسلہ شروع کیا جا رہا تھا۔ اس وقت سلطنت برطانیہ ایک چوتھائی کرہ ارض پر محیط تھی اور کسی کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ بیسویں صدی کے نصف تک تمام یورپی طاقتیں اپنی نوآبادیوں سے محروم ہو جائیں گی۔ ان کے پاس اکا دکا دور دراز کی کالونی رہ جائے گی یا چھوٹے چھوٹے جزیروں کی تولیت۔ دانشوروں اور سرگرم سیاسی لوگوں کا خیال تھا کہ آزاد ہونے والے لوگوں کے لیے یہ آزادی بہت سی کامیابیوں کے امکانات لے کر آئی ہے۔ اور کچھ دیر کے لیے انھیں یہ خیال بھی آیا ہوگا کہ اب آزادی کا اصل سورج بھی طلوع ہونے والا ہے۔ یعنی لوگوں کو اس بات کا شعور حاصل ہوگا کہ وہ جبر کے کن حالات میں زندگی گزار رہے ہیں۔ یہی آزادی کا اصل مفہوم بھی ہے۔ ہر جگہ قوم پرستوں کی مزاحمت نے نوآبادیاتی نظام کو ختم کرنے میں اپنا کردار ادا کیا۔ لیکن زمینی سیاست کے نظریہ سازوں کا خیال تھا کہ دو عظیم جنگیں یورپی اقوام کے زوال کا بڑا سبب بنی ہیں۔ اس وقت سے اب تک مغرب کے بے شمار سیاسی مبصروں اور دانشوروں کا خیال ہے کہ آزاد کیے گئے ملکوں میں ایک صحیح اور اچھی قوم پرست تحریک نہیں ابھر سکے گی۔ یہاں کے لوگ اس کے اہل ہی نہیں۔ ان کا خیال تھا کہ یورپی طاقتیں بہت تھک گئی ہیں اور اسی تکان کی وجہ سے پسپائی اختیار کر رہی ہیں اور اب وہ جنگ سے تباہ شدہ معیشتوں کو بحال کرنے پر توجہ دیں گی۔ جبکہ انھی دانشوروں نے یہ بھی کہا کہ نوآبادیات کے ناشکرے باشندے یورپی طاقتوں کی عنایات کی قدر نہیں کریں گے۔ اور ان نوآزاد مقامی باشندوں کا بہترین استعمال یورپ کے بڑے بڑے شہروں میں ہے۔ اس پس منظر کے حوالے سے مابعد

نوآبادیات کے ماہرین اس صورت حال کو یوں یاد کر سکتے ہیں ''سلطنتیں پلٹ کر حاوی ہوں گی''۔ اس وقت دوسروں کے علاوہ بھارتی پاکستانی اور انڈونیشی باشندے یورپی ممالک کے لیے ضروری پیداوار افرادی قوت ثابت ہورہے تھے۔

یورپی ممالک کی نوآبادیات سے تقریباً پوری مراجعت، کمیونسٹ اقوام کی مایوسی، سوویت یونین کے ٹکڑے ہونے اور پرانے زمانے کے آہنی پردے کے پیچھے کے ممالک کے سرعام آنے اور ماہیت قلب ہونے کے ساتھ ہی امریکہ کے نئے عالمی نظام کی آمد کا اعلان کر دیا گیا۔ مگر ہوا یہ کہ فرسٹ ورلڈ یعنی پہلی دنیا اور تیسری دنیا میں امتیازات اور عدم مساوات بڑھتی چلی گئی۔ اقوام متحدہ کی انسانی ترقی سے متعلق آنے والی سلسلہ وار رپوٹوں میں بتایا گیا کہ مندرجہ ذیل پیچیدہ تر مسائل مزید پیچیدہ ہوتے جارہے ہیں اور افلاس، وسائل کی منتقلی اور محرومی نے بیروزگاری، ناخواندگی، ماحولیاتی زوال پذیری، تیسری دنیا کی جوہر قابل سے محرومی، صنعتی ناہمواری، آلودگی، آبادی کے شہروں کی طرف بڑھنے کا غیر معمولی رجحان اور شہروں کی یک دم توسیع، طبی سہولتوں وغیرہ کی کمی اور اسی قسم کے دوسرے مسائل، یہ سارے مسائل —— اب سابقہ نوآبادیات کے لوگوں پر دھاوا بول رہے ہیں۔

افلاس ایک ہولناک حقیقت ہے مگر اس حقیقت کا انکشاف کم اور اخفا زیادہ ہوتا ہے۔ سماجی سائنس دانوں نے افلاس کے بارے میں اس کی تعریف، اس کی تشہیر اور اس کے نظام کی ذمہ داری لے رکھی ہے مگر یہ سائنس اس بات کا شعور ہی نہیں رکھتی کہ چند ایک کی امیری ہی افلاس کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ جدیدیت پسندوں، آزادی پسندوں اور مارکسسٹوں نے مہاتما گاندھی کی اختیار کردہ غربت کو بورژوازی کے کھاتے میں ڈال دیا وگرنہ انہوں نے رضا کارانہ اور تفریحی نوعیت کی غربت کا جو معرکۃ الآرا تصور دیا تھا اور جسے رائج کرنے کی کوشش کی تھی (ماجد رہنما کے الفاظ میں) وہ تصور دراصل جدید نوعیت کے غربت کے تصور کی بھرپور تنقید تھا۔ بہر طور غربت کی طرف توجہ دلانے سے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دراصل اس طرح وہ اپنی ''پسماندگی'' کا ذکر کر رہے ہیں چنانچہ عالم فاضل لوگوں کے پاس اس لفظ کے دوسرے مفاہیم پر غور کرنے کے لیے وقت ہی نہیں ہے۔ مزید برآں معیشت دان کے پاس غربت کا صرف ایک ہی حل ہے کہ پیداوار بڑھائی جائے مگر اس بات پر کوئی غور نہیں کرتا کہ پیداوار میں اضافہ بھی اپنی قسم کی غربت پیدا کرتا ہے۔ آج کے دوسرے بڑے علوم نے بھی

اسی قسم کی کہانی گھڑ رکھی ہے۔ ترقی کی موجودہ صورت پر نقد ونظر شاید ہی برداشت کیا جاتا ہے۔ ایک مفروضہ ہے کہ بعض خاص ترقی پذیر ممالک کو ترقی یافتہ ممالک کی تقلید نہیں کرنی چاہیے مگر ان کے علوم میں اس بات کو کفر سمجھا جاتا ہے۔ یہ اصطلاحات ایک خاص معیار یا ترازو کی طرف دھیان دلاتی ہیں۔ اور وہ یہ کہ انیسویں صدی میں یہ تصور عام تھا کہ جن قوموں نے دوسری قوموں کو غلام (نوآبادی) بنا لیا ہے وہ کم محکوم قوموں کے مقابلے میں برتر حیثیت رکھتی تھیں اور انہوں نے مادی ترقی، اخلاقیات اور عقل وفکر کے اعتبار سے برتر مقام حاصل کر لیا تھا۔

نئے عالمی نظام میں قدیمی، پس ماندہ اور باغی کو عموماً نرمی اور کرم گستری کی مار دی جاتی ہے۔ کیونکہ روائتی حسن سلوک اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی کو کھلے عام نسل پرستی کی گالی دی جائے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کھلے عام اور ڈھٹائی سے نہیں کہا جاتا کہ مغربی تہذیب دنیائے انسانیت پر سب سے عظیم احسان ہے۔ علم وفضل سے تعلق رکھنے والا ایک طبقہ بڑی طاقتوں کے غلبہ پانے کے بارے میں بڑے زور شور سے بحث مباحثہ میں مصروف ہے جبکہ بڑی طاقتیں اسی بات کو استعمال کرنے کے لیے نئے طریقے سوچ اور آزما رہی ہیں اور جبر واستبداد کے نئے سازشی اور غیر مرئی طریقے وجود میں آ رہے ہیں۔ 1999 میں عراق پر بمباری سے بڑی انسانی جانوں کا اتلاف ہوا اور اقوام متحدہ کی ایک سرکاری دستاویز میں استعمال کیے گئے الفاظ کے مطابق عراق کو قرون وسطیٰ میں دھکیل دیا گیا ہے۔ لیکن بمباری کے مقابلے میں عراق کے خلاف پابندیاں لگانے سے کئی گنا زیادہ انسانی جانوں کا ضیاع ہوا۔ جب عراق پر پہلی بار پابندیاں لگائی گئیں تو اس کے بعد بھوک اور دواؤں کی عدم دستیابی کے باعث پانچ لاکھ عراقی بچے مارے گئے۔ اسی حوالے سے امریکہ کی وزیر خارجہ میڈیلین البرائٹ نے کہا کہ صدام حسین کو لگام دینے کے لیے یہ کوئی زیادہ قیمت نہیں ہے۔ اس کے بعد بچوں کی مرگ انبوہ جاری رہی۔ کئی گنا زیادہ اموات ہوئیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اس کے باوجود یہ کہا گیا کہ غلط کار اور ضدی قوموں کو ان کے اعمال کا اخلاقی سبق دینے کے لیے یہ پابندیاں غیر متشددانہ یعنی نرم بلکہ کرم گسترانہ ہیں۔

ایک نئے عہد کی دہلیز پر ہم جس بھی پہلو یا گوشے میں کھڑے ہیں اس میں واحد ”نئی“ شے سماجی تعمیرات کی صورتیں ہیں جنہوں نے ان علمی نظاموں اور ثقافتی رواجوں کی باقیات کو پس پشت ڈال دیا ہے جو جدیدیت کے موجودہ عالمی تناظر کا حصہ نہیں بنے اور نہ ہی جدیدیت

کے بے شمار اہل کاروں سے ہضم ہو سکتے ہیں۔ عالمگیریت کے اس عہد میں جدیدت کی خصوصیات کو ممتاز کرنے والے وہ علمی نظام ہیں جو سیاسی، ثقافتی اور انتظامی معاملات کی تعبیر و تفسیر کرتے ہیں اور ان سے زیادہ عالمگیر کون ہے؟ چنانچہ لازم آتا ہے کہ عالمگیر سطح پر علم، سیاست اور ثقافت کے نئے ڈھانچے اور نقشے دیئے جائیں اور ایسے راستے کھولے جائیں جو کثیر الوجودی مستقبل کے لیے نئے متبادل ڈھانچے فراہم کریں۔ اگر حضرت انسان میں جبر و استبداد کے غیر معمولی طریقے کی نامعقول صلاحیت موجود ہے تو اس کے ساتھ اسے یہ وقوف بھی دیا گیا ہے کہ وہ اس جبر سے رہائی کے طور طریقے وضع اور استعمال کرے۔ اسی طرح ہر چند بہت سے عالموں فاضلوں اور معلمین نے اپنی خدمات ریاست یا سوسائٹی کے دوسرے بڑے اور غالب اداروں کے سپرد کر رکھی ہیں سچے دانشور کا کام یہ ہے کہ وہ ان غالب علمیات اور سیاسی اعمال کے خلاف مزاحمت کرے اور اصل میں اس علم کے عناصر کے بارے میں تفتیش و تحقیق کرے جو کہ معاشرے کو مطلوب ہیں۔ اگر یہ کام نہیں کیا جاتا یا اس کے برعکس کام کیا جاتا ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ دانشور اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گیا ہے۔ علمی اور نصابی سطح پر جو بہت کچھ لکھا گیا ہے وہ بہت ہی مبہم اور گنجلک ہو گیا ہے اور وہ بھی جس کے بارے میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ وہ پسماندہ اور بے اختیار لوگوں کی آواز ہے۔ نوآبادیاتی دور کے بعد کے دانشور نے نئی طرح کی خود فریبی وضع کر لی ہے۔

اس کتاب کا مقصد یہ ہے کہ بے شمار عصری مباحث میں یہ بھی حصہ ڈالے اور علم کی سیاست میں ایک اخلاقی نقطہ نظر یا پس منظر پیش کرے۔ میرا خیال ہے کہ ایک سلطنت علم کی بھی ہے اور یہ سلطنت ان تمام سلطنتوں کے مقابلے میں زیادہ اہم اور توجہ طلب ہے جنہیں ہم یورپی امریکی سامراج سے جوڑتے ہیں یا کارپوریٹ شعبے سے وابستہ کرتے ہیں۔ اور جس نے پوری دنیا کو اپنے اپنے حصے میں تقسیم کر رکھا ہے۔ پھر اس علم کی کچھ سطحیں یا اقسام یا زاویے بنا رکھے ہیں جن کے ذریعے ہم دنیا کو دیکھتے ہیں۔ مگر ان زاویوں یا سطحوں کی بہت بڑی تعداد غیر مرئی ہے یا ان کو شیریں الفاظ کے غلاف میں پیش کیا گیا ہے۔ بظاہر بڑی اچھی نیت، مہربانی اور ترقی سے متعلق زبان استعمال کی گئی مگر پس منظر میں اس کے مکر و فریب کے پھندے ان طاقتوں اور دلالوں سے بھی زیادہ کارگر ہیں جن کے ذریعے ننگا غلبہ پایا جا رہا ہے۔ میں نے کہیں کہیں یہ کہا ہے کہ دانشور ہوتا ہی وہ ہے جو پیش بینی کرے۔ پیش بینی کے

بغیر وہ دانشور ہو ہی نہیں سکتا اور یہ کتاب بھی اسی امکانی پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ لیکن اس سے یہ مقصود نہیں کہ میں پالیسی سازی میں شریک ہونا چاہتا ہوں: نہ ہی اس سے یہ مطلب لیا جائے کہ یہ مستقبل کا منضبط خاکہ ہے۔ اس کتاب میں سر بسر میرے دلائل ہیں جن کے ذریعے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پالیسی بنانے والے اور انتظامی امور کے بقراط ہمارا مستقبل اغوا کرنا چاہتے ہیں۔ ہم سے پہلی نسلیں جو خرد افروزی کے موجودہ تخاطب سے پہلے گزری ہیں وہ ایک اور قسم کے مستقبل کے "ماہر" کو جانتی تھیں جسے پیغمبر کہا جاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں کہ میں کسی بشارت یا پیش گوئی میں دلچسپی لے رہا ہوں یا یہ کہ ہماری تعبیر و تشریح کے انداز کی جگہ پیغمبرانہ انداز آ جائے۔ پیش گوئی ہر چند غیر معین اور غیر تاریخی علوم میں سے ایک ہے جنہیں ہمارے عہد میں دبا دیا گیا ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ اگر ہم اپنے مستقبل کو بیسویں صدی کے انہی خیالات کے ہاتھوں اغوا نہیں کروانا چاہتے جنہوں نے ہر صورت اور ہر شعبہ کو جس میں جدید طریق علم بھی شامل ہے، غلبہ کے لیے استعمال کیا۔ یہ خیالات اپنی پرواز اور اشتہا کے اعتبار سے عالمگیر بھی ہیں اور ان کے حوالے سے جو مستقبل تعمیر کیا جا رہا ہے، لازم ہے کہ اس مستقبل سے ذرا مختلف خاکوں کے لیے کام کیا جائے۔

اس کتاب کے جو خاص سرچشمے ہیں ان کے حوالے سے یہ رائے بنائی جا سکتی ہے کہ یہ دراصل علم کی سیاست کے میدان میں ایک اختلافی سفر ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ اس کے ذریعے سیاست کو سمجھنے کے لیے ایک الگ اور مختلف نقشہ بنایا جا رہا ہے جو جماعتی سیاست، انتخابی جدوجہد، مخصوص علامت یا مفہوم والی سیاست اور کثیر الثقافتی موقف سے مختلف ہے۔ میری کتاب سیاست اور علم کے باہمی ربط وضبط کی تفہیم کی بھی ایک کوشش ہے۔ پہلے باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ اکیسویں صدی تک کے سفر کا مقصد یا حاصل کیا ہے اور نئی صدی کی آمد پر اس کی آؤ بھگت کا مفہوم کیا ہے، ہر چند مغربی افکار میں گھڑیوں اور کیلنڈروں اور وقت کی فلسفیانہ تعبیروں کی تاریخ بھی ہے اور توشہ خانہ بھی۔ آگسٹائن سے لے کر ہائیڈیگر اور ریکوئر تک دانشوروں نے یہ زحمت کم ہی کی ہے کہ رک کر وقت کی ثقافتی سیاست اور اس کی بعض اقسام کی ہرجائیت کا مطالعہ کیا ہو۔ تیسری دنیا کی پسماندگی کے ذکر اذکار سے یہ بات یاد آتی ہے کہ انہوں نے کس حقارت سے جنوبی کرۂ ارض کے باشندوں کے باب میں کہا ہے کہ ان کے دل میں وقت کی کوئی زیادہ قدر و اہمیت ہی نہیں، نہ ہی وہ اپنے وقت سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں حالانکہ وہ خود بھی مغربی کیلنڈر سے وابستہ ہو چکے ہیں۔

تعبیر وتشریح کی ایک دوسری بڑی سطح پر ضروری ہو گیا ہے کہ از قسم ''صدی'' اور ہزاری' کا مفہوم متعین کیا جائے اور وقت کی ان پیمائشوں کے ساتھ جو غیر جانبدار قسم کے معنی جوڑے گئے ہیں اور ان کے پس پردہ جو سیاست ہے اس کے بارے میں علم حاصل کیا جائے۔ وقت کے اس قسم کے مفہوم کے حوالے سے ہمیں تمام بات چیت میں یہ بھی سنائی دیتا ہے کہ ہندوستان اور افریقہ خصوصاً مسلم ممالک اب بھی قرونِ وسطیٰ یا انیسویں صدی میں رہ رہے ہیں۔ ان مسلم ممالک کا اکثر 11 ستمبر کے واقعہ کے بعد خاص طور پر اس ضمن میں ذکر کیا جاتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اس طرح وقت کی مختلف اقسام کو مخصوص جغرافیائی زمینوں (مکان) کے ساتھ اسی طرح جوڑا گیا ہے جس طرح زمانی اقسام کی بے ٹھکانہ ہونے اور ناپائیداری کے زیر اثر تخصیص کی گئی ہے۔ اب اس بات پر بھی غور کریں کہ جب ہم نئی ہزاری میں داخل ہونے ہی والے تھے، تو ہم نے ایک لحہ رک کر یہ پوچھا ہی نہیں کہ یہ نئی ہزاری اصلاً کس کے لیے ہے اور اس کا مفہوم کیا ہے اور پھر ہاتھ کی کیسی صفائی کے ساتھ یہ عیسوی ہزاری جہان بھر کی قوموں کا مقدر کر دی گئی ہے۔ مثلاً مغرب کے مجموعی غلبے کے حوالے سے مسلمانوں کے لیے ہزاری کی یہ صورت ناگوار ہو سکتی ہے۔ یعنی یہ ہزاری ہی انہیں مغربی غلبہ کی یاد دلا سکتی ہے۔ یہ معاملہ اس حوالے سے بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ انیسویں صدی کے آخر میں مسلمان ممالک الجزائر، ملیشیا، انڈونیشیا، افغانستان، پاکستان، بنگلہ دیش، سوڈان وغیرہ وغیرہ پر مغربی مسیحی طاقتوں کے حوالے سے کیا کچھ گزر گیا۔ الجزائر میں خانہ جنگی کے باعث اسی ہزار باشندے مارے گئے۔ ملیشیا میں مہاتیر محمد نے تحریک اصلاح کو دبا دیا اور ایک ابھرتے ہوئے قائد انور ابراہیم پر عمومی مگر ناقابل یقین سمجھے جانے والے الزامات لگا کر اسے قید کی سزا دے دی گئی۔ پھر انڈونیشیا میں زبردست معاشی بحران آیا اور اس کے ساتھ سہارتو کو تخت سے اتارنے کے ساتھ چینی باشندوں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ ایسی ہی کارروائیاں افغانستان، پاکستان، بنگلہ دیش، سوڈان اور دوسری جگہوں پر ہوئیں۔ پھر ان حالات میں کیا ہزاری کی دھوم دھام پر عالم اسلام میں افسوس کی لہر نہیں دوڑی ہو گی؟

ہزاری کی تحریکوں کی تاریخ حادثات سے اور بدخبریوں سے، خاص طور پر 11 ستمبر کے واقعہ سے جڑی ہوئی ہے۔ مستقبل کے بارے میں جوتشی رملی پیش گوئیاں کرتے ہیں تو ستمبر کے واقعہ کے حوالے سے ان پیش گوئی کرنے والوں کو اپنی پیش خبری کے سچے ہونے کی داد بھی مل

گئی ہو گی۔ انٹرنیٹ ایک ایسا ذریعہ ہے کہ اس پر آفاتی نوعیت کی افواہیں بڑی آسانی سے پھیلتی ہیں اور مختلف نوعیت کی سازشوں کو بھی بڑی ہوا دی جاتی ہے اور اس شعبہ میں ہزاری کے نقیب ہر چند ٹیکنالوجی کے باعث مکاں کے وسیع ہوتے تصور پر زیادہ توجہ نہیں دیتے مگر دم آخر یعنی وقت کے خاتمے کے بارے میں اپنے متنازعہ خیالات کو عام کر رہے تھے۔ (لفظ نیا یا نیا پن بذات خود وقت پر تصدیق کی مہر لگاتا ہے۔) مگر اس ہزاریت کے دوسرے نصف کی تجدید کے بارے میں لے دوسرے راگ میں ہے اور توقعات کا رنگ بھی مختلف ہے۔

ہمارے ہاں وقت کے احساس کی تجدید اور مکالمہ کی اور صورتیں بھی ہوں گی جو ممکن ہے وقت کی بڑی پیمائشوں، ہزاری، گھڑی، گریگورین کیلنڈر اور تقسیم اوقات کے دوسرے طریقوں سے لگا نہ کھاتی ہوں۔ خود کو انتہائی مصروف بنانے یعنی دوسروں کے لیے وقت نہ نکالنے کا عمل بھی اس فرض سے تغافل کے برابر ہے کہ ہر عورت اور مرد کو اپنی اپنی جگہ پر ایک مکمل جہان سمجھو۔ چنانچہ ہم نے وقت کے حوالے سے اپنی مصروفیت میں یہ سوچا ہی نہیں کہ اس کام (تجارت) کے جبر کی اپنی مختلف صورتیں ہیں۔ مثلاً میں کبھی کبھی وقت اور اپنے کھانے کی عادات کے درمیان تعلق پر سوچتا ہوں اور یہ بھی کہ کبھی کھانے کے درمیان طویل وقفے کے بعد کا جو کھانا جس قدر لذیذ اور سرمست کر دینے والا لگتا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے وقت بھی عارضی طور پر ٹھہر گیا ہے۔ اسی طرح کھانوں کے لیے جس طور جدید زمانے میں ضابطے یا اوقات بتائے گئے ہیں وہ ضابطے جسم کی ضرورت کے اوقات (یعنی باڈی ٹائم) سے باآسانی مطابقت نہیں رکھتے۔ وقت کے جو غالب تصور قائم کر رکھے ہیں، وہ بھی جدید نظام علم کے جبر کا اہم پہلو ہے۔ چنانچہ اس حد تک بحث کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ وقت کے بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ اسے جمہوری اور کثیر الجہتی (کثرت) رنگ دیا جائے۔

اگر پہلا باب جزوی طور پر اگلے زمانے کے بارے میں ہے تو باب دوئم اور سوئم کا تعلق گزشتہ زمانوں سے ہے۔ ہمیں اس بھیانک حقیقت سے آغاز کرنا ہوگا کہ بیسوی صدی خون میں نہلائی گئی تھی۔ جنگوں اور مسلح حملوں اور جھڑپوں میں کتنے انسان مارے گئے۔ مگر ایک انتہائی کسا کسایا اندازہ ہے کہ کم از کم گیارہ کروڑ اس صدی میں مارے گئے۔ اور اس تعداد پر عموماً اتفاق پایا جاتا ہے۔ مگر یہ تعداد بھی بڑی اہم ہے کیونکہ اگر پوری تاریخ کو دیکھا جائے تو آبادی کے تناسب کے لحاظ سے بیسویں صدی میں دوسری تمام صدیوں کے مقابلے میں اس

طور زیادہ اموات ہوئی ہیں۔ یہ صدی گزر گئی ہے، اس صدی میں بڑی جنگوں کو فروغ ملا۔ کہنے کو تو یہ جنگیں اصولوں کی خاطر لڑی گئیں مگر اس صدی کو بہانہ بنایا گیا ایک دوسرے کو تلف کر دینے والی ذہنیت کے ساتھ۔ اس کے علاوہ اس صدی میں ہونے والے چند دوسرے بڑے سیاسی واقعات کے بارے میں تحقیق لازم ہے، یعنی جن واقعات نے گزشتہ سو سال کی ایسی صورت گری کی ہے۔ گزشتہ صدی میں قومی ریاست کے نظریہ کو بھی عروج حاصل ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ سیاست اور معاشیات کے شعبوں میں ایک بین الاقوامی حکمرانی کا خیال بھی ابھرا۔ انسانی حقوق کی بات پھیلی۔ کم از کم اس حد تک کہ یہ بات خلقت کے بہت بڑے حصے تک پہنچ گئی۔ نوآبادیات کے خلاف مزاحمتی تحریکیں چلیں۔ اور میرے بقول امریکہ کی جمہوری کُلّیت پسندی بھی اسی صدی میں ابھری۔ جنگ کی لعنت سے نجات پانے کے لیے مختصر العمر لیگ آف نیشنز وجود میں آئی اور پھر اس کے بعد اقوام متحدہ قائم کی گئی جواب عملاً اس نام نہاد اقوام متحدہ بلکہ سلامتی کونسل کے ذریعے اس ادارے کے احاطہ اختیار کے تحت بین الاقوامی حکمرانی کا نظریہ پرورش پا رہا ہے۔ میں پہلے عرض کر آیا ہوں کہ نوآبادیات کے خلاف مزاحمتی تحریکوں کو دنیا کے بہت بڑے حصے پر اپنے گہرے اثرات چھوڑنے چاہئیں تھے مگر سابقہ نوآبادیاتی لوگ قومی حکومت بنانے کے شوق پر قابو نہ پا سکے اور قومی حکومتوں کا یہی نظام دنیا بھر خصوصاً مشرق وسطیٰ، جنوبی ایشیا اور عملاً پورے افریقہ میں تباہی پھیلا رہا ہے۔

اقوام متحدہ کے منشور یا میثاق، مختلف معاہدوں اور راضی ناموں کے علاوہ نسلی، لسانی، جنسی اور مذہبی اختلافات نے فروغ پانا شروع کیا۔ اس کے بعد یہ دیکھا جانے لگا کہ کس کس کا کیا طرز زندگی ہے۔ ان سب ابھرتے معاملات کے بعد انسانی حقوق کے بارے میں نئی آگہی اور شعور پیدا ہوا۔ قومی تحریکوں کے محرکات میں ثقافتی فرق کو بھی ملحوظ رکھا گیا تھا اور انسانی عزت و وقار کو بھی بڑے پرشور الفاظ میں پیش کیا گیا تھا اس لیے ان دونوں باتوں نے انسانی حقوق کے معاملہ کو بھی ایسے پرتاثیر معنی دیئے جو اس سے پہلے کے زمانوں میں نمایاں نہ تھے۔ انسانی حقوق کے مسئلے پر بہت بحث مباحثہ ہوا۔ بعض مبصرین نے کہا کہ مغربی سامراج نے انسانی حقوق کے نام پر ایک نیا محاذ کھول دیا ہے جبکہ باقی مبصرین کا خیال ہے کہ انسانی معاشروں کے فروغ اور ترقی کے لیے انسانی حقوق لازمی اور حتمی طور پر ضروری ہیں اور ان پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ کوسوو کے فسادات نے انسانی حقوق کے نام پر مداخلت کرنے اور

مستقبل میں باقی سب کے لیے انسانی حقوق کے نام پر ہی دست اندازی کا جواز فراہم کر دیا اوراس سزا کا اختیار چند ایک دلالوں کو دیا گیا۔ میری نظر میں انسانی حقوق کا یہ تصور اقوام متحدہ کی کلیت پسندانہ جمہوریت کے لیے بڑا کارآمد ہے۔ کسی کے دل میں یہ خیال آ سکتا ہے کہ برطانیہ کی سرداری منطقی طور پر امریکہ کو منتقل ہوئی ہے یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ یہ نتیجہ نکالے کہ گردشِ تاریخ کے نظریات کے حوالے سے اور پولیٹیکل سائنس نے جو بیانیہ نتائج اخذ کر رکھے ہیں ان کے مطابق ہو سکتا ہے یہ تاریخ کا شاخسانہ ہو کہ تاج، برطانیہ سے امریکہ کو منتقل کر دیا گیا۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ امریکہ نے جو زبردست طاقت مجتمع کر رکھی ہے تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں اور ہمیں بھی یہی مان لینا زیب دیتا ہے کہ قدرت یا آسمان کی مرضی سے امریکہ کو دنیا بھر کے معاملات کا پاسدار بنا دیا گیا ہے اور اکیسویں صدی میں انسانیت کا مقدر امریکہ کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے۔

امریکہ نے رویوں کی ایک نئی گرامر اور طاقت کی ایک نئی لغت بنا لی ہے جس میں بدمعاش ریاستوں، بین الاقوامی برادری، جیسے الفاظ شامل ہیں۔ امریکہ کے ایسے ہی حلیف اقوام متحدہ میں بھی ہیں اور انہوں نے اقوام متحدہ ہی کے ذریعے بعض ممالک میں قیام امن کے نام پر کارروائیاں کی ہیں یا ان پر پابندیاں لگائی گئی ہیں اور یوں تباہی کا سامان کیا گیا ہے۔ موجودہ عالمی حکمرانی کی مثلث کا تیسرا خط ورلڈ بینک، انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ (آئی ایم ایف) اور ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن (ڈبلیو ٹی او) اور ان جیسے ادارے ہیں۔ انہی اداروں کے ذریعے عالمی معیشت کو اختیار میں رکھا گیا ہے۔ اقوام متحدہ کی طرح یہ ادارے بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ آزاد ہیں مگر ان کے عمل اور افکار پر امریکہ (۳) کا قبضہ ہے۔ آزاد تجارت کے علمبردار ملکوں، عالمگیریت کے تحت حاصل کی جانے والی کامیابیوں کی انتہائی غیر منصفانہ تقسیم، پیٹنٹ چیزوں کی قیمت کی غریبوں کی طرف سے ادائیگی، بین الاقوامی حقوق کے تحفظ کے نام دیسی علوم کے لیے خطرات، اور دیسی طرزِ حیات کو ان مہنگے راستوں پر ڈال دیا گیا جو ترقی پذیر ملکوں کے باشندوں کی بساط سے باہر ہیں۔ یہ وہ نقصانات ہیں جن کے نتائج پر دفتر کے دفتر لکھے گئے ہیں۔ ان کے فروغ کے لیے بڑا لٹریچر پیدا کیا گیا ہے، عالمگیریت کے سوال پر بہت سے ذہنوں کو باقاعدہ تربیت دی گئی ہے۔ مگر میری حقیر کوشش یہ ہے کہ ڈبلیو ٹی او میں تنازعات کے تصفیے کے لیے جو شقیں رکھی گئی ہیں، ان پر ایک تنقیدی نظر ڈالی جائے۔ ان

شقوں سے مطلب کیا نکالا گیا ہے، اور جو دو فریق ٹری بیونل کے پاس اپنے تنازعات طے کرانے یا ڈبلیو ٹی او کے ضوابط کی خلاف ورزی کے الزام پر اپنے دفاع کے لیے آتے ہیں، ان کے بارے میں ڈبلیو ٹی او کے اصول یا طریقے کیا کہتے ہیں؟ ہم ان کا جائزہ لیتے ہیں۔

دو ابواب میں سیاسی ارتقا اور تبدیلیوں کا بیان کیا گیا ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ مارشل لا اور نوآبادیات کے خاتمے کے بعد ترقی کا نظریہ یہ تھا کہ ایک ایسا مقام حاصل کر لیا جائے جو مقدس اور واجب التکریم بھی ہو۔ یہ بحث ہمیں علم کی سیاست کی طرف لے جاتی ہے جس کا تذکرہ باب چہارم میں کیا گیا ہے۔ ترقی کی منطق پر انگلی اٹھانے کا مطلب یہ بھی ہے کہ ہم خود قدیم باشندوں اور روایات پرستوں میں شامل ہو جائیں اور ہمیں ایک اڑیل قدیم باشندہ سمجھا جائے جو اصلاح سے مکمل طور پر منکر ہے۔ گلوگھارا (ہالوکاسٹ کا لفظ جرمنی میں 1930 میں یہودیوں کے قتل عام سے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ پنجابی شاعر وارث شاہ نے یہ لفظ احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں سکھوں کے قتل عام کے بارے میں استعمال کیا ہے۔ مترجم) کمبودیا اور روانڈا، میں مرنے والوں کو سیاسی تشدد یا نسل کشی کا شکار شمار کیا گیا، مگر ان کے مقابلے میں ترقیات کے نام پر مارے جانے والے بے شمار افراد کو کسی بھی صورت میں یاد نہیں کیا گیا۔ گویا وہ بے وجود ہیں۔ نامعلوم سپاہیوں کے نام پر یادگاریں بنائی گئی ہیں۔ سیاستدان اس لیے عزت و احترام نچھاور کرتے ہیں کہ انہوں نے جان کی قربانی دی اور انہیں ہیرو، محب الوطن اور شہید کا خطاب دیا گیا مگر ترقیات کے شکار کا کوئی نام کوئی القاب نہیں۔ ان سے کہا گیا کہ وہ ترقیات کی دھن پر چلیں اور قوم کے نام پر اپنی زمین، اپنی عزت، اپنی غیرت، اپنی روایات اور ثقافت کو بھول جائیں۔ وہ اب صرف اور صرف اعداد و شمار کا حصہ ہیں۔ وہ منجمد ہو چکے ہیں۔

یہ ترقیات کے بارے میں پاگل پن تھا جس کی وجہ سے خونخوار سٹالن نے لاکھوں کے گلے گھونٹے۔ ماؤ زے تنگ نے لاکھوں کروڑوں انسان بھوکے ننگے بنا دیئے۔ چین میں ترقی کے نام پر ''ایک چھلانگ آگے کی طرف'' تحریک کے تحت کم از کم ڈھائی کروڑ لوگ مارے گئے۔ اس وقت سے لے کر اب تک دنیا بھر کے قبائلیوں، قدیم باشندوں اور دوسرے کمزور انسانوں کی جان ترقیات کے پردے میں لی گئی ہے۔ جدیدیت کا یہ بہت ہی پیچیدہ مسئلہ ہے۔ یعنی اب ہم پر جبر ایسے نازل ہوتا ہے کہ اس کی وضع قطع کا بیان ممکن نہیں۔ اکثر یہ سب کچھ ان ترقیاتی کاموں کے حوالے سے انسانیت اور خوش خلقی کے نام پر ہوتا ہے، اور جو

بظاہر ہماری بہتری کے لیے کیا جاتا ہے۔ بہت کم لوگوں کا دھیان اس طرف گیا ہے کہ دراصل علم کی مختلف اقسام یا خانوں کے حوالے سے ہم پر توڑا جانے والا جبر بڑھتا چلا جارہا ہے۔اور نہ اس سے یہ مطلب اخذ کیا جاتا ہے کہ ملٹری انڈسٹریل کامپلیکس (اسلحہ سازی کی صنعت) اب ماضی کی چیز بن گئی ہے اور یہ کہ اب غلبہ پانے کی سب سے نمایاں علامت یعنی ظالمانہ طاقت کا مظاہرہ نہیں کیا جائے گا۔ تاہم اس وقت ہمارے ہاں تشدد کا جو مفہوم یا تصور رائج ہے، اس میں اس یقین دہانی کی کوئی نئی شق نہیں کہ مندرجہ ذیل بالا صورتوں میں تشدد ختم ہو گیا ہے۔ بہر طور اب بڑی ریاستیں اپنا غلبہ قائم کرنے کے لیے ''مہذب مشن'' (مہذب بنانے کی مہم) کا جواز پیش نہیں کرسکتیں۔ یہ مہذب مشن کی اصطلاح سامراجی ممالک نے کیسے چپ چپاتے چلا دی ہے۔ یہ معرکے کی بات ہے کہ امریکہ نے طالبان کے خلاف ''دنیا کو مہذب بنانے'' کے نام پر جنگ شروع کررکھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تہذیب یافتہ دنیا ان لوگوں سے لڑ رہی ہے جو ''تہذیب'' اور جمہوریت سے نفرت کرتے ہیں۔ لیکن افغانیوں کو مہذب بنانے کی کوئی بات نہیں کی جاتی۔ افغانستان میں جنگ کا مقصد دہشت گردوں اور ان کے سرپرستوں کو قانون کے دائرے میں لانا اور افغانستان میں نیا نظام قائم کرنا بتایا گیا ہے۔ ''نیا عالمی نظام'' بذات خود وضع کرلیا گیا ہے، اس میں نہ نوآبادیاتی حاکموں اور محکموں کے درمیان فرق کا تذکرہ ہے نہ ہی اعلیٰ اور ادنیٰ درجہ کی انسانی نسلوں کا حوالہ ہے، صرف قانون کی زبان ہے، اخلاقیات کا درس ہے (کسی بھی صورت میں امریکہ کا جانی نقصان نہیں ہونا چاہیے) اور دیکھ بھال کے ضوابط ہیں۔ اب کسی کو سزا دینے یا مارنے کا معیار یہ رکھا گیا ہے کہ پہلے اس ملک کو بدمعاش ملک قرار دیا جائے، کہا جائے کہ اس میں غیر قانونی تنظیمیں یا انتظامیہ ہے جو قانونی حدود کو توڑنے کی مرتکب ہوئی ہے، اور امریکی سیاست دانوں کے بقول اس نے بین اقوامی برادری کو جوابی کارروائی کرنے پر اکسایا ہے۔

ترقیات دراصل جدید نظام علم کی بہت ہی مکروہ پیچیدہ اقسام یا شاخوں میں سے ایک ہے۔ اس کے ساتھ نظریات کا ایک جال بھی ہے مثلاً ''قومی ریاست، جدیدیت''، عظیم سائنس تاریخ وغیرہ وغیرہ۔ یہ نظریے اس کرۂ ارض کے انتہائی دور دراز حصوں میں بھی پہنچ چکے ہیں اور اعتبار بھی پا چکے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ امریکہ، فرانس، برطانیہ اور تیسری دنیا کے نصف ممالک (خصوصاً ہندوستان) کی درس گاہوں اور علمی اداروں میں پرانے خیالات کے خلاف

بھی ایک شدید تر جنگ جاری ہے۔ چنانچہ یہ عمل بہت ہی تیز تر اور نمایاں ہوا ہے۔ جب نوآبادیاتی نظام پیچھے ہٹ گیا تو اس کے چند سال بعد اس تحریک کے متبادل دانشوروں نے جن میں مابعد تشکیلیت اور مستشرقیت کے حامی فرانسیسی دانشور پیش پیش تھے، روشن خیالی اور نوآبادیاتی مباحث کے مفروضوں کی باگ ڈور سنبھال لی۔ نوآبادیات کے بارے میں اس سے پہلے جو مباحث تھے ان میں بعض چیزیں پہلے ہی فرض کر لی جاتی تھیں۔ جیسے سفید فام مرد کی برتری وغیرہ، لیکن اب ان سوالوں پر بحث کھول دی گئی کہ رعایا سے کیا سلوک کرنا چاہیے۔ انہیں کس نظام میں رکھا جائے اور کون سے طبقوں کو عقل و دانش، تاریخ اور قومی ریاست سے بالکل نکال دینا چاہیے۔ان سوالوں پر تحقیق و تفتیش عام کر دی گئی۔ البتہ مابعد تشکیلت، رد بنیادیت، اور مابعد جدیدیت جیسی بحثوں میں دانشوروں کا عوامی معاملات سے بالکل ہی نہیں یا بہت ہی کم تعلق رہا، اور بلاشبہ امریکہ یا کسی اور ملک کی خارجہ پالیسی پر انہوں نے کوئی قابل ذکر اثر نہیں ڈالا۔ میں اس سے زیادہ اور تو کچھ نہیں کر سکتا تھا کہ ثقافتی مطالعے، جدید دنیا میں یونیورسٹی کا مقام، درسگاہوں اور معاشرے کے درمیان تعلق، جدید علوم خصوصاً سماجی علوم کے انضباطی ڈھانچہ وغیرہ پر چوتھے باب میں ایک نظر ڈال لوں۔اس کے بعد کے ابواب میں بھی ان کا کڑا جائزہ لیا ہے۔ سماجی علوم میں سب سے زیادہ تاریخ کو اہمیت حاصل ہوتی ہے جو عوام کی نمائندگی بھی کرتی ہے۔ نسلی لسانی یا گروہی اعتبار سے کوئی بھی گروپ یہ نہیں سننا چاہتا کہ اس کی تاریخ ہے ہی نہیں یا بہت کم ہے۔ انقلابی قسم کی تاریخ لکھنے والے مؤرخوں نے زیادہ توجہ ان لوگوں یا گروہوں پر دی جو پس پشت ڈال دیے گئے تھے یا بالکل ہی نظر نہ آتے تھے کہ اس مقصد کے لیے جدید تجزیاتی اور تحقیقی طریق کار اختیار کیا جس سے اس پورے گروہ یا علاقے کے نمایاں تاریخی واقعات نظر انداز کیے جانے لگے، یعنی ان کی تخریب کی گئی۔ ان مورخوں نے ایک لمحے کے لیے رک کر یہ سوچا ہی نہیں کہ کیا ان کی فتح بھی دراصل تاریخ کی لگامیں ہاتھ میں لینے سے ہوئی اور کیا ان پسماندہ رکھے گئے یا بھلا دیے گئے گروہوں کے لیے صرف ایک ہی زبان یعنی تاریخ ہی رہ گئی ہے۔

سیاسی واقعات، تاریخ اور ارتقا کے جدید نظام کے بعد اس کتاب میں بنیادی مسئلہ یہ رکھا گیا ہے کہ اختلاف کا مستقبل کیا ہے، اور باب پنجم اور ششم کے مطابق، میں مستقبل کی انسانیت کو آزاد کرنے والی سیاست کے حوالے سے گاندھی کو ایک قد آور مثال یا نمونہ قرار دیتا

ہوں۔ اس بات میں بہت ہی سچائیاں موجود ہیں کہ کل کے اختلاف کرنے والے آج کے دلال بن گئے، لیکن اس وقت رائج خیالات، نظریات کو کسی صورت بھی اس امر کی اجازت نہ دی جائے کہ وہ کسی معاشرے کے اجتماعی شعور میں موجود اختلافی رائے کا گلا گھونٹ دے۔ افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے عہد میں اختلافات کے اظہار کے پیرائے خطرناک حد تک تنگ ہو گئے ہیں اور ہم سب مجبور ہیں کہ اپنا اختلاف انہی تنگ پیراؤں تک محدود رکھیں اگرچہ شناخت یا پہچان کی سیاست ثقافتی اختلافات کی ہی پیداوار ہے۔ یہ سیاست نسلی، صنف، جنسی ترجیحات اور طبقات (یہ فرق کم کم ہے) کے کتنے پرزور حوالوں لے سے کی گئی ہے یہ بہت غیر معمولی معاملہ ہے اور اس کے مبلغین نے اپنا مؤقف کہاں تک اسی نظریہ علم کی بنیاد پر وضع کیا ہے؟ ہندوستان جیسی تہذیب نے برطانیہ سے آزادی حاصل کرنے کے لیے عدم تشدد کا فلسفہ اختیار کیا مگر جب ایسی قدیم تہذیب والا ملک قومی ریاست کہلانے کی خاطر مہاتما بدھ کے یوم پیدائش پر ایٹمی دھماکہ کر کے گھٹیا یا نچلی سطح پر آ جاتا ہے اور وہ عدم تشدد کے برعکس اس قسم کا تجربہ اس لئے کرتا ہے کہ ایٹمی طاقتوں میں اس کا بھی شمار ہونے لگے تو پھر قدیم ہندوستانی تہذیب کے مقابلے میں ہلکی تہذیبوں والے ملکوں سے بھلا کیا توقع رکھی جا سکتی ہے۔

جب تک ایسی حقیقت پسندانہ تہذیب میں اس دستوری اور پختہ زبان میں اختلاف کی گنجائش نہ رکھی جائے جو مغربی یا پارلیمانی ارکان اور سماجی مبصرین کی سمجھ میں آ سکے اس وقت تک جو کچھ ہو رہا ہے اس کا مقدر فنا یا گمشدگی ہے۔ گاندھی جی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ جلسہ جلوس، عدالتی پرچہ کاری اور پارلیمانی تقریروں کی بجائے انگریزوں کو اپنی بات منوانے کے لیے مکالمہ اور مزاحمت کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ اپنے سیاسی حریفوں کو قائل کرنے کے لیے برت (بھوک ہڑتال) چرخہ، عدم تعاون بلکہ اجتماعی طور پر چلنے والے طریقے اختیار کر کے اختلاف کی مختلف صورتیں وضع کرتے ہیں۔ جدیدیت کا تقاضا ہے کہ جدیدیت سے اختلاف کرنے والے جدیدیت ہی کی زبان میں بات کریں۔ جیسے عورتوں کے بارے میں مطالعہ کرنے اور ماحولیات کا جائزہ لینے والوں اور ہم جنسیت کا مطالعہ کرنے والوں کو درس گاہوں کی طرف سے دی گئی زبان اور اصطلاحات میں ہی بات کرنا ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ اور اس سے متعلق چیزیں اس لیے ضروری ہیں تاکہ آپ کی بات واقعی سنجیدگی سے سنی جائے، زیر غور لائی جائے اور اسے محض تمسخرانہ انداز سے نہ دیکھا جائے۔ یہ عین ممکن ہے

کہ ایک انوکھے نظریے کے داعی نیشنل رائفل ایسوسی ایشن کے بے اثر رکن جیسے ہوں۔ امریکہ میں اختلاف کرنے والوں کا یہی مقام ہے۔ اسی طرح قومی ریاست کی جو میکانکی قسم کی شکل ہے وہ بھی حملے کی زد میں ہے۔ یہ حملے اس ریاست کے ان باشندوں کی طرف سے ہو رہے ہیں جن کی ثقافتی تاریخ کی بجائے ان پر قومی تاریخ ٹھونسی گئی۔ ان مختلف ثقافتی تاریخوں والوں کی ابھی اپنی قومی ریاست نہیں ہے۔ ان میں فلسطینی، سکھ، کرد، باسک باشندے شامل ہیں۔ تاہم قومی ریاستوں کی ٹوٹ پھوٹ ابھی قبل از وقت ہے۔ متذکرہ گروپوں نے اپنے اپنے اختلافات کے بارے میں پولیٹکل سائنس کی اسی زبان میں مزاحمت شروع کر رکھی ہے جو قومی ریاست اور اس کی مختلف اقسام (مثلاً قومی ریاستوں کی تنظیم) کو تسلیم کرتی ہے اور سیاسی مقصد اور ثقافتی تمناؤں کا مستند اظہار بھی اسی میں ہوتا ہے۔ مستقبل میں اپنے اختلاف کو قائم رکھنے کے لیے ہمیں ان حالات کو دیکھنا اور تلاشنا ہوگا جن میں اختلاف کی صورت فروغ پا سکے۔ اور یہ کام اس لیے فوری طور پر کرنے والا ہے کہ کہیں ہمارے راستے پہلے ہی فیصلہ کن حد تک بند نہ کر دیے جائیں۔ میرے دلائل میں یہ بات مخفی ہے کہ ہمیں جدیدیت پر بطور خاص نقد و نظر کرتا ہے اور ہمیں بعض معروف اور رائج اصطلاحات اور تصورات، مثلاً رواداری، جمہوریت اور آزادی کو دقت نظر سے دیکھنا ہے۔ اسے ایک فلسفی جیمز کارس نے ''لامحدود بازیاں'' (۴) کہا ہے۔ اسی کے مطابق ہمیں بھی پورے زور و شور سے ان تصورات کے مقابل برسرکار آنا ہے۔ گاندھی جی لامحدود بازیوں کے کھلاڑی تھے۔ اس لیے ان کی زندگی اور تعلیمات میں اختلاف کی کیفیات کے بارے میں کچھ اشارے موجود ہیں۔

مستقبل میں اختلافات یا اختلاف کے مستقبل پر بات کرنے کا مقصد مستقبل کی سیاست پر بات کرنا ہے۔ ''باہمی یقینی تباہی'' (mutually assured destruction) کا دور گزر چکا ہے۔ اور وہ تب گزرا جب ''عالمی شیطانی سلطنت'' دنیا کی سیاست میں ایک بہت بڑی طاقت تھی۔ لیکن ایٹمی شکروں کی سوچ اور فکر کی بنیاد ''غیر ایٹمی ایٹم بازی'' پر ہی تھی۔ وہ غیر ایٹمی دنیا کی تبلیغ کرتے ہیں لیکن یہی ان کی ایٹم پسندی ہے۔ چونکہ ایٹمی جنگ کے بارے میں بہت زیادہ پابندیاں ہیں اس لئے نسل کشوں نے جنگ کی ایک نئی طرز اختیار کر لی ہے۔ نسل کشی کی یہ صورت پہلی بار اس وقت دیکھنے میں آئی جب امریکہ کی قیادت میں نیٹو کی فوجوں نے ہوائی بمباری سے یوگوسلاویہ کی خاک اڑائی تھی۔ اس کارروائی کا مقصد دشمن کے ساتھ

سامنے آ کر یعنی دو بدو جنگ سے مکمل احتراز، سول سوسائٹی کی مکمل تباہی، اور دشمن کی طرف سے جوابی کارروائی کرنے کے تمام امکانات کا خاتمہ کرنا تھا۔ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرانے سے پہلے اس قسم کی صورتِ حال کا قیاس بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کوسووو میں جو کچھ ہوا وہ اس بات کا المناک مظہر ہے کہ دنیا کی عظیم طاقت کا مستقبل میں اندازِ حکمرانی اور طریق جنگ کیا ہوگا۔ اور یہ بھی ''کوسووو کا امن'' کے پورے نہیں جزوی معنی ہیں۔ کوسووو پر جو معاہدہ ہوا اس میں یورپ کی نئی صورت گری کے بیج پوشیدہ ہیں۔ ہیگل کی فکر کے مطابق تاریخ نے یورپ کا یہی ''مقدر'' مقرر کر رکھا ہے۔

میں نے پہلے کہیں پابندیوں کی روز افزوں اہمیت کا ذکر کیا ہے جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ بین الاقوامی طرز حکمرانی نئی نئی شکلیں اختیار کر رہی ہے۔ جدیدیت کی حکمرانی کی خاصیت یہی پابندیاں تو ہیں۔ ان پابندیوں کی سلوں یا اینٹوں کو انتہائی ناانصافی بھٹے میں پکایا گیا ہے۔ ہمارے زمانے میں اس قسم کے ہونے والے کاموں کی طرح پابندیوں کا عمل یک طرفہ اور بے سمت ہوتا ہے۔ یہ پابندیاں ان ریاستوں پر لگائی جاتی ہیں جنہیں انسانیت کے دائرے سے باہر تصور کیا جاتا ہے۔ اگرچہ کبھی سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ یہ پابندیاں امریکہ پر بھی لگائی جا سکتی ہیں، حالانکہ یہ پابندیاں امریکہ پر ہی لگائی جانی چاہئیں جس کے قیدیوں کی تعداد بیس لاکھ سے زیادہ ہے۔ جہاں ایک دن میں گولی سے مارے جانے والے کی تعداد جاپان میں پورے سال مارے جانے والوں کے برابر ہوتی ہے۔ (جاپان کا یہ سال ناپسندیدہ کہلاتا ہے) اور امریکہ کا یہ بھی تسلیم شدہ ریکارڈ ہے کہ اس نے دنیا کے ہر حصے میں آمروں کو موت کے سکواڈوں اور ظالمانہ فوجی حکومتوں کی حمائت کی۔ پابندیوں میں جدیدیت کے اس پہلو کی بھی جھلک ہے: ترقی کی طرح ترقی میں بھی ان کی جانیں اسی طرح لی جاتی ہیں مگر قسطوں میں۔ یعنی قلت خوراک سے، معاشرت کی تبدیلی سے، بے گھری سے، نقل مکانی سے، بے روزگاری سے، بے زمینی سے... پابندیاں بھی اسی طرح آہستہ آہستہ مگر یقینی طور پر قتل کرتی ہیں۔ اور قتل ہونے والوں کے بارے میں کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ ناقص خوراک کے باعث، متعدی امراض سے اور نام نہاد پس ماندگی کی وجہ سے مر گئے۔

پابندیوں کی صورتیں اور نتائج ہمیں سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ ایک کثیر الوجود اور نجات دہندہ جمہوریت کے قیام کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اس مرحلے پر ہماری سوچ

ماحولیات سے ذراہٹ کر ہے۔: لفظ اکالوجی (ماحولیات) اکانومی (معیشت) سے نکلا ہے۔
اورمعیشت وہ نہیں ہے جو کہ ماہرین معاشیات نے بنادی ہے۔انہوں نے ایک حسابی کتابی
معیشت بنائی ہے جس کی ساری دنیا تقلید کرے ۔ بلکہ اسے "گھر کا انتظام" اور وسائل کی
ملکیت بنا دیا گیا ہے۔ ماحولیات کے حوالے سے سوچنے کا مطلب ہے کہ آپ عقل و دانش
سے سوچ رہے ہیں۔ آپ کو خبر ہوتی ہے کہ آپ کے دستیاب وسائل کیا ہیں۔ کیا کثیرالوجودی
صورت کے مطابق ہیں اور اس اصول کے تابع کہ آزادی ناقابل تقسیم ہے۔ دوراندیشی سے
مملوجیسا کہ سیارا کلب کی پالیسیاں لگتی ہیں، وہ باقی ساری دنیا کے لیے تباہ کن ہوسکتی ہیں۔اس
کی ایک ٹھوس مثال یہ پالیسی ہے کہ امریکہ میں ایک بھی درخت نہ گرایا یا کاٹا جائے ۔مگر یہ
بات نہیں کی جاتی کہ امریکہ میں اصراف کی جو سطح ہے اس کو کم کیا جائے۔ یہ طریق کار یا تعبیر
امریکہ کی طرف سے اختیار کردہ طریق جنگ سے کوئی مختلف نہیں ہے۔ میں نے اس طرف
پہلے بھی اشارہ کیا ہے کہ دشمن کی جس قدر چاہے اموات ہو جائیں ہو جانے دو۔ اور دشمن کو
اس وقت تک نقصان پہنچاتے رہو تا آنکہ خود اپنے سپاہی نہ مرنے لگیں،اور لاشیں بکسوں اور
تھیلوں میں بند ہو کر امریکہ نہ پہنچنا شروع ہو جائیں۔ ماحولیات کے بارے میں جو کچھ اب
تک ہوا ہے اس میں بے انصافی اور عدم مساوات پر ابھی کم توجہ دی گئی ہے۔ یہاں ماحولیات
کا لفظ وسیع معنوں میں استعمال کیا گیا ہے یعنی اس میں حیاتیاتی تنوع اور تنوع کے وہ مفہوم بھی
آجاتے ہیں جس سے ثقافتی تنوع کی بقا کا سوال بھی آجاتا ہے۔اور لفظ معیشت کو اس کے
صحیح معنوں میں استعمال نہیں کیا جاتا۔ مہاتما گاندھی نے ایک مرتبہ اپنی مخصوص بصیرت کا
مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر ایک چھوٹے سے جزیرے پر آباد قوم کو اپنے لوگوں کی
ضرورتیں پوری کرنے کے لیے ایک عالم کا خون نچوڑنا پڑے تو پھر یہ اندازہ لگائیں کہ
ہندوستان (یا چین) کے لاکھوں لوگوں کی ویسی ہی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے کس قدر
استحصال کرنا پڑے گا؟ امریکہ میں ترقی پذیر ممالک کے اصراف یا صرفہ کے مقابل میں شرح
تناسب چالیس اور ایک ہے۔اور یہ ہمارے عہد کی تلخ حقیقتوں میں سے ایک ہے۔اور امریکہ
اور باقی ممالک میں جس قدر فرق ہے امریکہ کی ساری دریا دلی بھی اس کا معمولی سا
بھی مداوا نہیں کر سکتی۔ ماحولیات کے حوالے سے اگر سوچنا ہے یعنی اگر وہ واقعی اس طریقے
سوچنے کے لیے تیار ہے تو پھر اسے ماننا پڑے گا کہ بلاشبہ دنیا کے کچھ خطے پسماندہ یا غیر ترقی

یافتہ ہیں۔ مگر تشویش ان کے بارے میں نہیں ہونی چاہیے بلکہ ان کے بارے میں ہونی چاہیے جو بہت زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ آئندہ لمبے عرصے کے لیے غریب نہیں بلکہ بہت زیادہ ترقی یافتہ امیر ملک انسانیت اور زمینی وسائل کے لیے بڑا مسئلہ ہیں۔

ماحولیاتی کثرت الوجودی مسئلہ بڑا گمبھیر ہے، نسل پرستانہ کم ہے، اور یہ مسئلہ کثرت الثقافت، آزادانہ انتخابات اور نہ ہی مغرب کی طرف سے چلائی گئی ماحولیاتی تحریک سے حل ہو سکتا ہے۔ ان مسائل پر مختلف زاویوں سے آواز اٹھانے سے مغرب کے نعروں کو تقویت ضرور ملے گی خصوصاً اس صورت میں جب یہ آوازیں ایک ہی سر میں اٹھائی جائیں۔ ایک مثال، تاریخ کی زبان نے غیر تاریخی وعظوں کو اتنا بے حیثیت کر دیا ہے کہ تاریخ سے محروم لوگوں کو اب ان لوگوں میں شمار کیا جاتا ہے جن کی کوئی ضمیات ہی نہ ہوں (۵) ٹی ایس ایلیٹ کی زبان میں آج کی دنیا اس بات پر متفق ہے کہ قوم کی آزادی کی تاریخ کا ایک ناگزیر یا لازمی عنصر تاریخی احساس ہے۔ اگر لوگوں کو یہ تاریخی احساس نہیں تو پھر اس قوم کا غلام ہونا بھی ناگزیر ہے۔ اس کتاب میں میں نے کم یا زیادہ زور دے کر علم کے موجودہ غالب ڈھانچے کے بارے میں جو سوال اٹھائے ہیں، ان کے باعث نئے نئے سوال پیدا ہوتے ہیں، یا نئی راہیں کھلتی ہیں مثلاً مغرب کے ''مقامی'' کے مقابلے میں گاندھی جی کے ''آفاقی'' یا عالمگیر (گلوبل) تصور، تاریخی اور غیر تاریخی وجود یا اصلیت، محدود مسائل بمقابلہ غیر محدود معاملات۔ بہر طور ان کی مخالفت یا ان کے درمیان فرق صرف روایت اور جدیدیت کا نہیں، نہ ہی یہ فرق آفاقی اور مخصوص تصورات میں ہے۔ بلکہ میرا مقصد یہ معلوم کرنا ہے کہ مغرب کے استدلال میں آفاقیت کا جو تصور دیا گیا ہے وہ کیسے اتنا غالب ہو گیا اور ان کے مقابلے میں آفاقی تصور کیا ہیں جنہیں ہم اپنا سکتے ہیں۔ انیسوی صدی کی چھٹی دہائی میں یہ حقیقت مانی جاتی ہے جو ایک نعرے کی مرہون منت تھی کہ ''سوچو آفاقی، عمل کرو مقامی'' (سوچ آفاقی عمل) اور فعال طبقے اس نعرے سے تحریک حاصل کرتے تھے۔ آج بھی دنیا کی آزادی پسند اور ترقی پسند طاقتوں کے اندر اسی نعرے کی گونج سنائی دیتی ہے۔ یہی مسئلہ اس کتاب کا موضوع ہے۔ ہم متذکرہ نعرے کی جبریت کے حصار میں تھے اور اس جبر سے رہائی کا خیال ہمیں یہاں تک لے آیا کہ ''سوچ مقامی، کام آفاقی''۔ یہ میری خواہش ہے، مابعد جدیدیت کی کشمکش کا سوال نہیں ہے۔ اور اپنے دوست ضیاالدین سردار کی طرح میں بھی توقع کرتا ہوں کہ مغرب (۶) کے لیے بھی یہ

بات بڑی دلچسپ ہو گی مگر اس معاملہ میں بھی مغرب کے نزدیک ان تہذیبوں کی کوئی خاص اہمیت نہیں جہاں ہمیشہ حقیقت اور اخلاقی سوچ کا جھکاؤ کثرت الوجودیت کے حق میں رہا ہے۔ سو اس دلچسپ معاملہ کو کتاب میں پیش کرتے ہوئے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ بعض اوقات اسے متضاد باتوں کا مجموع تصور کیا جائے گا اور اس کی وجہ یہ کہ اس میں گاندھی اور بل گیٹس کے خیالات کو اور ماحولیات کی مساوات اور معاش ناانصافی کو پہلو بہ پہلو رکھ دیا ہے یا نتھی کر دیا ہے۔

میں نے اس کتاب کا پہلا مسودہ اور تعارف کا بہت سا حصہ مکمل کر لیا تھا جب ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹاگون پر 11 ستمبر کو دہشت گردوں کا حملہ ہوا۔ ان واقعات کے بعد جو بہت سے مسائل پیدا ہوئے ان سے میری کتاب کے اصل موضوع کا بھی قریبی تعلق ہے۔ چنانچہ میں نے مصلحت یہی سمجھی کہ کتاب کی تکمیل کے بعد اس میں ایک اور طویل تکمہ لگا دوں۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس کتاب میں جو کچھ مباحث چھیڑے گئے ہیں، وہ مندرجہ بالا واقعات کے باعث اور بھی غور طلب ہو گئے ہیں، خصوصاً ان واقعات کے بارے میں گزشتہ چند ماہ میں مختلف ممالک کی طرف سے بڑے بڑے تبصرے پیش کیے گئے ہیں ان کی روشن میں میرا موقف اور بھی اہم ہو گیا ہے۔ کیا عجب بات ہے کہ اتنے طویل عرصہ تک دنیا افغانستان کی صورتِ حال کے بارے میں آنکھیں بند رکھے گی اور خطہ ارض کے اس حصے کے خلفشار سے اس وقت تک بے نیازی برتی جائے گی جب تک خود "سلطنت" پر حملہ نہیں ہو جائے گا۔ یہ رویہ دراصل اختلاف اور شعبہ جاتی تقسیم یا جزواً جزواً معاملہ سمجھنے کی مثال ہے اور میری کتاب کا اصل مسئلہ بھی تو یہ اختلاف یا جزواً جزواً مسئلہ کی تقسیم ہی تو ہے۔ میں نے مابعد مسودہ والے مضمون میں کہا ہے کہ امریکی دانشوروں کی نظر میں دنیا کو دیکھنے کے لیے جو جزوی یا شعبہ جاتی تقسیم کی گئی تھی اس میں افغانستان کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ اسی طرح مشرق وسطیٰ کے ماہرین اور نہ ہی جنوبی ایشیا کے بارے میں کام کرنے والے عالموں کی مختصر تعداد کو کبھی بھی افغانستان سے کوئی دلچسپی پیدا ہوئی۔ چنانچہ یہ کہنا بجا ہے کہ مابعد مسودہ جو مضمون لکھا گیا ہے اسے کتاب سے الگ بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ لیکن وہ اس کتاب کا لازمی حصہ ہے کیونکہ مغربی علم کے غالب ڈھانچے پر میں نے جو حملہ کیا ہے، جو تجاویز دی ہیں وہ۔ اور میرے جو مرکزی دلائل ہیں سب کو اس مضمون سے بڑی تقویت ملتی ہے۔

باب 1

ہزاری کا معاملہ

اکیسویں صدی ہم پر طلوع ہو رہی ہے۔ ہزاری کے ماننے والے تو اپنی توانائی "Y2K" پر صرف کر رہے ہیں۔ بعض یہ سوچ رہے ہیں کہ کیا یکم جنوری 2000 یا یکم جنوری 2001 سے واقعی ہماری تاریخ میں کوئی اہم موڑ آیا ہے اور بعض یہ سوچ رہے ہیں کہ کیا نئی ہزاری یا صدی کا آنا آخر ہمارے تجربے کا کون سا ہمہ گیر حصہ بنتا ہے اور اس کی کیا شقیں ہیں۔ دوسری بہت سی بڑی بڑی چیزوں کی طرح وقت کو بھی مختلف اجزا میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ گھنٹہ، ہفتہ، مہینہ، سال، عشرہ، صدی اور ہزاری۔ ان سب تقسیموں کو فطری سا بنا دیا گیا ہے۔ مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ سات دن یا ہفتے کا زمانی یونٹ کس نے اور کیوں بنایا اور اسی تقسیم کے حوالے سے ہماری زندگیوں میں اور کیلنڈروں میں یہ وقت در آتا ہے اور یہی کہ کیلنڈر جدید عالمی نظام پر چھایا ہوا ہے۔ دنیا میں کوئی بھی اس پائے کا گھسا پٹا مفروضہ نہیں جیسا کہ یہ فقرہ ہے ''ہم سب وقت کے غلام ہیں'' اس ''ہم'' میں سے بعض اوقات اس غیر مغربی دنیا کو خارج کر دیا جاتا ہے جس کی انتظامی صلاحیتوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کم تر مطلوبہ معیار سے بھی کم ہیں۔ پھر یہ غلامی یعنی تصور غلامی کوئی زیادہ پریشان کن بھی نہیں لگتا بلکہ اس اعتبار سے انتہائی قابل پذیرائی ہے کہ وقت کے حوالے سے انسانی معاملات میں ہونے والی ترقی کا فیصلہ کن تعین کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اس کا تعین دنیا کو ایک نظام میں لانے پر بھی ہوتا ہے جس کے بارے میں ہر دم یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ دنیا اس انتشار اور عدم اطمینانی کے کھڈ میں گرنے ہی والی ہے۔

اکثر زندگیوں پر کیلنڈروں اور نظام اوقات کی حکومت ہے۔ مگر تاریخ کی اس وضع کے بارے میں کچھ بھی تو لازم وملزوم نہیں یعنی یہ تقسیم ہی ہمیشہ تاریخ پر حاوی نہیں رہی۔ یہ تو اٹھارھویں صدی کے نصف کی بات ہے جب صنعتوں کا آغاز ہوا اور کارخانوں میں کلاک لگا دیئے گئے۔ اور اوقات کا انتہائی بے رحمانہ نفاذ مزدروں اور دوسرے کارکنوں پر ہونے لگا اور وقت ان کے لیے ایک حقیقت بن گیا۔ اگلے ایک سو سال کے عرصہ میں مغرب میں وقت کے اعلیٰ معیار قائم کیے گئے۔ اگرچہ مقامی باشندوں (نوآبادیات) کو ابھی کلاک سے سبق سیکھنا تھا مگر دوسری طرف پوری دنیا پر گریگورین کیلنڈر کا گہرا سایہ پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ بعض حلقوں کے مطابق غیر ترقی یافتہ ممالک میں اب بھی لوگ وقت کا پورا پورا فائدہ نہیں اٹھاتے۔ مگر بعض دوسرے معاملات میں ان ممالک کے لوگ مغربی کیلنڈر کے بڑی حد تک قیدی بن چکے ہیں۔ مثلاً سالگرہ منانا ایک ضمیاتی رسم بن چکی ہے اور اس تقریب سے اندازہ لگایا جاتا ہے کہ ان ثقافتوں کے حلقہ احساس میں کہاں تک جدیدیت اور سیکولرزم رچ بس گیا ہے۔ یہ دوسری بات کہ سالگرہ کی پارٹیوں کا رنگ روپ مقامی ثقافتی رسموں کے مطابق رواج پاتا ہے۔ بلاشبہ بعض ثقافتوں نے اپنا کیلنڈر بھی زیر استعمال رکھا ہے مگر جدیدیت والے کہتے ہیں کہ یہ رویہ دراصل روائت پرست اور قدامت پسند باشندوں کی جدیدیت کے خلاف احمقانہ مزاحمت کا مظہر ہے یا یہ کہ کچھ لوگوں کی اپنے اپنے کیلنڈر سے شدید وابستگی کی بنیاد مذہب ہے۔ یعنی جدیدیت کے سیکولر غلبے میں مذہب کی گنجائش رکھنے کی ایک کوشش ہے۔

نئی ہزاری میں شامل ہونے کے بعد کیا ہمیں ایک لمحہ رک کر یہ سوال نہیں کرنا چاہیے کہ یہ ہزاری کس کی ہے، کس کے نام ہے اور ہاتھ کی کون سی صفائی کے باعث عیسوی ہزاری دنیا جہان کے لوگوں کے لیے ایک معیاری نشان بن گئی۔ مثلاً اس ہزاری کے مسلمانوں کے نزدیک کیا معنی ہیں، کیا انہیں اس حوالے سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ کہ عہد حاضر میں ساری دنیا مغرب کی غلام ہو چکی ہے اور دنیا کی واحد بڑی طاقت کی نیت، ارادے اور خواہش سے کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔ اور اس لفظ خواہش میں بہت ہی منحوس قسم کے نتائج بھی چھپے ہوئے ہیں۔
کیا یہ نئی ہزاری کی آمد آمد تھی کہ 90 کی دہائی میں مسلمان ممالک میں سوگوار فضا پیدا ہونے لگی؟ مسلمانوں کے ذہنوں میں ایک خلجان اور بے چینی پیدا ہونے لگی؟ یہ کیفیت ملیشیا، انڈونیشیا، ہندوستان، پاکستان، افغانستان، بنگلہ دیش، الجیریا وغیرہ میں آباد سبھی مسلمانوں کی

تھی؟ ایک ہزار سال قبل بحر اوقیانوس سے شمالی افریقہ اور مغربی بحیرہ روم سے مشرق میں ایشیا اور افغانستان تک دنیا کا ایک بڑا حصہ مسلمانوں کی حکمرانی میں تھا۔ آج اس سے بڑے حصے پر اہل مغرب کا قبضہ ہے اور ایک تمسخر آمیز اصطلاح ''اسلامی بنیاد پرستی'' دنیا جہان میں عام ہوگئی ہے۔

یا پھر یوں ہے کہ یہی سوال ایک دوسرے طریقے سے اٹھاتے ہیں۔ اگرچہ ہم نے بہت دیر سے یہ بات سمجھ لی ہے کہ یورپی طاقتوں نے کس طرح نوآبادیات پر قبضہ کیا اور حکمرانی کی تاہم کیا ہم پوری طرح اس بات سے باخبر ہیں کہ عہد حاضر میں نوآبادیاتی سلسلہ کس طرح مصروف عمل ہے؟ (۱) حال ہی میں یعنی مابعد نوآبادیات کے زمانے میں عجائب گھروں کے مطالعہ کے حوالے سے ہم چوکنے ہو گئے کہ انہی نوآبادیات کا کتنا بڑا ڈھانچہ ایک مرتبہ پھر سامنے آ رہا ہے اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں یورپ اور شمالی امریکہ میں عالمی میلوں کی اس قدر بہتات کیوں ہوگئی تھی اور پھر اس کی علمی اہمیت اور سیاسی جارحیت کی حیثیت کیا تھی؟ مگر ان عجائب گھروں میں جس طرح وقت کی نوآبادی بنایا گیا ہے اس پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ ریل گاڑیوں کا ٹائم ٹیبل، گریگورین کیلنڈر، ہفتہ وار نظام اوقات، کارخانے کے کلاک اور دفتر کے ٹائم کارڈ نے نوآبادیاتی حصار میں لائے گئے لوگوں کی ثقافت میں بڑا زہر گھولا اور وقت کے ان اجزا نے ان میں خون کی پیاس بھی بڑھا دی۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ آج کا جو استعمار ہے وہ آنے والے وقتوں میں حد سے بھی زیادہ نقصان دہ ہو۔ وقت کی اس یکتائی نے بزنس کارپوریٹ اور انتظام کی عالمی ثقافت پیدا کی اور عالمگیریت کو بھی ابھارا جس کی پہچان یہ ہے کہ یہ بہت ہی درمیانے درجے کی انتہائی حریص شے ہے۔ اس نے مستقبل کے تصور کو بھی انتہائی تنگ کر دیا ہے۔ کلاک اور کارپوریٹ وقت کی علامتی تفہیم اس امریکی موقولہ سے زیادہ بہتر کہیں نہیں کی گئی اور وہ یہ کہ ''وقت پیسہ ہے'' اب وقت کے اس تصور (یعنی پیسہ ہونے کے تصور) کے خلاف بات اور مزاحمت کرنے کو بعض لوگ مجذوب کی بڑ ہی کہیں گے مگر وقت کی ثقافتی سیاست ہمیں اس قابل بنا دے گی کہ ہم علاقائی طور پر اپنے دنیاوی مسائل کو بہتر طریق سے سمجھ سکیں۔

نصف صدی گزری لیوس ممفورڈ نے شاندار پیش گوئی کی تھی۔ اس نے کہا تھا صنعتی دور کی کلید سٹیم انجن نہیں، کلاک ہے، کیونکہ کلاک ہی مختلف امور کا تعین کرتا ہے مثلاً توانائی، معیار

قائم کرنا، خودکاری اور آخر میں اس کی خاص حیثیت یعنی صحیح صحیح وقت۔ جدید ٹیکنیک میں سب سے اہم مشین کلاک ہے اور ہر زمانے میں یہی وقت سرفہرست رہا ہے۔ وقت خود اکمل ہے اور باقی مشینیں وقت کی سی اپنی تکمیل چاہتی ہیں۔ (۲)

پچھلی جدیدیت نے وقت کے بارے میں ہمارے احساسات کو بہت زیادہ کند کر دیا۔ یہ کہنا لوگوں کی عادت بن چکی ہے کہ ''وقت نہیں ہے'' بہت زیادہ مصروف ہیں۔ وقت کی بڑی کمی ہے۔ ہر چند صنعتی دور اور سائبر سپیس کے باعث وقت میں خاصی بچت ہوئی ہے۔ یعنی وقت بچانے والے آلات زیر استعمال آ گئے ہیں مگر لوگوں کی بھاری اکثریت یہی کہتی ہے کہ وقت کی بڑی قلت ہے اور امریکہ جیسے ملکوں میں تو کام کا ہفتہ کارکنوں اور کارپوریٹ افسروں دونوں کے لیے بہت لمبا ہو گیا۔ جولئٹ شور کی معروف کتاب دی اوور ورکڈ امریکنز (The overworked Americans) میں لکھا گیا ہے کہ گزشتہ پچاس سالوں کے درمیان دن کے اوقات کار بہت لمبے ہو گئے ہیں یعنی دن لمبا ہو گیا ہے اور 1970 اور 1990 کے درمیان کے دو عشروں میں ہر سال میں اوسطاً نو گھنٹے سالانہ مزید کام ہر کارکن کو کرنا پڑتا ہے۔ (۳)

اور سیبسٹئین ڈی گرازیا سوال کرتا ہے۔ یہ کیا قانون یا اصول ہے کہ وقت بچانے والی مشینری میں جتنا اضافہ ہوتا ہے آدمی کے لیے وقت کی کمی اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے۔ (۴) تو سوال یہ ہے وقت بچاؤ کے نعرے کے کیا معنی ہیں۔ یا یہ کہ بے شک وقت ضائع کرو؟ سوال یہ ہے کہ جو شخص لمبی گاڑی میں سے ٹیلی فون پر باتیں کر رہا ہے وہ وقت بچا رہا ہے یا وہ جن کے پاس یہ آلہ (موبائل) نہیں وہ اسے استعمال نہ کر کے وقت برباد کر رہے ہیں؟ کیا فارغ وقت ضیاع ہے یا اس کا صرفہ بہت اچھا ہے؟ اگر یہ وقت بہت اچھا گزرا ہے تو پھر اس فضول میں گئے وقت میں کیا نام ہوگا؟ کاہلی اور سستی یا دستورِ فراموشی؟ جو وقت بچایا گیا ہے اس کی سرمایہ کاری کیسے کی گئی ہے۔ پھر اس سرمایہ کاری/ وقت کاری کے نتائج یا منافع اتنا کم کیوں ہے۔ پچھلے زمانوں کے مقابلے میں کلاک، دفتری اور فضائی سروس کے اوقات کار اور کیلنڈروں کی وجہ سے زندگی بڑی مشکل میں پڑ گئی ہے۔ عارضی یا زمانی نو آبادیاتی عمل کی کہانی پوری شرح و بسط کے ساتھ باز نہیں کی گئی۔ ڈیوڈ لینڈس کہتا ہے ''یورپ بحیرہ روم کے کنارے کی تہذیب کی آخری، کمزور اور دور افتادہ چوکی سے ایک غالب جارح ہیں اس طرح تبدیل ہوا کہ اور بہت سے ترقیاتی مرحلوں کے علاوہ اس نے میکینکل کلاک ایجاد کر لیا تھا'' (۵) اس مفروضے کے

پیچھے ٹیکنو لاجیکل گمراہ کن جبریت چھپی ہوئی ہے جس سے یہ حقیقت اوجھل نہیں ہونی چاہیے کہ تاریخ کے اس موڑ پر یورپ نے ایشیا، افریقہ اور دوسرے ممالک کے مقابلے میں وقت کے بارے میں ٹیکنالوجیکل اور میکینکل معاملات میں زیادہ دلچسپی لی۔ اوقات کار رکھنے اور کیلنڈر قسم کی کیفیت بنانے کا معاملہ ان اہم سماجی سرگرمیوں میں سے ایک تھا جس کی بنا پر یورپی لوگوں نے برتری حاصل کی اور نوآبادیاتی زبان میں ''سست الوجود مقامی باشندے'' جیسی بدنام زمانہ اصطلاح رائج ہوئی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان باشندوں کے لیے گھڑی بے مصرف تھی وہ وقت کا کم ہی خیال رکھتے۔ اب ان سابق نوآبادیوں کے شہروں اور قصبوں میں کلاک ٹاور نظر آتے ہیں ان کی تعمیر اور تنصیب اسی استعماری دور میں ہوئی تھی یورپ کی ان طاقتوں نے دوسرے غیر یورپی ممالک میں نوآبادیات قائم کرنے سے پہلے اپنے اپنے ملک میں اپنے مذہبی، نسلی اور سیاسی مخالفین کو بھی دبایا اور بڑی سزائیں دیں۔ اس عمل میں وقت کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا گیا؟ مغربی ممالک کی چودھراہٹ کے قیام کے ساتھ ہی باقی کی دنیا میں بھی وہی وقت رائج ہوا جو یورپ میں وضع کیا گیا تھا۔

ہفتے کی ہیئت

اگرچہ سورج کے طلوع اور غروب کے حوالے سے دن اور رات کی تقسیم ہوتی ہے۔ مگر وقت کے بنیادی یونٹ سیکنڈ، منٹ، گھنٹے اور دن بنائے گئے۔ وقت کی جدید تقسیم میں سب سے زیادہ اہمیت ہفتے کے دن کو حاصل ہے۔ ہر چند یہ تقسیم عجب وضع کی ہے مگر اہمیت اسے ہی حاصل ہے زندگی کی سرگرمیوں کا ہفتے کے حوالے سے منصوبہ بنایا جاتا ہے۔ خریداری کا ہفتہ وار دن، ہفتہ وار رسالے، ہفتہ وار کام (نتیجے میں پیر کے روز کی ناخوشگواری) ہفتہ کی شام (ویک اینڈ)، فلموں کی ہفتہ وار تبدیلی وغیرہ وغیرہ۔ ہفتہ وار اوقات کار میں ہی ملاقاتوں اور مصروفیت کا تعین ہوتا ہے۔ سال کے بارے میں مجموعی طور پر بارہ مہینوں، باون ہفتوں کے حوالے سے سوچا جا سکتا ہے مگر اس سال کے گھیرے میں دوسرے معاملات مثلاً خزاں، بہار، گرمیوں کی چھٹیاں اور سکول کی ٹرمز نہیں آتے نہ ہی کسی ایک کیلنڈر مہینہ میں ان کو مجسم دیکھا گیا۔ آدمی سوچتا ہے تو ایک ہفتے کی چھٹی یا سکول میں پڑھائی کے دوران (یونٹ) جو اکثر دس سے پندرہ ہفتوں پر محیط ہوتا ہے۔

سماجیات کے ماہر پر یتزم اے۔ سوروکن نے لکھا ہے: آپ ایک لمحے کے لیے تصور کریں کہ اچانک ہفتہ غائب ہو گیا ہے۔ وقت کے اس یونٹ کے غائب ہونے سے ہماری زمانی تنظیم پر قیامت گزر جائے گی۔ ہماری اجتماعی اور معاشرتی سرگرمیوں میں، ہمارے رویوں میں خصوصاً وقت کی تفہیم میں کیا افراتفری مچ جائے گی... اس لیے کہ ہم ہفتے کے حوالے سے یعنی ہفتہ کو یونٹ سمجھتے ہوئے سوچتے ہیں، ہم وقت کی تفہیم ہفتوں کے حوالے سے کرتے ہیں، ہم ہفتے کے حوالے سے ہی اپنے رویے اور زندگی میں ربط پیدا کرتے ہیں۔ ہم ہفتے کی مدت کے حوالے سے زندہ رہتے، محسوس کرتے، منصوبہ بناتے اور خواہشوں کا اظہار بھی اسی ہفتے کے یونٹ کے حوالے سے کرتے ہیں۔ زمان اور سماجی حقیقت (۶) کے حوالے سے ہفتہ ہماری پرداخت یا رخ بندی کرنے والے اہم عوامل میں شامل ہے۔

سات دن کا ہفتہ کب بنایا گیا اور کہاں بنایا گیا؟ اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ بعض اوقات قیاس کا گھوڑا دوڑایا جاتا ہے کہ سات اصل میں کیا تھا؟ فطری یا ہفتہ بنانے کا تصور قمری سال سے تیاگ ہے جو درحقیقت 28 دن یا چار ہفتوں کی مدت کا نہیں ہوتا۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک تخلیق کائنات چھ روز میں کی گئی ''اور ساتویں دن خدا نے اپنا کام ختم کیا اور ساتویں روز اس نے مکمل آرام کیا'' یوں ساتویں دن اس نے آرام کیا اور ساتویں دن پر اس کی رحمت ہوئی۔ یہ دن مقدس ہوا، اس روز خدا اپنے کام سے فارغ تھا اور اس نے آرام کیا۔ یہودیوں میں مقدس دن سبت اس لیے منایا جاتا تھا کہ وہ یہودیوں کو غیر یہودیوں سے ممیز کر سکے۔ (ezekiel-20:12)۔ اس دن کے حوالے سے وہ غیر یہودی (خصوصاً عیسائی) اور مخالف قبائل میں خصوصاً جلاوطنی کے دنوں میں اپنا ایمان یعنی یہودیت کو (مخالفوں سے بچایا) کرتے تھے۔ عیسائیت نے یہودیت ہی کے بطن سے جنم لیا۔ چنانچہ اس نے سات دن کے دورہ کو ترک نہیں کیا۔ تاہم انہوں نے اس میں ایک فرق ڈال دیا کہ سبت کا دن ہفتے کی بجائے اتوار کو بنا دیا۔ ابتدا میں عیسائی اقلیت میں تھے تو انہوں نے اپنی اجتماعی عبادت کے لیے ایک الگ دن مقرر کیا۔

عیسائیوں نے اپنی شناخت یہودیوں سے الگ کرنے کی خاطر سبت کو اتوار سے مخصوص کر دیا تھا اور الگ پہچان کے اس تنازعہ کا ایک مظہر عیسائیت کا تہوار ایسٹر ہے جس پر دونوں فریقوں کے درمیان کشمکش کی بڑی لمبی تاریخ ہے۔ مشرق بے چرچ ایسٹر اسی اندر منایا کرتے ہیں۔ جس اور یہودی پاس اوور مناتے ہیں۔ اسی روز 325 عیسوی کو پہلی کونسل آف نکاتا کا

اجلاس ہوا تھا۔ اس روز فیصلہ ہوا تھا کہ پاس اوور والے روز ہی ایسٹر منایا جائے۔ ایسٹر اتوار کے روز منانے کا حکم دیا گیا۔ ایسٹر کے لیے اتوار کا دن مقرر کیا گیا۔ جو پورے چاند کے بعد آتا ہے اس طرح دو تہوار ایک دوسرے سے منقطع کر دیے گئے۔ پاس اوور ہمیشہ پورے چاند کو منایا جاتا ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کا جنم دن 6 جنوری کو منایا جاتا ہے۔ مگر کرسمس پہلی بار 25 دسمبر 354 عیسوی میں منائی گئی۔ یہ دن کوئی متنازعہ وغیرہ نہیں تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کے الوہی ظہور کی تقریب چھ جنوری کو ہوتی تھی۔ چنانچہ چرچ نے سوچا کہ حضرت عیسیٰؑ کا جنم اور الوہیت یا نبوت کا دن ایک نہیں ہوسکتا۔ 25 دسمبر کا انتخاب کرتے وقت یہ نہیں دیکھا گیا کہ اس کی تصدیق بائبل یا رائج رسومات سے ہوتی ہے کہ نہیں اس لیے بھی کہ یہ بھی خبر نہیں کہ حضرت عیسیٰؑ سال کے کون سے دن پیدا ہوئے تھے۔ چرچ نے دیکھا کہ 25 دسمبر کو سردیوں کے عروج کا میلہ منایا جاتا تھا اور اس موقع پر قدیم ملحدانہ رسومات ادا کی جاتی تھیں۔ تو اس کی مخالفت کے لیے حضرت عیسیٰؑ کا یوم پیدائش اسی دن رکھ دیا گیا... دنیاوی سیاست اور مذہب میں باہمی رشتے کے حوالے سے عیسائیت کی بھی کوئی نادر حیثیت نہیں ہے۔ پھر جب ساتویں صدی عیسوی میں اسلام آیا تو سات دن کے ہفتے پر کوئی اعتراض نہیں کیا گیا مگر ہفتہ یا اتوار کی بجائے جمعہ کے دن کو مقدس بنا دیا گیا۔ ان کی نظر میں ہفتہ اور اتوار کو برے شگون والے دن سمجھا گیا۔ (۸) اس طرح پیغمبر اسلام نے اسلام پر انفرادیت کی مہر لگائی اور ایمان لانے والوں کو ایک منفرد مذہبی برادری بنا دیا۔ اگر عیسائیت میں چرچ میں جا کر عبادت کرنے کے لیے اتوار کا دن مقرر ہے تو اسلامی ممالک پر جمعے کی حیثیت اس سے (اتوار) سے کہیں بڑھ کے ہے۔ مسلم اکثریتی شہروں میں مسلمان جامع مسجد (جمعہ کی نماز کے حوالے سے) کو زیادہ احترام دیتے ہیں۔ اور وہاں نماز پڑھنے کو بھی زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ مسلمان ممالک میں جمعہ کے حوالے سے قابل ذکر بات یہ ہے کہ جمعہ کو یہودیوں کے ہفتہ (سبت) اور عیسائیوں کے اتوار کے مطابق نہیں منایا جاتا کیونکہ ہفتہ یہودیوں اور اتوار عیسائیوں کے آرام کا دن ہے جبکہ جمعہ کے روز مسلمانوں کو دوپہر کے وقت کھلی اور عوامی سطح پر عبادت کرنے کے لیے بلایا جاتا ہے۔

ان کے علاوہ دوسرے مذاہب مثلاً ہندومت میں بھی ہفتہ سات دن کا ہے اور یہ سات دن غالب قدیم علم النجوم کے ستاروں کے حوالے سے لیے گئے ہیں اور غالب امکان یہی ہے کہ مغرب میں ہفتہ کے سات دنوں کا تعلق علم النجوم ہی سے ہوگا کیونکہ وہاں بھی ان ستاروں کو

بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ ایک عالم فاضل نے لکھا بھی ہے کہ کہ یورپ اور ہندوستان کے ایک دوسرے کے رابطے میں آنے سے صدیوں پہلے ہندوستان میں ہفتے کے جو دن (وار) مقرر کیے گئے تھے اتنے ہی ان یورپی ممالک میں مقرر کی گئے (۱۰) اب ہفتے کے سات دنوں کے تصور سے آزاد زمانی یونٹ ان بڑے مذاہب کے حلقہ سے باہر کے کسی عقیدے کا ہوسکتا ہے۔ یا وہاں پر ہوگا جہاں ایک بڑے مذہب اور ایک مقامی مذہبی عقیدے میں بڑی مفاہمت پیدا ہوگئی ہے اور وہاں پر ایسی سماجی تنظیموں کا تصور بھی ہوگا جن میں سات دن کے ہفتے کا یونٹ کوئی اہم کردار ادا نہیں کرتا۔ تاہم تاریخی طور پر حقیقت ہے کہ ہفتہ ہمیشہ سات دنوں پر مشتمل نہیں رہا۔ بہت سے معاشروں میں ہفتہ کا تصور منڈی جانے والے دن سے وابستہ ہے اور پیرو، کولمبیا، ہندچینی، جنوبی چین اور میسوامریکہ میں ہفتہ تین دن سے لے کر دس دن تک پر محیط ہوتا تھا۔ جنوب مشرقی ہندوستان کے کھاسی قبائل میں منڈی ہر آٹھویں روز لگتی تھی اس لیے ہفتے کے دن آٹھ شمار ہوتے تھے۔ ٹوگو میں منڈی ہر چھٹے دن لگا کرتی تھی چنانچہ ہفتہ چھ دن کا تھا۔ (۱۱)

عہد حاضر میں ہفتہ کے سات دن ختم کرنے کی دو قابل ذکر کوششیں ہوئیں مگر دونوں ناکام۔ دونوں کوششیں دراصل بورژ وعیسائیت کے برے اثرات سے جان چھڑانے کی خواہش کی آئینہ دار تھیں۔ فرانسیسی جمہوریہ نے جو انقلابی کیلنڈر متعارف کرایا تھا1792 کو اس کیلنڈر کا پہلا سال بالانقلابی آغاز قرار دیا تھا۔ اس کیلنڈر کے بھی مہینے تو بارہ ہی تھے مگر ہر ہفتے کو دس دنوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور آرام کا دن اتوار کی بجائے ہر دسویں کا آخری دن قرار دیا۔ اس کے بعد بالشویک حکومت نے ستمبر1929 میں پہلے پانچ دن کا ہفتہ مقرر کیا پھر چھ دن کا۔ یہ اس خیال سے کیا گیا کہ مزدوروں کو یہ خیال رہے گا کہ ہفتہ چھوٹا ہوگیا ہے اس لیے پیداوار زیادہ ہونی چاہیے مگر کیلنڈر میں کی گئی یہ دونوں اصطلاحات ناکام ہوئیں اور فرانس اور سوویت یونین میں سات دن کا ہفتہ بحال کر دیا گیا۔ سات روزہ ہفتہ کی روائت اتنی پختہ اور پکی تھی کہ جب رابنسن کروسو کا جہاز تباہ ہوگیا تو اسے یہ خوف ہوا کہ نہ اس کے پاس قلم ہے نہ کاغذ ہے اس لیے وہ کہیں ہفتے کے دن یعنی تاریخیں ہی نہ بھول جائے، اور عبادت کا دن (سبت) بھی نہ بھول جائے تو اس نے نئے جزیرے پر پہنچ کر پہلا کام یہ کیا کہ چاقو کے ساتھ لکڑی کے ایک ٹکڑے پر اپنی آمد کی تاریخ کھود دی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس جزیرے پر واحد انسان ہے رابنسن کروسو پھر ہر روز نشان لگاتا اور ساتویں نشان کا دن آرام کا دن خیال کرتا، آخر کار

اسے اس جزیرے کا باشندہ ملا تو اس باشندے کا نام اس کے ہفتے کا ایک دن بھی یعنی جمعہ رکھ دیا۔(۱۲)

عیسائی عہد اور گریگورئن کیلنڈر

ان دنوں گریگورئن کیلنڈر کی اہمیت اور استعمال اس قدر بڑھ گیا ہے کہ لوگ مختلف کیلنڈروں کے وجود اور ان کے رواج کی باتیں بھول گئے۔ تاریخ کے طویل ترین حصے میں زیادہ تر دوسرے کیلنڈر ہی رائج رہے، یہ بات بھی انہیں کم ہی یاد ہے کہ گریگورین تو عیسائی مغرب کی پیداوار ہے اور اس کی تاریخ کوئی زیادہ لمبی نہیں تاہم یہی کیلنڈر دنیا پر چھا گیا ہے۔ چین اور ہندوستان کی تہذیبوں کی تو بات چھوڑیں جنھوں نے اپنی طویل تاریخ میں وقت کی پیائش کے لیے بہت سے کیلنڈر اور پیانے ایجاد کیے بحیرہ روم یورپ افریقہ اور ایشیا حتیٰ کہ انکا مایا اور ازٹیک جیسی الگ تھلگ تہذیبوں نے بھی اپنے اپنے وقت کے پیانے اور قاعدے بنا رکھے تھے۔(۱۳)

مصر میں پہلا کیلنڈر 4236 قبل مسیح میں بنایا گیا اس میں سال کے تین سو سوا پینسٹھ دن 365/¼ دکھائے گئے تھے اور یہ کمال کا حساب تھا۔ تاریخ کا ریکارڈ کیے جانے کا سب سے قدیم زمانہ بھی یہی قرار پایا ہے۔ ایک حالیہ اندازے کے مطابق اس وقت دنیا میں مذہبی حوالے سے کم و بیش چالیس مختلف کیلنڈر رائج ہیں لیکن ہوسکتا ہے کہ کیلنڈروں کی تعداد اس سے بھی بہت زیادہ ہو اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے کیلنڈر کی اصلاح کے لیے جب کمیٹی قائم کی تھی تو اس وقت صرف ہندوستان میں بڑے ترقی یافتہ اور بے عیب تیس مختلف کیلنڈر رائج تھے۔(۱۴)

مغرب نے جس طرح نوآبادیاتی انداز میں دوسرے بہت سے معاملات میں اپنی اشیا اور خیال ہمارے ذہنوں پر مرتسم کیے، اسی طرح گریگورین کیلنڈر بھی رائج کیا، تاہم اس کیلنڈر کی سادگی بھی اس کی مقبولیت کا سبب ہے۔ گریگورین کیلنڈر کیسے شروع ہوا، اس کے بارے میں اکثر ایک کہانی سنائی جاتی ہے۔(۱۵) مگر کہانی اس معرکہ آرا انداز میں بیان کی جاتی ہے جیسے یہ دراصل سائنس، عقل اور عام فہم کی فتح ہے۔ مگر اس بیان میں ایک خلا رہ جاتا ہے۔ یعنی جیسے صفر کا خلا... اسی سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ ہر سو سال کے بعد نئے سال پر ہلا گلا ہوتا ہے کیا وہ اس بات پر ہوتا ہے کہ ایک صدی کا اختتام صفر پر ہو یا ایک صدی کا آغاز صفر سے ہو یا اس سال سے جس کے آخر میں ایک کا ہندسہ ہے... اس کیلنڈر کے بارے میں جو تاریخ یا

کہانی مشہور ہے اس سے تھوڑا سا اختلاف بھی ہے جو لوگوں کو پتہ نہیں۔ عام مقصد تو یہ ہے کہ پوپ گریگورین سیزدھم (تیرھواں) نے 1582 میں جولئن کیلنڈر (یہ جولیئس سیزر کے حوالے سے شروع ہوا) میں اصلاح کی مگر اس پوپ سے کوئی ایک ہزار سال پہلے دو پوپوں نے اصل میں اصلاح کی تھی۔ پانچویں صدی کے آخر میں پوپ جلیسئس نے پاپائیت کے بارے میں دستاویز کا ترجمہ کرنے کے لیے ایک مذہبی کارکن ڈاؤنیسئس ایکسیگوس کو پاس رکھا ہوا تھا۔ پھر کچھ عرصہ بعد یہی مذہبی کارکن ڈاؤنیسئس پوپ جان اول کے پاس کام کرنے لگا۔ اس دوران اسے احساس ہوا کہ گنتی کا نظام اینو ڈیوکلیسیانی ایک رومن شہنشاہ دیوکلیسانی سے منسوب ہے جو عیسائیوں کا بہت بڑا دشمن تھا (۱۶) اس لیے گنتی کا یہ نام بدل دینا چاہیے کیونکہ اس نام کے حوالے سے عیسائی دشمن بھی عیسائیوں میں نیک نام گنا جاتا ہے چنانچہ ڈاؤنیسئس نے نئے عہد کو اینو ڈومینی کو حضرت عیسیٰ کی پیدائش کا سال قرار دیا (اس نے یہ غلط تصور قائم کر رکھا تھا) یہ کہ بہت بڑے عالمی مذہب کے بانی کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے یہ اقدام ایک چھوٹا سا نذرانہ تھا۔

ڈیونیسئس کے نکتہ نظر سے تاریخ کا مؤثر آغاز حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے ہوا اور یہی کچھ اہل مغرب بھی سمجھتے ہیں۔ ڈیونیسئس کو حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے پہلے کے زمانے سے کوئی سروکار نہ تھا۔ تاہم دوسرا خطرے والا معاملہ یہ تھا کہ ڈیونیسئس نے نئے عہد کا آغاز صفر سے نہیں ایک سے کیا۔ اس میں تعجب والی بات کوئی نہ تھی کیونکہ رومنوں کی گنتی میں صفر کا ہندسہ تھا ہی نہیں۔ مغرب کے عیسائی عہد میں صفر کا تصور عربوں کے حوالے سے ہندوستان سے آیا اور یہ قصہ دوسری عیسوی ہزاری کا ہے۔ یہ کام بہر طور صرف ڈیونیسئس کا ہی نہیں تھا اس کے دو سو سال بعد عزت مآب بیڈے نے ایکلیسیسٹیکل ہسٹری آف انگلش پیپل میں پہلی بار یہ کہا کہ حضرت عیسیٰ سے پہلے کے سال بھی گنے مانے جائیں اور اس نے حضرت عیسیٰ سے ایک سال قبل کو ایک سال قبل مسیح کا نام دیا۔ (۱۷) اس مرحلہ پر اہل مغرب کی بے خبری اور صفر کے استرداد کے علاوہ بھی کچھ کمی تھی مگر وہ تو اسے صرف حسابی کتابی پسماندگی پر معمول کرتے ہیں سنسکرت میں صفر کے لیے لفظ سنیا تا ہے جس کا مطلب ہے، لا عدم وجود یعنی اسے خلا بھی کہہ سکتے ہیں۔ بہرحال مغرب والوں کو دنیا کی کسی شے سے اتنی وحشت نہیں ہوتی جتنی وحشت انہیں خلا یا خالی ہونے کے خیال سے ہوتی ہے۔ فاتحین نے جب نئی دنیائیں پائیں پھر ان کے بعد خالص پسند (پاک باز) آئے جنہوں نے انگلستان کی صنعتی ترقی کو ناپسند کیا اور

وہ آسٹریلیا اور بحر الکاہل کے دوسرے جزیروں کی طرف نکل گئے۔ انہیں بنجر زمینیں سمجھا گیا جس کا مفہوم صرف یورپی محنت کاروں کے پیداواری عمل سے متعین ہوتا ہے۔ شائد یہی وجہ ہے کہ صفر کے عدم وجود سے ایک ایسی کہانی وابستہ ہے جس کے حصے ہیں گریگورئن کیلنڈر، نوآبادیات اور وقت کے جدید پاسداروں کی لوٹ مار۔

جولین کیلنڈر میں اصلاح کی کوششیں تو جاری رہیں مگر ایسٹر کی تاریخوں کے بارے میں مسئلہ آسانی سے حل نہ ہوا۔325ء میں کونسل آف نکائیا کے اجلاس میں اس مارچ کی تاریخ طے ہوئی اسے دن رات کی برابری کی رسمی صورت دی حالانکہ اصل مطلوبہ دن ۲۱ مارچ سے کچھ پہلے تھا۔ تاہم گذشتہ سولھویں صدی سے ایسٹر اور موسم بہار کی روائتی یکبارگی کو جاری رکھنا بہت مشکل ہو رہا ہے کیونکہ دن رات برابر والی صورت اس دن آگے ہوگئی ہے (۱۸) پوپ گریگوری نے جولین کیلنڈر میں اصلاح کے لیے ایک کمشن بنایا جس کے معزز ارکان نے سب سے پہلے پیروگیا یونیورسٹی کے لیکچر لوگی لیلیو عرف الوایسس لیلیئس کی پہلی بار پیش کردہ تجویز پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیلیئس نے کہا کہ کیلنڈر ایک دم سے دس دن کم کردینے چاہئیں یا لیپ سالوں کے زائد دن ختم کیے جائیں یوں یہ مطابقت چالیس برس میں پیدا ہوسکے گی۔ سیانے کمشنروں نے پہلا طریقہ تجویز کیا اور پھر گریگوری نے ۲۴ فروری 1582 کو سال سے دس دن (۵ اکتوبر سے ۱۴ اکتوبر تک) نکال دیئے۔ پاپاؤں میں بھی ایک قسم کی فرعونیت پیدا ہوگئی تھی اسی کی بنا پر انہوں نے دنیا کو سپین اور پرتگال میں تقسیم کیا اور پھر عیسائیوں سے کہا کہ جس طرح بھی ہو زور زبردستی سے عیسیٰ کی تعلیمات کی روشنی کو ملحدوں اور وحشی انسانوں تک پہنچاؤ۔ ان کے نزدیک کیلنڈر میں سے دس دن ختم کرنے کا عمل مذہبی اعتبار سے یہودیوں کی جلاوطنی اور امریکہ میں مقامی باشندوں کی قطع وبرید کے جرائم سے بھی چھوٹا جرم سمجھا گیا۔ مگر کیا گریگوری اور اور اس کے کمشنر یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے یہ دس دن صرف عیسائیوں کے لیے ختم کیے یا غیر عیسائیوں کے لیے ہی ختم کیے گیے ہیں؟ بعد میں آنے والے جدیدیت پسندوں کی عیسائی تحریک ایکیومنزم اور کثیر الجماعتی (پلولرازم) کے بارے میں موافق رائے ہے یا کیا سائنس کی عقب میں یہ دعوے درست ہے کہ اس طرح آفاقیت پیدا ہوئی اور پھر یہی کیلنڈر جو اب پوری دنیا میں چلتا ہے محدود فرقہ وارانہ مفادات کے حامل افراد نے خلارہ جانے کے خوف سے قائم کیا؟

گریگوری نے ضابطہ بنایا کہ یکم جنوری سال کا پہلا دن ہوگا۔1563 میں شاہ چارلس نہم

(نویں) نے اسے رائج کرنے کا حکم دیا اور فرانس میں 1566 سے یہ طریقہ (کیلنڈر) رائج ہو چکا تھا۔ چنانچہ ایسٹر سے سال کے آغاز کا سلسلہ ختم کر دیا گیا (۲۰) کیلنڈر کی اصلاحات کو سب سے پہلے کیتھولک یورپ میں پذیرائی ملی اور 1700 میں جا کر اسے نان کیتھولک یورپ میں مقبولیت ملی۔ پروٹسنٹ یہ خیال کرنے میں یقیناً حق بجانب تھے۔ کہ گریگوری اصلاحات کے سخت خلاف تھا اس نے سینٹ بارتھولومیو کے قتل عام کا یوم بڑی رنگ رلیوں کے ساتھ منایا تھا چنانچہ وہ کیتھولک مذہبی فرمان باقی غیر کیتھولک عیسائی دنیا پر ٹھونس رہا تھا (۲۱) تاہم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پروٹسنٹ خود بھی ایسی اصلاحات چاہتے ہوں۔ پروٹسنٹ کے اخلاقی ضابطہ اور انتظامی امور کے بارے میں جو تحریریں ہیں اگر ان میں موجود کچھ اور مثبت چیزوں سے ثابت ہوتا ہے کہ انہیں جولین کیلنڈر میں ولیوں کے بہت سے دنوں اور آرام وغیرہ کے دنوں کی بڑی تعداد پر یقیناً اعتراض ہوگا۔ 1700 کے اوائل میں ناروے، ڈنمارک اور ڈچ اور جرمن ریاستوں نے نئے کیلنڈر کو قبول کر لیا۔ انگلستان نے بھی 52-1751 میں اسے رائج کر لیا اور پھر انگلستان نے یہ کیلنڈر شمالی امریکہ میں اپنی نو آبادیات پر بھی لاگو کر دیا۔ ایک صاحب علم نے وقت کی معاشرتی حیثیت کے مطالعہ میں زندگی گزار دی۔ اس کا کہنا ہے کہ سب سے پہلے جن غیر عیسائی ملکوں نے گریگوری کیلنڈر قبول کیا وہ جاپان 1873 اور مصر (1875) تھے۔ یہ دونوں کے دونوں ملک اس وقت جدیدیت اور مغربیت کا رنگ اختیار کرنے کے انقلابی راستے پر گامزن تھے۔ تب سے اب تک گریگوری کیلنڈر کو قبول کرنے کا مطلب ہے کہ معاشرہ مغربی جدیدیت کو اختیار کرنے پر راضی ہے۔ (۲۲) تاہم یہ مغربی کیلنڈر غیر مغربی ملکوں میں مصر اور جاپان سے بھی پہلے رائج کیا گیا مثلاً ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی اسے استعمال کرتی تھی اور پھر اٹھارہویں صدی کے آخر میں ہندوستان کا بہت بڑا حصہ کمپنی کے کنٹرول میں آ گیا اور یہاں گریگوری کیلنڈر رائج ہو گیا۔

پی ڈبلیو ولسن نے اس کیلنڈر کو بین الاقوامی بین المذہبی، پیشہ ورانہ اور بین النسلی قرار دیا۔ (۲۳) مگر اس سے یہ سچ جھٹلایا نہ گیا کہ اس کا منبع عیسائیت' نو آبادیاتی نظام اور مکارانہ جدیدیت ہے۔ گریگورین کیلنڈر کو قبول کرنے کی ایک متوقع وجہ مذہبی بھی ہے جس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہودیوں کا کیلنڈر گریگوری کیلنڈر کے مخالف ہے۔ ایک یہودی مبصر نے وقت کے بارے میں لکھا ہے۔

''اسرائیل کی روح کا لنگر وقت ہے۔ ہر قوم کا ایک اپنا نظام وقت ہے جو قوم کو زبان و

مکان سے وابستہ کرتا ہے اور اسی وقت کے سینے میں اس کی تاریخ اور خوشیاں ہوتی ہیں۔ جس کسی قوم نے خود کو اپنے وقت سے الگ کیا وہ نابود ہو گئی اور اب اس قوم کو زندوں میں شمار نہیں کیا جاتا۔" (۲۴)

مسلمانوں کے رمضان کے مہینے کا گریگوری کیلنڈر سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح مختلف مذاہب کے ماننے والے ہندوستانیوں کے بھی اپنے اپنے الگ نظام اوقات یا کیلنڈر ہیں ان میں بدھ مت، جین مت، ہندومت، اور اسلام کے ماننے والے شامل ہیں۔ بکرمی کیلنڈر سارے کا سارا مذہبی نہیں ہے نہ ہی اسے اصولی طور پر ہندو کیلنڈر کہا جا سکتا ہے ہاں اس کا استعمال کرنے والے زیادہ تر ہندو ہی ہیں۔ دراصل یہ کیلنڈر بھی ہندوستان میں سولھویں صدی میں رائج تمام کیلنڈروں میں ایک مطابقت پیدا کرنے کی کوشش تھی جو اکبر بادشاہ کے زمانے میں ہوئی۔ جس نے ایک نئے دین الٰہی کے فروغ کا بھی کام کیا۔ اکبر نے یہ کیلنڈر شروع کیا تھا گریگورین کیلنڈر کے دو سال بعد۔ اکبر کے اپنے عہد حکومت کا یہ اٹھارھواں سال تھا اور ہجری 992 جبکہ عیسوی 1584 کا سال تھا۔ اس کا نیا منصوبہ کیلنڈر دین الٰہی کی طرح تاریخ الٰہی کہلایا جس کا مطلب سے اللہ کا اپنا کیلنڈر۔ اس کی بنیاد ہندوؤں کے رائج شمسی کیلنڈر پر رکھی گئی اور ہجری کیلنڈر سے بھی مطابقت پیدا کی گئی۔ چنانچہ اس کے ساتھ اکبر کے فرمان پر ہجری تاریخ بھی دی جاتی تھی اور دین الٰہی والی تاریخ بھی۔

سولھویں صدی کی عیسوی سیاست سے قطع نظر گریگوری کا عیسوی عہد سے بڑا پرپیچ تعلق ہے۔ تاریخ کا ایک ایسا نظام جو 525 (اینوڈومنی) میں یا اس کے آس پاس بنایا گیا۔ پھر گیارھویں اور پندرھویں صدی کے درمیان یہ یورپ کے بڑے حصے میں رائج ہو گیا۔ یہاں یاد رہے کہ اسلام کے پیغمبرؐ نے جب نیا مذہب اسلام قائم کر لیا اور اسلام کی فوجیں جزیرہ نما ابرنین میں تیزی سے بڑھتی گئیں۔ اس کے ایک سو سال بعد بیڈلے نے قبل مسیح کے زمانے کو بھی اس طرح ریکارڈ کیا تھا کہ اسے قبل مسیح (بی سی) قرار دیا۔ اب یہ پوچھنا ضروری ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے پہلے کے عہد کے بارے میں تصور قائم کرنا کیوں ضروری تھا؟ اگر تاریخ شروع ہی حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے ہوتی ہے تو پھر بیڈلے کو یہ فکر کیوں لاحق ہوئی کہ قبل مسیح کیا کچھ ہوا؟ دراصل قبل مسیح کے زمانے کا خیال بعد کی (اسلام کے بعد) پیداوار ہے۔ اگر پیغمبر اسلام (محمدؐ) کی مکے سے مدینے کو ہجرت سے ہجری سال کی بنا ڈالی گی یہ ہجرت 622 میں ہوئی اور قبل مسیح سے دراصل اسلام اور اس کے کیلنڈر کی اہمیت کو کم کرنا مقصد تھا یعنی

دوسرے کیلنڈروں کے مقابلے میں اسلامی کیلنڈر کی حیثیت پر بھی مسلمانوں نے زور دیا کہ تاریخ اس کیلنڈر کے تحت بھی ریکارڈ ہو۔ سو بیڈلے کا مقصد یہ تھا کہ زمانی اعتبار سے اسلام کو کم حیثیت ثابت کیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پیغمبر اسلام پیدا چھٹی صدی عیسوی میں پیدا ہوئے مگر انہیں روحانی اعتبار سے پہلے پیغمبروں کی معیت میں رکھا گیا یعنی حضرت عیسیٰ سے بھی پہلے پیغمبروں کو معیت میں رکھا گیا یعنی اسلام کی صورت پذیر یوں ہوئی کہ تب عیسائیت پیچھے سرکنے لگی اور اسلام خود کو خطرناک حد تک عیسائیت کا مستقبل بن کر آگے آ رہا تھا۔ اسلامی بنیاد پرستی کی جدید نمائندگی اور اسلام کا قرونِ وسطیٰ والا مزاج یہ سب اسی تاریخ کا حصہ ہے۔ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہزاری کے شروع ہونے پر جو ہلا گلا کیا گیا اس سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ عیسائیت ہی وہ ستون ہے جس کا سہارا تاریخ عالم نے لے رکھا ہے۔

وقت کی معیار بندی

ابھی کوئی ایک سو سال یا تھوڑا سا زیادہ ہی عرصہ گزرا ہے کہ وقت کی معیار بندی کی گئی۔ اس وقت برطانیہ دنیا کی غالب حکمران طاقت تھا۔ اس لیے تعجب کی بات نہیں کہ 1884 میں انٹرنیشنل میریڈین کانفرنس لندن کے نواح میں گرینوچ میں ہوئی جو صفر طول بلد پر ہے اس طرح برطانیہ کو زمانی غلبہ یا شہنشاہی حاصل ہو گئی چنانچہ تمام گھڑیاں گرینوچ' مین ٹائم (جی ایم ٹی) کے مطابق کر دی گئی۔ اسی گرینوچ مین ٹائم میں سے دوسرے ٹائم (وقت) نکلے ہیں جیسے انڈین سٹینڈرڈ ٹائم (آئی ایس ٹی) پیفک سٹینڈرڈ ٹائم (پی ایس ٹی) وغیرہ وغیرہ۔ اس وقت فرانس ایک اور بڑی استعماری طاقت تھا اور فرانسیسی پریس کو مہذب دنیا کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ فرانس نے وقت کی نو آبادیاتی تقسیم کے اس نظام کی کوشش کی مزاحمت کی ہو گی۔ صرف 1912 میں ایسا ہوا کہ انٹرنیشنل کانفرنس آن ٹائم کا میزبان فرانس تھا۔ اس مرحلہ پر فرانس نے گرینوچ ٹائم کو بلاشرط عالمی معیاری وقت مان لیا۔ یہ خاصیت فرانس کی ہے کہ اس نے اپنی سرزمین پر اپنی شکست بھی بڑے وقار کے ساتھ قبول کر لی۔ (۲۵)

دنیا بھر میں بے شمار لوگوں کے نزدیک وقت کی یہ اجارہ داری نہ تو فطری ہے اور نہ ہی لازمی۔ 1848 میں لندن کی ریل روڈ کمپنیوں نے اپنی گھڑیاں گرینوچ کے وقت کے مطابق کر لیں جہاں (گرین وچ) سترھویں صدی میں ایک رصدگاہ بھی بنائی گئی تھی۔ اگر 1850 والی دہائی کے امریکہ کے بارے میں دیکھا جائے تو تھوریو کے والڈن سے اندازہ لگایا جائے تو

امریکہ میں ٹرین بہت پیچیدہ وسیلہ سفرتھی ورتھوریو کہتا ہے''میں علی الصبح کاروں (ریل) کی آمد ورفت کواس طرح دیکھتا ہوں جیسے چڑھتے سورج کو دونوں کے بارے میں میرے ایک جیسے جذبات ہوتے ہیں۔بعض اوقات کاریں سورج سے زیادہ باقاعدہ اور وقت کی پابند نظر آتی ہیں۔تھوریو کہتا ہے۔

''ریل کاروں کا سٹارٹ ہونا اور آنا دراصل گاؤں میں فجر کی اذان کا کام دیتا ہے۔ وہ اتنی پابندی وقت کے ساتھ آتی اور جاتی ہیں اور ان کی سیٹی کی آواز اتنی زور سے آتی ہے کہ کسان اپنی گھڑیاں اس سے ملاتے ہیں۔اس طرح ایک منظم ادارہ پورے ملک کو ایک ضابطے میں لے آتا ہے۔(۲۶)

بہر طور ریلوں کی باقاعدگی کو وقت کی معیار بندی سے خلط ملط نہ کیا جائے ایک ٹرین ہر وقت روانہ ہوسکتی ہے۔ مگر ایک فرد کس وقت اپنی روانگی اور آمد کا وقت مقرر کرنے کی کوشش کرتا ہے؟1870ء تک ملک میں 70 غیر رسمی یا غیر سرکاری ٹائم زون (وقت کے منطقے) تھے اور اگر ایک مسافر واشنگٹن ڈی سی سے سان فرانسسکو تک سفر کر رہا ہے اور اسے شوق ہے کہ گھڑی کو مقامی وقت کے ساتھ ملاتا رہے تو اسے ستر بار وقت بدلنے کی یہ کارروائی کرنی پڑے گی۔(۲۷) وقت کی معیار بندی کرنے کا زیادہ تر مطالبہ موسمی پیش گوئی کرنے والوں، تاجروں خصوصاً ریل روڈ کمپنیوں کی طرف سے آیا کیونکہ ریل روڈ کمپنیوں کے کرایہ ناموں یا بلوں کے نظام اوقات میں درج مقامی وقت کو سمجھنا بڑا مشکل تھا چنانچہ کمپنیوں سے تاجروں اور مسافروں کی شکایت تھی کہ وہ کوئی ایک ٹائم مقرر کریں جو پورے ملک کے لیے ہوآخر کار1883 میں ریل روڈ کمپنیاں چار ٹائم زون مقرر کرنے پر متفق ہوگئیں اور یہی چار زمانی منطقے اب تک موجود ہیں۔ تاہم نئی منطقوں کے بارے میں لوگوں کو شکائت ہی رہی۔ واشنگٹن پوسٹ نے وقت کے ان ستر حصوں کے بارے میں ایڈیٹوریل میں لکھا کہ اس کی اصلاح کرنا جولئس سیزر کے کیلنڈر کی پوپ گریگوری سیزدھم (۲۸) کی طرف سے اصلاح ہی کی طرح ضروری ہے۔ ریل روڈ کمپنیاں تب صنعتی اور تجارتی ترقی اور مال کمانے کے سلسلے میں بڑی نمایاں تھیں۔انہوں نے انسانی روح کے اندر روائت کے تصور کو دوسری صورت دی اور پھر وقت کے متبادل تصورات مثلاً مقامی،صنمیاتی، جانگلی، مذہبی اور بے شمار دوسری صورتوں کو ختم کر دیا۔

منضبط وقت

بین الاقوامی بزنس شعبوں میں دنیا میں ایک مقبول نام آئی پی ایم سے جانا جاتا ہے اس نے کمپیوٹر ٹائم ایجاد کرنے کا اعزاز حاصل کرلیا ہے۔ بہر طور آئی پی ایم کی ابتدائی صورت اور نام انٹرنیشنل ٹائم ریکارڈنگ کمپنی۔اور ہوسکتا ہے کہ اس کیفیت میں اس نے جدید عہد کی نقاب کشائی میں اہم کردار ادا کیا ہو یعنی جب ایک ہی نظر میں صنفی مستعدی کا اندازہ کرلیا جاتا ہے۔ یک نظر مشاہدہ کے بارے میں اس کے اولیں نظریہ ساز جیری بینتھم نے یہ تعریف کی ہے کہ جن کی نگرانی کی جارہی ہے ان کو نگرانی کرنے والا دیکھ رہا ہے مگر زیر نگرانی اپنے نگران کو نہیں دیکھ سکتے جیسے ایک جیلر سارے قیدیوں کو نظر میں رکھتا ہے مگر قیدی اسے دیکھ نہیں سکتے۔(۲۹) 1894 میں انٹرنیشنل ٹائم ریکارڈنگ کمپنی نے کیا متعارف کرایا؟ وقت ریکاڈر کرنے کا نظام، پھر اس نے پندرہ سال کے عرصے میں اپنی تمام حریف کمپنیوں کا صفایا کردیا۔ ہر ملازم آنے جانے پر اپنا کارڈ پنچ کرتا۔ کمپنی نے اپنا یہ نظام یہ کہہ کر بیچا کہ اس نظام سے آپ کا روپیہ بچے گا، ڈسپلن زیادہ ہوگا اور پیداواری وقت میں اضافہ ہو جائے گا۔1914 میں کمپنی کی طرف سے ایک بروشیئر چھاپا گیا جس میں تاجروں کو کمپنی کے مال پر اس طرح توجہ دلائی گئی کہ وقت ریکارڈ کرنے سے پابندی وقت ہوتی ہے اور اس طرح ہر فرد پر وقت کی قدر و قیمت عیاں ہوتی ہے۔'' یوں صرف وقت کو ہی ترتیب اور باقاعدہ نہیں بنایا جائے گا بلکہ تمام کارکنوں کا وقت بھی وقت سے متعلق مشین کے مطابق بنادیا جائے گا یعنی وہ انسان کم اور وقت کے غلام زیادہ ہوں گے۔ پبلٹی کی ایک صورت یہ تھی کہ کسی بھی کارخانے کو کارکردگی کے لیے یا اس کے باقاعدگی سے کام کرنے اور منافع کمانے کے لیے کوئی شے اتنی خطرناک اور تباہ کن نہیں ہوسکتی جتنی بے وقت تاخیر سے آنے والے کارکن ہوتے ہیں جو جاتے وقت بھی پابندی نہیں کرتے یعنی وقت کی پابندی سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ ٹائم ریکارڈر مشین ایسے ناپسندیدہ عناصر کو باہر نکالنے میں انتظامیہ کے لیے معاون ثابت ہوتی (۳۰) تاہم اصل خواہش تو یہ ہے کہ کارخانے میں معقول قسم کے لوگ کام کریں جو شکل وصورت سے بھی معقول نظر آئیں یہ کارکن ان کارخانوں کا مقدر ہیں جہاں ٹائم ریکارڈر لگے ہوئے ہیں۔ مالکان نے صرف مزدوروں کو اس مشین کے

ہاتھوں ذلیل نہیں کرایا بلکہ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ غریب طبقے کے لوگ بددیانت ہیں اور دھوکا باز بھی ہوتے ہیں اور یہ کہ غریب یا کمین طبقے کی کارکن عورتیں اور مرد اوور ٹائم تو کم وقت کا لگاتے ہیں مگر معاوضہ زیادہ وقت کا مانگتے ہیں۔

ٹائم ریکارڈنگ مشین مزدوروں کے اس جھوٹ کو تو پکڑ سکتی ہے کہ انہوں نے کام کم وقت کا کیا ہوتا ہے اور وہ مطالبہ زیادہ وقت کا کرتے ہیں مگر یہ مشین کام کرنے کے دوران وقت ضائع کرنے کو نہیں روک سکتی۔ کارکن بڑی چالاکی سے ٹائم مشین کے ذریعے نگرانی کی مزاحمت کر سکتے ہیں۔ مثلاً اس مدت میں جتنی زیادہ سے زیادہ پیداوار ہو سکتی ہے اسے کم کر دیں وہ در پردہ اپنی سستی یا کم رفتاری کے ذریعے اعلیٰ کارکردگی اور پیدوار کے اس نظام کو اس طرح ناکام کر سکتے ہیں کہ جو کام تین گھنٹے میں ہو سکتا ہو اسے چار گھنٹے میں جا کر کریں۔ دراصل خواہش تو یہ ہے کہ کارخانوں میں بڑا سائنٹفک قسم کا انتظام رائج کیا جائے۔ اس حوالے سے فریڈرک ڈبلیو ٹیلر نے جدید صنعتی میدان میں بڑا ہنگامہ خیز کام کیا۔ ڈینئل بیل نے 1895 میں ٹیلر کی سائنٹفک انتظامیہ کے بارے میں لکھا ''ہم لیبر کے کام کو جانچنے ماپنے کا پرانا ڈھب طریق ترک کر کے اب خود وقت کی تقسیم کے عہد میں شامل ہو چکے ہیں۔ ٹیلر نے سٹاپ واچ متعارف کرائی اور اس طرح ایک مزدور کی ایک پل کے 100 سویں حصے کی حرکت بھی نوٹ کر لی تا کہ غیر مستعدی کو روک کر پیداوار زیادہ سے زیادہ حد تک بڑھائی جائے۔ ہر کارکن نے جو کام کرنا ہوتا اس کی پہلے سے منصوبہ بندی ہوتی پھر اسے یہ تفصیلی ہدایات دی جاتیں کہ کتنی مدت میں کس طرح اس کام کو مکمل کرنا ہے۔ اب کارکن کے پاس اپنی پیداوار کے کم یا زیادہ کرنے کی گنجائش نہ تھی اور اس کی حیثیت مشین میں ایک پرزے کی سی کر دی گئی۔ جیری ررفکن نے ایسے نئے انتظام والے کارخانے کے بارے میں لکھا۔ مزدور کا دماغ اس کے جسم سے الگ ہو گیا جو اس نے انتظامیہ کے حوالے کر دیا۔ (۳۲)

ٹیلر کے انتظام کے بارے میں اسی قسم کے ڈھانچے کے حوالے سے سسٹمز اور پروسیجرز ایسوسی ایشن نے کلرکوں کے کام کی تفصیل کچھ اس طرح طے کی۔

خانوں کی دراز کھولنے پر صرف وقت	0.04 منٹ
فولڈر کا کھولنا اور بند کرنا	0.84 منٹ
ڈیسک کے مرکزی دراز کا کھولنا اور بند کرنا	0.027
	0.026
کرسی پر سے اٹھنا	0.033
گھومنے والی کرسی میں گھومنا	0.009

سو وقت کی ایسی تقسیم وغیرہ وغیرہ نمبر 33

جب ٹیلر سائنٹیفک انتظامیہ کے اصول بنا رہا تھا اور وقت کے معیار مقرر کر رہا تھا اسی وقت دنیا کی نوآبادیات میں وقت کی یہ تقسیم لاگو کی جا رہی تھی۔ ایک سے زائد بنگالی مورخوں نے چاکری یعنی کلرک کی نوکری کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نوکری میں وقت کی پابندی سخت ہوتی اور اگر ہندوستانی آدمی 58-1857 کی بغاوت کے بعد کی انتظامیہ کے دفاتر یا تجارتی دفاتر میں نوکری کرنے کا متمنی ہوتا تو اسے پہلے وقت کی اس زنجیر میں لازماً اسیر ہونا پڑتا۔ اس وقت زندگی میں اچانک کلاک اور گھڑیاں داخل ہوئیں تو وقت کے انضباطی مقتدرہ کی حیثیت کے ساتھ ساتھ نئے نئے معنی نکل آئے۔ یہ بات سمت سرکار نے لکھی اور کہا "اور بعض لوگوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ وہ اس طرح ترقی کی لکیر کی طرف سفر کر رہے ہیں۔" (۳۴) سرکار نے بعض ایسی ادبی تحریروں کا حوالہ بھی دیا ہے جن میں یورپیوں کی طرف سے نافذ کیے گئے زمانی ضابطہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ 1885 میں ایک بنگالی ڈرامہ کرانی کرت میں سرکاری افسروں کی ایک نئی کھیپ کا بنگالی ملازم شکایت کرتا ہے۔ "اگر ہم دفتر میں ایک منٹ بھی دیر سے پہنچیں تو سارے دن کی تنخواہ کٹ جاتی ہے... اس طرح آدھی تنخواہ تو جرمانوں میں چلی جاتی ہے... سارے دن میں ایک لحہ بھی فارغ نہیں ملتا۔ (۳۵)

افریقہ میں جب لوگوں کو نوآبادیاتی طاقتوں سے واسطہ پڑا تو ان کو بھی یہی لگا کہ وقت کی پابندی بڑی جابرانہ قسم کی ہے۔ شینوا ایشبی کے ناول خدا کا تیر (1964) میں ایک یادگار لحہ وہ ہے جب ایک پادری ازوٹو بدیسی ضلع افسر سے طے شدہ وقت پر ملاقات کرنے جاتا ہے۔ پادری ضلعی افسر کے پاس بروقت نہیں پہنچ پاتا تو ڈسٹرکٹ آفیسر حکم دیتا ہے کہ جب پادری ملنے آئے تو اسے جیل میں ڈال دیا جائے مگر پادری کے جیل جانے سے پہلے

افسر اپنے ہی عقیدہ کے غضب کا شکار ہو جاتا ہے۔ یورپی اور صنعتی ممالک میں تو وقت کو کارخانوں میں مزدوروں کو پابند کرنے اور لیبر کلاس کو مستعد بنانے میں بڑی اہمیت حاصل ہوئی جبکہ نوآبادیات میں وقت کو مقامی سست الوجود اور بے ڈھب قسم کے باشندوں کو خاص نظم وضبط میں لانے کے لیے استعمال کیا گیا۔ اصلاً یہ بھی ضروری تھا کہ مقامی لوگوں کے ساتھ سختی برتی جائے تاہم ڈکنز کے ناول ہارڈ ٹائمز کے مطابق وقت کے بارے میں سخت گیری اور دھات کی مشینری میں جو تعلق تھا وہ مقامی باشندوں سے اوجھل نہیں تھا۔

''دیکھو میرے دوست'' مسٹر باؤنڈر بائی نے کہا ''ہم ایسے لوگ ہیں جو وقت کی قیمت جانتے ہیں اور تم ایسے لوگ ہو جو وقت کی قیمت نہیں جانتے'' مسٹر چالڈرز نے باؤنڈر بائی کا سر سے لے کر پاؤں تک جائزہ لیتے ہوئے دندان شکن جواب دیا ''مجھے آپ سے شناسائی کا اعزاز تو حاصل نہیں لیکن اگر آپ کا مطلب ہے کہ آپ میرے مقابلے میں اپنے وقت سے زیادہ دولت کما سکتے ہیں تو پھر آپ کے جملہ سے مجھے اندازہ ہوا کہ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔''

وقت: جمہوری رنگ/کثیر الوجودی رنگ

جب مغرب کا مقابلہ ہندوستان سے کیا جاتا ہے جو اس سے بڑا کوئی گھسا پٹا جملہ نہیں کہ ہندوستان میں بلکہ بڑی حد تک مبینہ طور پر بہت سے غیر ترقی پسند قدیم اور قبل از جدید تہذیب والے ممالک میں بھی وقت دائرے میں گھومتا ہے جبکہ مغرب میں یہ سیدھی لکیر میں چلتا ہے۔ عرب جغرافیہ دان اور عالم البیرونی 1000 میں ایک بار یا شائد کئی بار محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان آیا۔ کچھ سال یہاں گزارے اس نے ہندوستان اور ہندوستانیوں کے بارے میں ایک ضخیم کتاب لکھی اور اس نے وقت کے بارے میں ہندوستانیوں کے تصورات بھی بیان کیے۔ مگر اس کے مشاہدات میں دائرے میں حرکت کرتے وقت اور سیدھی لکیر والے وقت کا کوئی تذکرہ نہیں (۴۰) البیرونی بہت ہی محتاط مبصر تھا اس نے بے شمار حقائق ریکارڈ کیے، ہندوؤں کے اعتقادات اور رسم و رواج کا ذکر کیا۔ اس کے مشاہدات کی صحت کا اندازہ وقت کے دو تصورات کے حوالے سے ہو سکتا ہے یعنی اس نے وکرم و (بکرم) پر اور ساکا کیلنڈروں کا صحیح فرق بتایا ہے۔ البیرونی نے اس وقت کے ہندوستان میں آٹھ کیلنڈری نظاموں کا ذکر کیا ہے۔ وکرم اور ساکا میں 135 سالوں کا فرق ہے۔ البیرونی کو بڑی حیرت ہوئی تھی کہ ہندو گنتی اور اعداد کے حوالے سے حیران کن حد

تک ترقی کر چکے تھے مثلاً سال 26، 425، 456، 204 اور 132اس کے اپنے زمانے سے بہت پہلے گزر چکے تھے۔اس نے گھما پھرا کے مان لیا اور ''ہندو'' بڑھی ہوئی گنتی سے گھبراتے نہیں یعنی اعداد کی وسعتوں سے گھبراتے نہیں بلکہ یہ کام خوشی خوشی کرتے ہیں۔ تاہم اس نے یہ اشارہ بھی کیا کہ ہندوستان کی گنتی اور جکوک (زمانوں) کی مدت گنتی کے لحاظ سے بہت بڑی (لاکھوں کروڑوں میں) ہوتی ہے جس کی وجہ سے گنتی میں مغالطے کا خدشہ ہوتا ہے جس سے انتشار بھی پیدا ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ ہندو وقت کے ادوار میں بہت دلچسپی لیتے ہیں ان کے ذہن کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ ان کے وقت کے ادوار کی تقسیم سینکڑوں سالوں میں ہوتی ہے۔ جو انسانوں کی تاریخ سے بھی منسلک ہیں اور اس کو ایک کیلنڈر کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے۔(۴۲) صرف یورپی لکھنے والے اور نو آبادیاتی ان کو ہندوستان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرنے کا بڑا شوق ہے۔ مثلاً ہندو وقت کے بارے میں بڑے لاپرواہ ہیں۔ ہندو اس مادی زندگی کو مایا (خیالی وہم) تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ حکومت کی طرف راغب نہیں یا کم از کم اچھی انتظامیہ کے بارے میں فکر نہیں کرتے۔ اسی باعث ہندوستانی معاشرہ جامد ہے یا یہ کہ یہاں وقت تھم گیا ہے۔ یہ یورپی لوگ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ یہ دعویٰ کرتے رہے کہ ہندوؤں میں وقت کا غالب تصور دائرے میں گھومتا ہے۔

دراصل، وقت کے بارے میں تصورات میں یہ بہت بڑا فرق بالارادہ بتایا گیا ہے مغرب کے وقت کے لکیر کی طرح سیدھے تصور سے یہ مطلب نکالا گیا کہ وہ رواں دواں ہے، اس کا مدعا تبدیلی اور ترقی ہے جبکہ ہندوستان میں وقت کے دائرے میں چلنے کے تصور سے یہ مراد لی جاتی ہے کہ یہی سبب ہے کہ ہندو کرموں میں یقین رکھتے ہیں یعنی دوبارہ جنم کو مانتے ہیں تاریخی تبدیلیوں کے مجموعی طور برخلاف ہیں اور اپنی روز کی مناجات اور مابعد الطبیعاتی امور کے بارے میں (زمانی اعتبار سے) لاتعلق یا لاپرواہ ہیں۔ ہندوستانیوں کی وقت کے بارے میں عام سی فہم کی بے چارگی ثابت کرنے کے لیے سب سے زیادہ مثال یہ دی جاتی ہے کہ ان کے پاس دنوں کے لفظ یا نام نہیں مثلاً تابع فعل کل گزرے ہوئے دن اور آنے والے دن دونوں کے لیے استعمال ہوتے ہے اسی طرح پرسوں کا لفظ گزرے دن سے ایک دن پہلے اور آنے والی کل کے اگلے روز کے لیے بیک وقت استعمال ہوتا ہے۔ تاہم ان کے معنی تو ان کے استعمال کے ڈھنگ سے نکالے جاتے

ہیں (۴۳) ہندوؤں کے وقت کے بارے میں یہ اعتراضات ہندوستان میں جدیدیت کے حامیوں کو بڑے اچھے لگتے ہیں جو اکثر کڑھتے رہتے ہیں کہ ان کے ہم وطن وقت برباد کرتے ہیں اور پھر اس پر بھی مصر ہیں کہ ہندوستانیوں کو وقت کے صحیح استعمال کا سبق پڑھایا جانا چاہیے۔ ان جدیدیت پسندوں نے 1975 میں اندرا گاندھی کی طرف سے لگائی گئی قومی ایمرجنسی کو اس لیے خوش آمدید کہا کہ ہندوستان میں پہلی بار سارے سرکاری ملازم عین وقت پر دفتر پہنچے اور ریل گاڑیاں بھی مقررہ وقت پر چلیں۔ ہندوستان میں ٹرینوں کے اوقات کی پابندی کم ہوتی ہے اور کبھی کبھی ٹرینیں چوبیس چوبیس گھنٹے لیٹ چلتی ہیں۔ ریل گاڑیوں میں سفر کرنے والوں میں ریلوے کی پابندی اوقات لطیفے کے طور پر لی جاتی ہے اسی طرح جو ہندوستانی ایک بار بھی بنک میں گیا ہے اس نے لازماً بنک کے کلرک کے منہ سے نکلے یہ الفاظ ضرور سنے ہوں گے کہ ان کا کام کل ہوگا۔ اس لیے کل آ جائیں، (اچھا آپ کل آ جانا) ہندوستان کے بنکوں کا سٹاف بنجامن فرینکلن کی وہ نصیحت نہیں سنی ہوگی جو اس نے نوجوان تاجر کو دی تھی "یاد رکھو، وقت پیسہ ہے" مزید ستم ظریفی کہ پیسہ بھی تو بنکوں کے ذریعے تجارت کرنے والوں کی کرنسی ہے۔ لگتا ہے ہندوستانی اس طرح سوچتے ہیں جو کام کل بہتر طریق سے ہوسکتا ہے اسے آج کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس بات کا مقابلہ فرینکلن کی بات سے کیجئے جو اس نے پور چرڈ سے کہی تھی۔ "کیا تم زندگی سے محبت کرتے ہو؟" تو پھر وقت کو ضائع نہ کرو کیونکہ وقت ہی زندگی ہے۔ دونوں میں کتنا واضح فرق ہے۔ کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے مغرب کے تصور زمانی کا مقابلہ ہندوستان کے وقت کے تصور سے یوں کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کو ہی نیچا دکھایا جائے۔ بعض اوقات اس بدتعریفی کو یونانی فلاسفر ہیراکلائٹس کے اس مقولے کے حوالے سے مزید مؤثر بنایا جاتا ہے کہ ایک بار جو پاؤں دریا میں ڈالا جاتا ہے دوبارہ وہی پاؤں اسی دریا میں نہیں ڈالا جاتا۔ (۴۴) اس بارے میں تو ٹھیک ہے کہ ہمارے اردگرد دمادم تبدیلی ہو رہی ہے اور وقت کبھی ٹھہرتا نہیں۔ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔ اس پر یہ کہ انیسویں صدی کے یورپ کے نظریہ ساز ہیگل، مارکس اور ویبر۔ ہمیں مسلسل یہ باور کراتے رہے کہ ہندوستان میں کئی ہزار سال سے کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ یہاں صرف مارکس کے معروف تبصرہ کا اعادہ کرتے ہیں۔

''ہندوستانی معاشرے کی کوئی تاریخ۔ یعنی معروف تاریخ نہیں ہے۔ جسے ہم اس کی تاریخ کہتے ہیں وہ بے بہ پے بیرونی حملوں کی تاریخ ہے۔ ان حملہ آوروں نے مزاحمت اور تبدیلی سے محروم معاشرے پر اپنی سلطنتوں کی بنیادیں رکھیں (۴۵)

پرانوں کے وقت کے تصورات کے مطابق مختلف ادوار ہزاروں سالوں پر مشتمل ہوتے ہیں اور صرف ایک بادشاہ سینکڑوں سالوں تک حکومت کرتا رہتا ہے تو ان تصورات میں تاریخ کا وقت نہیں آتا۔ لافانی یا ابدی فلسفہ یا علم الارضیات کے ایک طالب علم کے لیے انسانی تاریخ کا وقت کیا معنی رکھتا ہے؟ اٹھارھویں صدی میں انگریز لکھنے والوں کو ہندوستانی کیلنڈروں کے بارے میں کتابوں سے واسطہ پڑا تو دیکھا گیا کہ اس میں وقت کے بڑے بڑے یونٹوں کے علاوہ چھوٹے یونٹ بھی ہیں۔ تاہم ناممکن قسم کے طویل یونٹ یگ کہلاتے ہیں یہ چار ہیں کرتیا، ترتیا، دواپارااور کالی اور یہ علی الترتیب1,296,000 ,864,400 1,728,000اور432,000 سالوں پر محیط ہیں۔ انگریزوں کے نزدیک یہ سب کچھ خیالی ہے اور ابال کھائے تخیل اور انسانی تاریخوں سے مکمل بے دھیانی کی تخلیق ہے۔ تھامس ٹراٹمان نے ایک بصیرت افروز دلیل دی ہے کہ اگر انگریزوں کو ہندوستانی روایات کا علم ایک صدی بعد ہوتا تو انگریز اس طریقے سے ہندوستانی صحیفوں کو رد نہ کرتے۔ ٹراٹمان کے کہنے کے مطابق انیسویں صدی کے نصف آخر میں یہ ممکن ہوگیا کہ بائبل میں درج واقعات کو ترتیب دیا جاسکے اور یہ واقعات انسانی تاریخ کے چند ہزار سالوں پر مشتمل ہیں۔ تاہم ماقبل تاریخ کی تعمیرات، علم الارضیات اور دوسری سائنسوں کی مدد سے بائبل کے زمانے سے بھی بہت پہلے فرعونوں کی تاریخ بھی سامنے آنے لگی اب انسانی وقت بھی انسانی تاریخ و بائبل کے بنائے زمانوں تک محدود نہیں رہی (۴۶) اگر برطانوی لکھنے والوں نے ہندوستانی صحیفوں کو پڑھنے اور ان کی تعبیر زیادہ دھیان سے کی ہوتی تو جو روشنی اب ملی ہے ممکن ہے وہ بہت پہلے مل گئی ہوتی۔

اس طرح ہوسکتا ہے کہ ہندوستانی تصورات وقت نے انسانی تاریخ 'زندگی، ذہن اور کائنات (کاسموس) کے وسیع زمانی منطقوں کو وا کر دیا ہوتا۔ اب یہی باتیں سائنس کے مختلف موضوعات کے اصل مطالعے میں آنے لگی ہیں۔ تاہم مغرب نے بہت سے شعبوں کی طرح وقت کے شعبے سے متعلق اپنی ذہنی یا عقلی تاریخوں کے منبع کو رخ دیا ہے۔ اس کے علاوہ

ہندوستان میں تصور زماں کو وقت کے دائروں سے وابستہ کیا گیا یا اسے ابدی وقت سے منتقی کیا گیا۔ ان تصورات سے مشرقی تصوف کے نمونوں، دانش اور ابدیت سے رشتہ بنتا ہے۔ تاہم اگر دائرے میں رکھے اور سیدھی لکیر پر جاتے وقت کو مقابل میں نہ رکھا جائے اور وقت کو جمہوری اور کثیر الجہتی بنانے کے لیے آسان طریقہ اختیار کیا جائے تو اصل مشکل یہی بنتی ہے کہ اس طرح سیدھی لکیر والے تصور زمان کا غلبہ ہو جائے گا۔ دائرے والے وقت کے بارے میں رائے لکیر والے تصور زمان کی اپنی بنائی ہوئی ہے۔ ان دونوں تصورات کو ایک دوسرے کے مخالف قرار دے کر لکیر والے وقت کے غلبے کو مخالفانہ تصورات پر بھی حاوی کیا جا رہا ہے۔ اس طرح وقت کے ان تصورات کو پیچھے دھکیلا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ ابھی دنیا کے لوگوں کی بودوباش سے غائب نہیں ہوئے۔ (فراغت چھٹی کا وقت اتفاقاً وہ ہے جس میں لائینر (لکیر) اور کلاک کے ٹائم ایک دوسری صورت میں سامنے آتے ہیں۔ فراغت کے ٹائم کے استعمال کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ زیادہ ہی مصروفیت میں گزرتا ہے اور اکثر لوگ لگتا ہے چھٹی کم کرتے ہیں اور شدید مصروفیت میں تھک ہار کر پلٹتے ہیں۔ شائد اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہفتے کے اوقات کار تو متعین ہوتے ہیں مگر چھٹیوں میں کرنے والے کاموں کی لمبی فہرست بنتی ہے کہ یہ کرنا ہے، یہاں جانا ہے اور پھر مصروفیت کے لیے وقت مختص کیا جاتا ہے) وقت کے متبادل تصورات میں عام وقت دوپہر آرام کرنے کا اور خوش وقتی کا فن سے وابستہ ہے۔ ان کے علاوہ وقت کے اور بھی کئی تصورات ہیں صنمیاتی وقت' جنگلی وقت (پیسٹو) اور آ گہی کا وقت ہر وہ وقت جب ہر کوشش پوری سوچ سمجھ یا آ گاہی کے ساتھ کی جاتی ہے۔ اس میں گھڑی کے وقت اور اس کی پیداواری اہمیت کا خیال نہیں رہتا بلکہ باخبر ہونے کی ضرورت اور اہمیت مقدم ہوتی ہے کہ جس میں ایک ایک لمحے کا درود اپنی مکمل صورت میں ہوتا ہے (۴۷) مگر وقت کی اور بھی کثیر الجہتی شکلیں بن سکتی ہیں۔ مثلاً باڈی ٹائم' فوڈ ٹائم اور ریل ٹائم۔

باڈی ٹائم

دنیا کے بڑے بڑے دولت مند ملکوں کے علاوہ پسماندہ ممالک کے بالائی طبقوں میں باڈی ٹائم کا تصور بھی عجیب وغریب انداز میں در آیا ہے۔ جسم کی اپنی زمانی نشوونما اور بڑھوتری کو تیزی سے نظر انداز کیا جاتا ہے لیکن جسم ایک قابل پرستش شے بنا دیا گیا ہے۔ شولنگ کی پرستش کی جگہ لنگ کی لمبائی پر توجہ مرکوز ہوگئی ہے۔ چھاتیوں کو بڑا کرنے یا

ماڈلنگ نے زرخیزی کی دیوی کی عبادت کی جگہ لے لی ہے۔ یہ سوچ کر بھی حیرت ہوتی ہے کہ 1960 کی دہائی میں امریکہ اور دوسرے ملکوں میں بچے کو ماں کا دودھ پلانے کے رجحان میں جو بڑی کمی آئی تھی اس کی وجہ یہ تو نہ تھی کہ مارکیٹ میں بچوں کے بنے بنائے دودھ اور دوسری غذائی اشیا کی فروخت مقصود تھی اور اس طرح بچوں کی خوراک تیار کرنے والی کمپنیوں کو زیادہ منافع دلانا تھا۔ اس کے علاوہ نوجوان ماؤں کی یہ خواہش بھی کہ وہ جنسی اعتبار سے اپنے شوہروں اور ساتھیوں کے لیے پرکشش نظر آتی رہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دودھ پلانے میں وقت کے ضیاع کا خیال ہو چنانچہ اس خیال نے یہ تبدیلی لانے میں اہم کردار ادا کیا ہو۔ بچے کو دودھ والی بوتل پکڑنا سکھایا جا سکتا ہے تو ماں کا دودھ پلانے والا وقت دوسرے پیداواری کاموں میں صرف ہوسکتا ہے۔ یا بچوں کو بوتل سے دودھ پلانے کا کام ان عورتوں کو سونپا جا سکتا ہے جن کا وقت سستے بھاؤ خریدا جا سکتا ہے یعنی انہیں اس کام کے لیے ملازم رکھا جا سکتا ہے۔ جب عورتوں نے کارخانوں میں کام کرنا شروع کیا تو ان پر کھلا ہوگا کہ کارپوریٹ یا صنعتی مستعدی کے وقت اور بچوں کو دودھ پلانے کے وقت میں کوئی مطابقت نہیں پائی جاتی۔ حالیہ سالوں میں بعض کارپوریشنوں میں کام کرنے والی بچوں والی عورتوں کو اپنا دودھ پلانے کے لیے جگہ اور وقفہ دیا جانے لگا ہے مگر یہاں بھی کارپوریٹ وقت ہے جو اس قسم کے سہاروں کا تعین کرتا ہے اور وہ بھی مقررہ محدود وقت کے اندر بچوں کو دودھ پلانے کی اجازت دیتا ہے۔

اگر گزشتہ چند صدیوں کے دوران یورپی لوگوں کے سفرنامے دیکھیں اور ان کا معکوس مطلب نکالیں تو معاملہ مختلف ہو جائے گا۔ یورپی لوگوں نے افریقہ، مشرق اور دوسرے بدیسی مقامات میں جن رسومات کو غیر معمولی اور بعض اوقات بھیانک کہا ہے مگر معقول لوگوں کو ان علاقوں کی وہی رسوم اتنی عجب وغریب نظر نہیں آئیں گی جتنی کہ مابعد صنعتی دور کی قوموں میں ڈھینکی پر چلنے بعض اوقات مل کر اور موسیقی کی دھن پر چلنے کی جو روائت پڑ گئی اور گلیاں پیدل چلنے والوں سے سنجیاں ہو گئی ہیں۔ ایک جدید قسم کے جم (کسرت خانہ) میں مستقبل کی روبٹ قسم کی رونگٹے کھڑی کرنے والی تصویر نظر آتی ہے۔ ہر بندہ حرکت کر رہا ہے اسے بالکل ہو بہو بھی کہا جا سکتا ہے۔ بڑی نپی تلی اور محدود جگہ کے اندر اور سارے کے سارے اک ڈھول کی تھاپ پر حرکت میں ہیں۔ پیدل چلنے کے بھی ایک زمانے میں طرح طرح کے انداز تھے۔ مثلاً وقت گزاری کے لیے چلنا، مٹرگشتی اور

آوارہ پھرنا۔ مگر اب یہ سب صورتیں اپنے پرمایہ ثقافتی مظاہر کے ساتھ غائب ہو گئی ہیں۔ بلکہ بعض سرگرمیوں کو تو جرم قرار دے دیا گیا۔ جیسا کہ آوارہ پھرنے کا معاملہ ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ان کو خاص مقصد اور خاص مفہوم دے دیا گیا ہے اور وزن کم کرنے کے لیے بھی مشینیں ڈھینکی) بنائی گئی ہیں۔ پیدل چلنے سے جو وقت ضائع ہوتا ہے اس کا تقابل دوڑنے کے ''پیداواری وقت'' سے کیا گیا۔ تیس منٹ اگر دوڑا جائے تو یہ تیس منٹ چلنے کے مقابلے میں زیادہ فائدہ مند ہیں۔ مگر دوڑنے کے لیے ''ثقافتی سرمایہ'' یعنی جوانی بھی تو چاہیے اور پھر خاص ڈسلپن بھی۔ آدمی چلتا ہوا نہیں دوڑتا ہوا دفتر جاتا ہے۔

بعض اوقات معمول کے مطابق یا زیادہ اہتمام کے ساتھ باڈی بلڈنگ، ویٹ لفٹنگ یا ایسے ہی دوسرے بڑے بے شمار مشاغل کے لیے وقت رکھا جاتا ہے۔ پھر وقت کی اس تقسیم میں جسم کے تعیش کے لیے بھی وقت مقرر کیا جاتا ہے مگر ان مقررہ اوقات کو باڈی ٹائم کے ساتھ خلط ملط نہ کیا جائے بالغ یا بڑے بچے تو زمانے یا وقت کا جدید تصور اور یونٹوں میں ڈھالے جا چکے ہیں۔ ان کے برعکس چھوٹے بچے تو صرف اس وقت کھانا کھاتے ہیں جب ان کا جسم تقاضا کرے۔ ضروری نہیں کہ ان کے جسم نے اوقات زمانی کی تال پر حرکت کرنا سیکھا ہو۔ تاہم بالغ لوگوں نے بلاشبہ ان زمانی تالوں کو بھلا دیا ہے۔ جسم کو آرام دینے کے لیے خوش وقتی کرنے اور بے حرکت رہنے کے لیے بھی اتنا ہی وقت چاہیے جتنا وقت کام کرنے، کھانے اور دوسری ضروری مصروفیات کے لیے چاہیے۔ اسے باڈی ٹائم کہا جا سکتا ہے۔ سائنٹیفک تحقیق نے لاریب یہ ثابت کر دیا ہے کہ جسم کو دن میں دوپہر کے وقت آرام کرنے یا تھوڑی دیر سونے کی ضرورت ہوتی ہے جیسے کہ بحیرہ روم کے ممالک اور ایشیائی ممالک میں رواج ہے جبکہ شمالی امریکہ، شمالی مغربی یورپ اور جاپان (۴۸) میں قیلولہ کی جگہ کام کی مکینکل عادت نے لے لی ہے۔ انسانی جسم کے لیے یہ مکینکل ٹائم ایک غیر یا بیگانہ شے ہے۔

عورتوں کا جسم زمانی طور پر حمل، پیدائش، دودھ پلانے، ماہواری کے رکنے اور ماہواری کے حوالے سے قیود کا پابند ہے۔ اس لیے مردوں کے مقابلے میں ان کا جسم باڈی ٹائم کے حوالے سے زیادہ حساس ہے۔ چنانچہ اب دھیان حیاتیاتی کلاک کی طرف جاتا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ عورتوں کے سائیکل یا جسمانی فرائض اپنے وقت کے سختی سے پابند ہیں یعنی ان کا وقت مقرر ہے جو ٹل نہیں سکتا۔ عورت کی زندگی کے ابتدائی تیس برسوں میں وہ اپنی

مصروفیات ماہواری کے حوالے سے متعین کرتی ہے یعنی وقت یا واقعات کا تعین اس حوالے سے کرتی ہے۔ عورت کی ماہواری کا عرصہ اوسطاً 29-28 دن کا ہوتا ہے۔ اور عموماً اس کا تعلق چاند کی مختلف تاریخوں سے جڑا ہوتا ہے۔ نائجیریا کی ٹو عورتوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ چاند کی مختلف تاریخوں کے حوالوں سے بتا سکتی ہیں کہ وہ حمل کے کس مرحلے میں ہیں حالانکہ اس علاقے میں قمری مہینوں کا کوئی نام بھی نہیں ہے۔ (۴۹) لیکن جدید طب اور کارپوریٹ کلچر جہاں تک ہو سکے عورت کے اس باڈی ٹائم کو مسترد کرتا ہے۔ چنانچہ مانع حمل اشیا کو ہفتہ وار دورہ کے حوالے سے پیکٹ میں رکھا گیا ہوتا ہے اور عموماً تین سے یا چار ہفتوں سے لے کر پانچ چھ ہفتوں تک کے لیے ہوتی ہیں حالانکہ یہ فرض نہیں کیا جا سکتا کہ عورتوں کی ماہواری پورا ہفتہ ہی رہے گی۔ ایویا تارزیروبیول کے فیصلے میں لکھا ہے ''اصلاً ہوتا کیا ہے کہ ماہواری کے مکمل قدرتی دورے (جو تمام عورتوں کے لیے اٹھائیس دن کا نہیں ہوتا) کی جگہ مصنوعی دورے قائم کیے جا رہے ہیں یعنی ریاضیاتی (حسابی) طور پر صورت بنا کر اسے روایتی معاشرتی دورہ بنا دیا گیا ہے۔'' (۵۰) اب گولی تو عورت کی فطری جسمانی تال کے مطابق ہونی چاہیے مگر گنکالوجسٹ، دواساز صنعت اور بے شمار دوسرے عوامل جن کی زمانی حساسیت مقررہ زمانی وقفوں سے آگے کام نہیں کرتی ان سب کا مفاد اس میں ہے کہ عورت اپنی زمانی تان اور فطری جسمانی صورت یا کیفیت کو ترک کرے۔ یہ باڈی ٹائم بڑی مشکل سے قائم رکھا جاتا ہے اور اس کے لیے جدیدیت کے تمام تر اداروں کی بار بار یلغار کو سہنا پڑتا ہے۔

فوڈ ٹائم

نپولئن کے ایک سوانح نگار نے لکھا ہے کہ اگرچہ نپولئن خود کو فاتح عالم قسم کا اوتار سمجھتا تھا لیکن دوپہر کے کھانے پر اوسطاً آٹھ منٹ اور رات کے کھانے پر تیرہ منٹ صرف کرتا تھا۔ (۵۱) شبہ ہے کہ نپولئن سمجھتا تھا کہ یہ وقت بھی ضائع ہوا۔ کیونکہ اس کے لیے تو صرف وہی وقت کارآمد تھا جو اس کی خواہش کو روشن رکھتا اور اسے اتنی توانائی دیتا کہ وہ دنیا پر فتح پا لے۔ نپولئن تیزی کے ساتھ کھانا کھانے والا تھا۔ فاسٹ فوڈ ایجاد کرنے والا نہ تھا۔ اس قسم کی تمام ایجادات کا سہرا امریکیوں کی ہاتھ کی صفائی کے سر ہے جن سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ جو کچھ بھی دنیا کو دیں گے وہ دنیا میں سب سے بڑا اور سب سے تیز (فاسٹ) ہوگا۔ یہ امریکی ہی ہیں جو ایک بڑی سطح پر ثابت کرنے والے ہیں کہ جس معاشرے یا ملک میں

کھانا تیزی سے کھایا جاتا ہے غالباً وہی ملک دوسروں پر غلبہ پائے گا۔ مگر تجربہ اس کی تصدیق نہیں کرتا۔ یورپ میں سب سے زیادہ کھانے والے ہسپانوی اور اطالوی تھے نوآبادیات ان کی بھی تھیں۔ سپین والے اس وقت تک غالب رہے جب تک انگلستان اور فرانس بحری طاقت بن کر نہیں ابھرے اور اٹلی والے تو بہت دیر کے بعد اپنی سلطنت پھیلا سکے اور ان بچے کھچے حصوں پر جو بڑی یورپی طاقتوں سے بچ گئے تھے۔

جدید تہذیب فاسٹ فوڈ کی لعنت سے داغدار ہوگئی ہے اور فاسٹ فوڈ کے ساتھ کھانے پکانے کا معیار گر گیا ہے۔ ذائقہ خراب کر دیا گیا ہے۔ معدے کے مسئلوں اور عارضوں میں اضافہ ہوا ہے۔ بلکہ مزید یہ کہ اچھی صحت' یار باشی' میز پر کھانے کے آداب اور اس پر ہونے والے باہمی گفتگو سبھی ختم ہوگئے اس گفتگو کو انگریز انشائیہ نگار ولیم ہیزلٹ نے ٹیبل ٹاک کا نام دیا تھا۔ امریکہ میں ایک رسم یوم تشکر کی ہے جسے ایک طرح کا ہالۂ نور بھی میسر ہے بظاہر یہ تقریب زائرین کی محنت کے پھل لانے کے بارے میں ہوتی ہے مگر ایک دوسرے حوالے سے امریکہ کے اصل باشندوں کے قتل عام کی یادگار منانے کی یہی تقریب ہے۔ اس تقریب کی شان کو اس کی سیکولر قسم کی نوعیت سے موسوم نہیں کرنا چاہیے کیونکہ مسیحی اتحاد تحریک کی صورت بھی اس میں پائی جاتی ہے۔ اس موقع پر خاندان کے افراد دوستوں اور غیروں کو بھی ایک ساتھ ایک میز پر بٹھایا جاتا ہے۔ اس لیے بھی کہ یہ جدید اور امریکی تہذیب یں چند ہی ایسی تقریبات میں شامل ہے جنہیں وقت دیا جاتا ہے۔ اس تہذیب کی رنگا رنگی ڈنر ٹیبل کے ارد گرد دیکھنے میں آتی ہے۔ یہاں کھانا بہت آہستہ کھایا جاتا ہے۔ دس سال پہلے اٹلی میں کھانا آہستہ کھاؤ کی تحریک شروع ہوئی تھی اس تحریک کا مدعا یہ تھا کہ انسان انسان کہلانے کا صحیح حقدار اس وقت ہے جب وہ ''رفتار'' سے نجات حاصل کر لے اور فاسٹ لائف کی عالمی حماقت کی مخالفت کرے۔ اس تحریک کے منشور میں درج ہے۔

''ہماری صدی کا آغاز صنعتی تہذیب کے حوالے سے ہوا اور اس میں سب سے پہلے مشین ایجاد ہوئی پھر اسے ہی مثال زندگی بنا لیا گیا۔ ہم تیز رفتاری کے غلام ہو چکے ہیں اور اس مکار وائرس کے سامنے ہتھیار ڈال چکے ہیں۔ تیز زندگی (فاسٹ لائف) نے ہماری عادات بگاڑ دیں، ہمارے گھروں کا تخلیہ برباد کیا اور ہمیں جبراً فاسٹ فوڈ کھلاتی ہے'' (۵۲)

ہوسکتا ہے، اس تحریک کو بہت سے خوش ذوق لوگوں اور بسیار خوروں کی حمائت حاصل ہو گئی ہوتاہم اس کا منشور ایک ایسے مستقبل کی طرف اشارہ کرتا ہے جب خوراک یا کھانے کے لیے مخصوص وقت (فوڈ ٹائم) کو خاصی اہمیت حاصل ہو گی۔ باڈی ٹائم کی طرح فوڈ ٹائم بھی اچھی تہذیب کا حصہ ہے۔ فاسٹ فوڈ بدذوقی اور کھانا کھانے کی بجائے ہڑپ کرنے کی عادت پر اعتراض تو ہوتا ہے مگر اس منشور میں اس پر زیادہ ہی لے دے کی گئی ہے۔ تسلیم کیا گیا ہے کہ صنعتی تہذیب کی آندھی نے نوع انسان کے زمانی وجود کو بھی بدل کر رکھ دیا ہے۔

ریل ٹائم

میں قبل ازیں بتا چکا ہوں کہ ریل کی ایجاد، مسافروں اور سامان کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک انتہائی تیزی سے لانے لے جانے کے عمل کے باعث وقت کی معیار بندی کتنی ضروری ہو گئی تھی۔ چنانچہ وقت کے منطقے (ٹائم کو زونز) بنائے گئے، ہم آہنگ ٹائم ٹیبلز (اوقات آمدورفت) بنائے گئے اور وقت کے پاؤں میں زنجیریں ڈالی گئیں یعنی یہ نہ اپنی من مرضی کر سکے کہ من موجی ہو اور نہ ہی خطرناک۔ تاہم ریل نے وقت کے سماجی استعمال کے حوالے سے ایک اور طرز احساس یا حس پیدا کی، جس پر پہلے کوئی زیادہ غور نہیں کیا گیا تھا۔ ریل سے پہلے ذرائع سفر لوگوں میں میل جول اور ربط پیدا کرتے تھے کیونکہ وہ کاروانوں اور قافلوں کی صورتوں میں سفر کیا کرتے تھے۔ لمبے سفر میں وقت بھی زیادہ لگتا اس لیے یہ وقت باہمی گفت وشنید، یاد باشی، اور مشترک چیزوں پر تبادلہ خیال میں گزرتا۔ اس طرح یہ وقت معاشرے میں زیادہ رابطوں اور ہم آہنگی لے کر آتا۔ ریل کے سفر نے یہ کیا کہ سفر کا وقت بہت کم کر دیا تاہم وقت اور معاشرے کے بارے میں ایک اور طرح کا احساس بھی دیا۔ اس سفر کے باعث بہت ہی منفرد قسم کے افراد ایک دوسرے کے قریب آئے جن کو شائد دوسروں کے ساتھ ایک جگہ پر ایسی زمانی رفاقت کا موقع ہی نہ ملتا۔ اس طرح سفر کم وقت میں طے ہونے لگا مگر یہ بھی ہوا کہ اس سے پہلے جس طویل سفر کے بارے میں سوچنا بھی ممکن نہ تھا اسی قسم کے طویل سفر بھی ہونے لگے۔ یوں وقت کا معاشرتی یا ''معاشرتی وقت'' کا ایک نیا تصور پیدا ہونے لگا۔ تاہم اب بھی ہندوستان، چین روس حتیٰ کہ امریکہ میں بھی ریل کے ایسے سفر

ہوتے ہیں۔ جو چوبیس گھنٹے میں مکمل ہوتے ہیں۔ ریل کے اس سفر نے زبان نسلی احساسات یا مشترکہ مقاصد کے حوالے سے لوگوں کو یہ احساس دلایا کہ ان کا تعلق ایک ہی قوم سے ہے تاہم ایک قوم کے احساس کے ساتھ ان میں ثقافتی تشکیلات کے حوالے سے روح عصر کو بھی سانجھا کیا گیا۔

جدیدیت کے لیے تیز رفتاری میں بڑی کشش تھی اس کے ساتھ ریل نے وقت کو ایک ایسی جنس میں تبدیل کر دیا جو منڈی میں بیچی اور خریدی جا سکتی ہے۔ ریل کے حوالے سے میں نے وقت کی دیدنی بے وقعتی کا جو حال بیان کیا ہے وہ اصل میں امریکہ میں ہی ہوا اور اسی ریل نے ماسوائے شمال مشرقی پٹی واشنگٹن ڈی سی اے لے کر بوسٹن تک بہت سے بڑے شہروں کے باقی سارے ملک کے رابطوں کو توڑ دیا ہے۔ اب ریل کو استعمال کرنے والوں کی اکثر اقسام وہ ہیں جن کے پاس بہت وقت ہے۔ وہ مرد اور عورتیں جو ریٹائر ہو چکی ہیں یا بے گھر ہیں، یا وہ جو امریکہ کی ٹیکنالوجی سے دلدادگی پر اپنی ناپسند کا اظہار کرنا چاہتے ہیں یا وہ لوگ جو ریل کو ابتدائی صنعتی دور کی ایک رومانوی یادگار سمجھتے ہیں۔ امریکہ میں ریل کے زوال کی ایک وجہ بجا طور پر یہ بتائی جاتی ہے کہ آٹو موبائل انڈسٹری اور اس سے متعلقہ کارپوریٹ شعبوں تعمیرات پٹرولیم اور دوسری متعلقہ صنعتوں نے خوفناک قسم کی تشہیر کی اور افادیت کا ڈھنڈورا پیٹا۔ تاہم امریکہ میں فرد اور فردیت کا اظہار بھی ایک سبب ہے لیکن وہاں وقت کے تصور میں جو جدید تبدیلیاں آئیں وہ بھی ریل کے انحطاط کا کوئی کم سبب نہیں۔ آٹو موبائلز میں جو واحد امتیازی بات ہے وہ یہ کہ ایک قسم کی کار میں سوار آدمی اپنے وقت کا تقابل یا مطابقت دوسری کار والے کے وقت سے کرتا ہے۔ یہ دراصل بڑے مربوط اور اشتراک والے معاشرے کے وقت پر ایک تنقیدی تبصرہ ہے۔ ہر چند اس کا جواز یہ ہے کہ یہ ''سوشل وقت'' پیدا کرتا ہے۔ دنیا کو ''رابطے'' میں رکھتا ہے (کئی بڑی بڑی کمپنیوں کی بلند بانگ اشتہاری مہم بھی دنیا کو رابطے میں رکھنے کی ہے) لیکن کار (آٹو موبائل) تو دراصل فطرتاً معاشرتی وقت کی باغی ہے۔ 'فاسٹ فوڈ' تیز رفتاری کا جنون، وقت کی کمی اور زندہ دلی کے زوال کی بہترین تصویر اس فرد میں نظر آتی ہے جو فاسٹ فوڈ ریستوران والی گلی میں ہے اور اسے کار کے اندر کھانا دیا جا رہا ہے۔

وقت پر پہرہ

ہمارے عہد کے پہرے کا لفظ بلاشبہ (واچ) ''پہرہ'' ہے۔ گزشتہ چند دہائیوں کے دوران کئی متعدد ایسی تنظیمیں قائم ہوگئی ہیں جو قوموں اور تنظیموں کے عمل اور کردار پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ مثلاً ہیومن رائٹس واچ، ایشیا واچ، اور ہیلنسکی واچ حتیٰ کہ ایک بی جے پی واچ بھی بن گئی ہے۔ اجزائے پریشان میں ایک اور کا اضافہ۔ یہ واچ یا گروپ ہندو قوم پر بہت بی جے پی کی سرگرمیوں اور پالیسیوں کا جائزہ لیتا ہے۔ بی جے پی کچھ سالوں سے ہندوستانی سیاست پر چھائی ہوئی ہے۔ اسی انداز میں ایک بش واچ بھی ہونی چاہیے جو دنیا کے انتہائی خطرناک فرد کی سرگرمیوں کی نگرانی کرے اور پھر ایک امریکی واچ جو اس ملک پر نظر رکھے جو انقلابی اور اختلافی سیاست اور ماحولیات سے باخبر زندگی کے لیے سب سے بڑا خطرہ بن گیا ہے۔ نظر رکھنے کا مطلب ہے خبردار رہو، یہاں ہمیں اس لفظ کا ایک پرانا استعمال اور معنی یاد آتا ہے۔ ان سنتریوں کے دستے پر نظر رکھو جو بادشاہ یا قلعہ پر متعین پہلے دستے کی جگہ لینے آیا ہے ان دنوں یہ نگران یا پہریدار تنظیمیں زیادہ تر امریکہ میں پائی جاتی ہیں۔ یہ دراصل بزعم خود مقرر کردہ ہمارے سرپرست ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں خود ان پہریداروں اور ان کی سرگرمیوں پر نظر رکھنی چاہیے۔

انگریزی زبان میں (صرف انگریزی میں ہی نہیں) میں پہرہ اور گھڑی (واچ اور کلاک) کے استعارے کی حدیں وسیع کر دی گئی ہیں کہ وہ اب وہ مختلف ثقافتوں پر مباحثوں میں وقت اور دنیا کے غیر معمولی پہلوؤں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے آتی ہیں۔ جغرافیہ دان رابرٹ لیون نے مختلف ثقافتوں میں وقت کے تصورات کا تقابلی جائزہ لیا ہے، اس کا بیان ہے کہ حال ہی میں اس نے ہندوستان کا دورہ کیا اور دارجیلنگ کی ریل کی چھوٹی پٹڑی پر ایک تحریر دیکھی لکھا تھا سلو (آہستہ آہستہ) چار حروف کا مرکب ہے اور لائف (زندگی) بھی چار ہی حروف کا مرکب ہے۔ سپیڈ (تیز رفتاری) میں پانچ حروف ہیں اور ڈیتھ (موت) میں بھی پانچ حروف ہیں (۵۳) مزاح کی یہ ڈراؤنی صورت ایسی ثقافت میں بے جا بھی نہیں جہاں بس ڈرائیور اپنی گاڑی گلیوں میں گردن توڑ رفتار سے چلاتا، چھوٹی گاڑیوں اور پیدل چلنے والوں کو بڑی بے رحمی کے ساتھ ہٹاتا ہے تاکہ اپنی منزل پر پہنچ جائے، حالانکہ اس کے پاس سوائے وقت کے اور

کچھ بھی نہیں ہوتا۔ جہاں وقت ایک جنس نہیں ہے وہاں جدید ثقافت کو وقت کا بھی ایک مسلک بنانا چاہیے جس کے مطابق وقت یا زندگی کے تصور کو پر مایہ بنانے کے لیے وقت کی راہ میں جو کوئی آئے اسے اندھا دھند قتل کر دیا جائے۔ اگر وقت کے مقابل جدیدیت کوئی پیانہ ہے تو پھر ہم احساس اور سمجھداری کی بجائے صرف حس کی مخلوق بن کر رہ گئے ہیں۔

اکیسویں صدی اور نئی ہزاری کے شروع میں ہی یہ سوچنا ضروری ہو گیا ہے کہ کون کون سے ایسے طریقے ہیں جن کے ذریعے وقت کے منطقوں میں رد و بدل ہوسکتا ہے۔ آج وقت کے غالب تصورات مغرب کے جدید نوکرشاہانہ مالی اور کارپوریٹ اداروں میں ہیں ان کے ساتھ ساتھ دانشمندوں کی طبع آزمائی میں جو فزکس، تاریخ اور بشریات وغیرہ کے تحت ہوتی ہے' میکانکی تصور زمان کی دیوتائی نمائندگی تو گریگورین کیلنڈر، سٹاپ واچ، فیکٹری کلاک، ہفتہ وار اوقات کار، ملاقات یا مصروفیات کی کتاب، عیسوی عہد اور وقت کے یونٹ جیسے صدی اور ہزاری' کرتے ہیں جیرمی رفکن نے ''ٹائم وارز'' کا جو خاکہ بنایا ہے اور جس کی اس نے پیش گوئی کی ہے وہ آج کی جدید دنیا کی مکانیت کے بارے میں تشویش (جو زیادہ ہی طاری کر لی گئی ہے) پر غالب آ جائے تو اس امتیاز سے انسانی زندگی کے جو زمانی پہلو ہیں اور جن کا مطالعہ تاریخ کرتی ہے وہی تاریخ مستقبل میں زیادہ اہمیت حاصل کر جائے گی گو اس وقت یہ موجودہ صورت حال کو پوری طرح سمجھ نہیں سکتی۔ وقت (زمان و مکان) کو نئے منطقوں میں از سر نو تقسیم کرنے کا مدعا یہ ہے کہ یہ انسانیت کی خدمت کر سکیں نہ کہ انسانیت کی روح کے مقابلے میں آ جائیں۔ نئے منطقوں سے مراد ہے کہ جسم، کھانے اور زندگی کرنے کے انداز کے لیے وقت کی نئی صورت مقرر کی جائے اور پیدل چلنے، خط لکھنے، وقت فراغت میں گزارنے اور گفتگو کرنے کی ثقافتی صورتوں کی بھی گنجائش پیدا کی جائے۔ ہم پر ابھی وقت کی سیاست کے باب وا ہونے ہیں مگر وہ وقت جب ہمیں اس کے اسرار و رموز جاننے کا موقع ملے گا کوئی زیادہ دور نہیں۔

باب 2

سیاست... ہمارے زمانوں میں

نئی ہزاری کی آمد آمد پر بے شمار مباحثے ہوئے مگر اس گرمئ گفتار میں بیسویں صدی کی عالمی سیاست کے خدوخال پر بہت کم توجہ دی گئی۔ یقینی بات ہے کہ مغربی یورپ میں جب اصلاح کی لہر چلی تھی، تو اس زمانے کے لوگوں کو یہ گمان گزرا ہوگا کہ ان کے زمانے میں عدیم المثال تبدیلیاں آئی ہیں اور جب صنعتی دور کا جابرانہ انداز انگلستان کا حلیہ تبدیل کر رہا تھا تو اس عہد کے لوگوں نے بھی یہی سوچا ہوگا کہ انسانی تاریخ میں سب سے بڑی تبدیلیاں ان کے زمانے میں آئی ہیں۔ یہ ہر نسل کا ایک سچ ہے۔ گزشتہ کچھ صدیوں سے جب تاریخ ریکارڈ کی جانے لگی ہے اور انسانی معاملات میں اس کی اہمیت بھی بڑھ گئی ہے اس عرصہ کی تاریخ میں ہر نسل کو اپنا زمانہ تبدیلیوں کے لحاظ سے سب سے اہم لگا۔ بیسویں صدی میں ہر ہر لحہ طوفانی تبدیلیاں آئیں اور کم از کم ایک مکتب فکر ہے جو سمجھتا ہے کہ اب تاریخ کی اخیر ہوگئی ہے۔ اس اہم مکتب فکر کا خیال ہے کہ عالمگیریت کے ساتھ ساتھ امریکی طرز کی جمہوریت کے فروغ اور پھیلاؤ کے ذریعے انسان اپنی منزل مراد پالے گا۔ ایک عرصہ سے امریکہ کا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ جو ممالک سرمایہ داری کی طرف آ رہے ہیں، وہ سیاسی نظام کے طور پر برضا و رغبت آزادانہ الیکشن کا طریقہ بھی اپناتے جائیں گے جو منڈی کی معیشت سے بڑا لگا کھاتا ہے۔ بنجامن باربر لکھتا ہے۔ ''منڈی ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے اور یہی اعتماد اس خارجہ پالیسی میں ڈھل گیا ہے جو یہ ہے کہ منڈی کو بین الاقوامیانے کا مدعا انہیں جمہوری شکل دینا اور جیسے ہی کوئی قوم یا قبیلہ آزاد تجارت کو قبول کرتا ہے اسے اسی وقت انسانی آزادی کے تحفظ کی ضمانت مل جاتی ہے۔(۱)

سوویت یونین کے انہدام اور مشرقی بلاک پر اس کے غلبے کے خاتمے کے باعث بعض مبصرین کو یہ پکا ثبوت مل گیا ہے کہ تہذیب کے فروغ کے لیے ضروری ہے کہ انتخابی عمل (بیلٹ بکس) کو مرکزیت حاصل ہو (لازمی نہیں بلکہ مرکزی) اور سپر مارکیٹ والا بغلی راستہ بھی مل جائے۔ باقی سب کچھ دائیں یا بائیں بس جہان گزراں ہے۔ ہماری اکثر ہم عصر تحریروں میں طرح طرح کے دلائل سے ثابت کیا جا رہا ہے کہ اب ہم عالمگیر معلومات اور عالمی اصراف والی معیشت میں رہ رہے ہیں اور اب قومی ریاستوں کو پہلی والی اہمیت نہیں رہی۔ سیاسی اور معاشی دباؤ سے آزادی پانے کے بعد کچھ لوگ سرمایہ دارانہ معیشت کا جشن منا رہے ہیں اور کچھ کا خیال ہے کہ لامحدو آزاد تجارت اور گٹھ بند سرمایہ داری کلیت پسند سرمایہ داری کا ایک نقش بنتا ہے جس کے ساتھ انصاف پسندی اور معاشی انصاف کے اعلیٰ مقاصد کا انتقال ہو گیا ہے اور اور ملٹی نیشنل کارپوریشنز یا بہت بڑے گروہ کی بے کھٹکا مکمل حکمرانی کا دور شروع ہو گیا ہے۔ (۲) حال ہی میں ایک کتاب کا بڑا چرچہ ہوا ہے اس کا نام ایمپائر (سلطنت) (۳) رکھا گیا ہے۔ یعنی عالمی سرمایہ دارانہ نظام کی اعلیٰ ترین صورت استعماری طاقت ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ عہد حاضر میں لکھے جانے والے لٹریچر اور تبصروں میں زیادہ تر قوم پرستی اور جمہوریت کا ذکر اذکار ہی ہوتا ہے زیادہ تر بحث مباحثہ انتخابات، مختلف ممالک میں آئینی تبدیلیوں اور عالمگیریت تک محدود ہوتا ہے۔ (عالمگیریت کے حوالے سے اس موضوع پر ایک الگ رنگ کی سرخی جمائی جا سکتی ہے کہ معلومات کا نام نہاد انقلاب تمام مظاہر کے ساتھ آ گیا ہے اور یہ انقلاب بھی بحث کے موضوعات میں شامل کیا جا سکتا ہے) ساتھ ہی ساتھ خواتین، ماحولیات، معاشرتی اور انسانی حقوق کی تحریکوں کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں اس طرح یہ موضوعات بیسویں صدی کے سیاسی ذخیرہ موضوعات میں سے بہت سوں کو نکال کر اپنی جگہ بنا رہے ہیں۔ اب میں بیسویں صدی کے بارے میں زیادہ تفصیل سے بات کروں گا۔ یہ صدی بنیادی طور پر تشدد کی صدی تھی اور تشدد کی لہر ہر جگہ دیکھی جا سکتی ہے.. جبری مشقت کے کیمپ، شہروں پر بمباری، اجتماعی قبریں، جلی ہوئی لاشیں اور انسانی پنجر اب بھی ذہن کے نہاں خانوں میں سلگتے رہتے ہیں۔

1924 میں لگتا تھا کہ جنگ کا ساز و سامان اور عسکریت پسندی تمام معروف حدوں کو توڑ کر بہت آگے جا چکی ہے۔ ایک امن پسند ''ارنسٹ فریڈرک نے دو سو صفحے کی کتاب

چھاپی جس میں عنوان والی تصاویر شامل کی گئیں جن کے ذریعے انتہائی گمبھیر سچائی کے ساتھ دنیا پر واضح کیا گیا کہ جدید تشدد کی کیا کیا ہولناکیاں ہیں" (۴) چنانچہ اب یہ بات کہتے ہوئے بڑا عجیب سا احساس ہوتا ہے کہ آج جو سیاسی تحریریں لکھی جارہی ہیں ان میں اس تشدد کا کوئی ذکراذکار نہیں، اسے قابل ذکر ہی نہیں سمجھا جاتا۔ ہولوکاسٹ (ہٹلر کے ہاتھوں جرمنی میں یہودیوں کا قتل عام) کو ہر جگہ پر یاد کیا جاتا ہے۔ یادرکھا جاتا ہے اور جرمنی میں اگر کوئی کہے کہ یہ قتل عام تو ہوا ہی نہیں تھا تو وہ قابل سزا مجرم قرار دیا جاتا ہے۔ پھر دونوں عظیم جنگوں میں کام آنے والے خصوصاً فوجیوں کی یاد میں بے شکار ملکوں میں یادگاریں بنائی گئیں۔ شناختوں کے حوالے سے ہونے والی سیاست اور تاریخ کی معروف کتابوں اور موقعوں پر تنقید و اعتراضات اس کے ساتھ دبائے گئے تاریخی واقعات پر مسلسل توجہ کے باعث، نسلی لسانی اقلیتوں کے سینکڑوں مسئلے اور مندرجہ ذیل ممالک میں زندہ ہو گئے ہیں۔ آسٹریلیا کے قدیم باشندوں، افریقی امریکی یعنی امریکہ میں موجود حبشیوں، قدیم امریکیوں مرکزی اور جنوبی امریکہ کی ریڈ انڈین آبادی، ہندوستان کے نام نہاد جرائم پیشہ قبائل اور بہت سے دوسرے... جن پر اور جن کے آباؤ اجداد پر حد درجہ تشدد اور ظلم وستم توڑے گئے۔ لیکن اب بھی اس مکمل تشدد کی تاریخ کے ہر باب کو مجرد شکل میں رکھا گیا ہے۔ یا اس کے بارے کچھ معمولی سا بیان یا احوال دیا گیا ہے جس میں اصل ظلم وستم کی پوری تصویر نہیں کھنچ سکتی۔ چنانچہ 1994 کے روانڈا کے قتل عام کو افریقیوں کی صدیوں پرانی مخاصمت کے کھاتے میں ڈال دیا گیا اور اسے قبائلی سیاست کی سفاکی بھی کہا گیا۔ بوسنیا کے مسلمانوں کے قتل کو بلقان کی پرانی پر پیچ کشمکش کی تاریخ کا ایک حصہ قرار دیا گیا اور یہ تاریخ بھی مذہبی جنونیوں کے آدھے سچ اور طلسماتی کہانیوں میں دبی ہوئی ہے۔ کمبوڈیا میں پول پاٹ اور اس کے جی حضوریوں نے جو قتل عام کیا تھا اسے ایک الگ قسم کا خود کار یا خودکشی والا قتل عام قرار دیا گیا۔ یہ بھی کہا گیا کہ دراصل جدیدیت کے خلاف عناصر نے یہ قتل عام کیا اور برائی کی انتہا کردی اس کے علاوہ یہ بھی کہ اس میں وہ کمیونسٹ یا ان کی سوچ بھی شامل تھی جو صنعتی ترقی کے خلاف ایک اور ہی خیالی دنیا میں رہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ تشدد کے اس قسم کے واقعات کا پس منظر تاریخی معاشرت سے ہی بندھا ہو لیکن ان واقعات کے آپس کے تعلقات یا نوعیت اور بیسویں صدی میں تشدد کی تاریخ کو بالعموم نظرانداز کردیا جاتا ہے جیسے اس کا تعلق جدیدیت اور ترقی کے نظریات سے بالکل کوئی نہ ہو حالانکہ انہی نظریات نے

لاکھوں لوگوں کو روس، یوکرین، چین اور دوسرے ممالک میں قبر تک پہنچایا۔ تشدد کی کسی ایک صورت کی تفصیل اور تعبیر ایک مخصوص انداز میں کرنے کی اجازت ہے اور وجہ یہ کہ ایک خاص تاریخی پس منظر میں مخصوص قسم کی مشترکہ وجوہ کو تو شمار کر لیا جاتا ہے جبکہ باقی عوامل یا وجوہ سے صرف نظر کر لیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں ہٹلر کے اسی بے پناہ اعتماد کی مثال لے لیں جب اس نے کہا تھا کہ آرمینیوں کے قتل عام کے بارے میں بہت کم شور شرابا ہوا تھا اس لیے میں یہودیوں کا قتل عام شروع کر سکتا ہوں۔ اور پولینڈ پر حملہ کرنے سے ایک دن پہلے اس نے جرنیلوں سے کہا تھا "اب کون آرمینیوں کے قتل عام کی بات کرتا ہے؟ (۵)

بیسویں صدی میں ہونے والے تشدد کے ساتھ یہ بھی یاد آتا ہے کہ اسی صدی میں نوآبادیات آزاد ہوئیں اور قومی ریاستوں کا نظام مضبوط ہوا اور انسانی حقوق کے بارے میں وسیع پیمانے پر ایک تحریک پیدا ہوئی۔ اقوام متحدہ نے رسماً ان تینوں معاملات کو جوڑ دیا یعنی ان میں ایک اشتراک پیدا کر دیا۔ اقوام متحدہ قومی ریاستوں کے قیام کی حوصلہ افزائی کرتی ہے اور نئی قومی شناختوں کو بخوشی اپنے اندر سمیٹتی ہے۔ دنیا بھر میں انسانی حقوق کے فروغ کے لیے اس نے مختلف بین الاقوامی ڈھانچے اور تنظیمیں بنائی ہیں اور 1945 میں اپنے قیام سے لے کر اب تک مسلسل یہ کوشش کی ہے کہ انسانی حقوق کے مفہوم میں توسیع ہو اس کی ان کوششوں کی مخالفت بھی ہوئی۔ اقوام متحدہ نے نوآبادیات کو آزاد کرانے کے عمل میں بھی کردار ادا کیا۔ ایشیا، افریقہ، مشرق وسطیٰ اور کیریبئنز میں لوگوں کی اکثریت کو صدی کے درمیان ایسا تجربہ ہوا کہ ایک رات وہ ایک غلام نوآبادیاتی ملک میں سوئے تھے۔ اگلی صبح اٹھے تو ایک آزاد ملک کے باشندے تھے اور وہاں پر قوم پرستوں کی حکومت تھی۔ قومی ریاست والی بات صرف بیسویں صدی میں نہیں ہوئی بلکہ یہ سیاسی صورت دوسری جنگ عظیم کے بعد اس وقت اہمیت اختیار کرنے لگی جب یورپی طاقتیں اپنی نوآبادیات سے محروم ہونے لگیں۔ دوسری بار قومی ریاست کا معاملہ سوویت یونین ٹوٹنے کے بعد پھر ابھرا حالانکہ روس کی موت کے بارے میں پیش گوئیاں مختلف نوعیت کی تھیں۔

اکثر یہ دلائل دیئے گئے ہیں کہ آزادی کے بعد لوگوں کی بھاری اکثریت کی زندگی میں کوئی خوشگوار تبدیلی نہیں آئی۔ زندگی بدستور پرانی ڈگر پر رواں دواں ہے بلکہ بعض اوقات تو حالات غلامی کے زمانے سے بھی زیادہ خراب ہو گئے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان ملکوں کے لوگوں اور عورتوں کو خواہ ان پڑھ اور ان گھڑ ہی کیوں نہ ہوں، اپنے

حکمران پسند نہیں یعنی وہ نہیں چاہتے کہ ان پر اپنے لوگ حکمران ہوں۔ بہرطور ان لوگوں کے رویے پر بھی کڑی تنقید کی جاتی ہے جن کی نظر میں بیسویں صدی میں دوسری بہت سی زبردست تبدیلیاں ہوئیں جن کے سامنے نوآبادیات کی آزادی بڑی معمولی بات ہے۔ یہ مفروضہ بھی ہے کہ جن لوگوں کو آزادی کے بعد اس سے کچھ فائدہ ہونا تھا انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ درصل اس طرح ایک پرانی دلیل اور مفروضے کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور وہ یہ ہے جب تک عوام کی بنیادی ضروریات پوری ہوتی رہیں انہیں یہ خیال نہیں آتا کہ کون ان پر حکومت کر رہا ہے نہ ہی انہیں سیاست یا تاریخ سے دلچسپی ہے کہ وہ ان کی زندگی میں کیا کردار ادا کر رہی ہیں۔ مزید یہ کہ عموماً شہری طبقہ کی طرف سے یہ دلیل آتی ہے کہ دیہی علاقوں میں نہ کوئی تبدیلی ہے نہ سیاست نے ان کا کچھ بگاڑا ہے۔ اس شہری طبقہ کے اندر یہ خواہش سرے سے ہے ہی نہیں کہ وہ خود ان دیہی علاقوں میں رہے وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ سابق نوآبادیاتی میں مطلق العنانیت کے علاوہ کوئی دوسری سیاسی روائت ہے ہی نہیں۔ زیادہ زور مشرق کے نظریہ آمریت پر دیا جاتا ہے اس نظریہ آمریت کو مختلف لوگوں نے مختلف نام دے رکھے ہیں۔ مثلاً سیموئل ھنٹنگٹن اسے تہذیبوں کا ٹکراؤ کہتا ہے، برنارڈ لیوی ''اسے'' مسلمانوں کا غضب'' کا نام دیتا ہے، پھر یورپ یا مغرب کی غیر معمولی ااستشنائیت (بالانشینی) کی بھی دلیل دی جاتی ہے جو بڑے بڑے شہری جگا دھری دیتے ہیں اور نسل انسانی میں اصلاح کا دعویٰ کرنے ولے اس کی تعبیر یوں بھی کرتے ہیں کہ بعض قومیں اور نسلیں حیاتیاتی اعتبار سے ہی باقی ماندہ نسلوں اور قوموں سے بلند تر مرتبہ ہوتی ہیں۔

مکمل تشدد... غارت گری

1900 میں دنیا نے جنگ بوئر کے حوالے سے ایک نئے جنگی محاربے کا مشاہدہ کیا۔ سو سال بعد کوسوو میں جو بمباری ہوئی وہ ایک نئی قسم کے لڑا کا جہازوں نے کی۔ ان لڑا کا طیاروں یا اس نوع کی بمباری ایک اور طرح کے تشدد اور قتل و غارت کی شکل میں آتی ہے اور وہ یہ کہ جب تک ہمارے سپاہی دشمن کے حملے سے محفوظ نہیں اس وقت تک دشمن پر اندھا دھند بمباری جائز ہے۔ جنگ بوئر اپنی نوعیت کے اعتبار سے کئی طرح سے ایک استعماری جنگ تھی۔ اس جنگ کا سیاسی پس منظر یہ تھا کہ ایک طرف برطانوی سیاستدان اندرونی طور پر باہم دست و گریباں تھے دوسری طرف دو یورپی طاقتیں ہوسِ زر اور ہوس

اقتدار میں آمنے سامنے آ گئی تھیں اور پھر انگریز اور ولندیزی سیاستدان اپنے مفادات کے معاملات طے کرنے بیٹھے تو انہوں نے علاقے کے بے شمار ملکوں کی افریقی آبادی کی اکثریت اور ہندوستان سے باقاعدہ معاہدہ کرکے لائے گئے محنت کشوں کے مفادات کو پرکاہ کے برابر بھی اہمیت نہیں دی۔ گو اس وقت تک ''ضمانتی کے نقصان'' کی اصطلاح وجود میں نہیں آئی تھی مگر غیر یورپی لوگوں کی حیثیت یورپیوں کی نظر میں ایسی تھی جیسے جہاز سے ناقابل استعمال ٹوٹا پھوٹا پرانا سامان سمندر میں پھینک دیا جاتا ہے۔ یہ تھا سفید فام لوگوں کا انداز جنگ۔

بوئر کی جنگ کی یاد مغربی طاقتوں کے حال ہی میں سامنے آنے والے رویے سے آئی ہے۔ یہ بات کسی صورت بھی فراموش نہیں کی جاسکتی کہ افغانستان کی جنون کی حد تک گراوٹ اور اس کی سیاسی اور ثقافتی افتراق کے بیج بڑی حد تک اس وقت بوئے گئے تھے جب یہ امریکہ اور اس وقت کی سوویت یونین کے درمیان سرد جنگ کا میدان بن گیا تھا۔ دونوں طرف سے ہر کارروائی پر مقامی باشندوں کے مفاد میں کیے جانے کے دعوے کیے جاتے تھے، وائٹ ہاؤس میں مجاہدین کو تصویروں کے ذریعے دکھایا جاتا کہ آزادی کے مجاہد ہیں اور پھر جیسا کہ نوآبادیاتی یا استعماری طاقتوں کی عادت ہے، غرض ختم ہوئی تو ایک دم قطع تعلق کرلیا۔ جب روس کے لیے یہاں اپنا اقتدار قائم کرنا مشکل ہو گیا امریکہ نے افغانستان کو کھلا چھوڑ دیا کہ وہ جتنی تباہی کر سکتا ہے کرلے۔ امریکہ کے لیے یہ دلآویز منظر ایسے ہی تھا جیسے مشرق وسطیٰ میں ایران و عراق دو برادر اسلامی ملک بنام اسلام ایک دوسرے کی دھجیاں اڑا رہے تھے۔ بوئر کی جنگ کے خاتمہ کے کچھ عرصہ بعد ہی آزادی کے متوالے اور صاحب حیثیت یورپی لوگوں نے نسل پرستی کا ایک پکا نظام قائم کردیا۔ یہ غلامی ہی کا دوسرا پہلو تھا جس میں کالے لوگوں کو انسانیت کی سطح سے نیچے گرا کر ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اسی طرح افغانستان میں سوویت یونین سے آزادی حاصل کرنے اور بڑے معزز بنائے گئے لوگوں کو موقع دے دیا گیا کہ وہ انتہا درجے کی علیحدگی پسند حکومت قائم کریں اور دہشت گردی کا ایسا طریقہ اپنائیں کہ جس کے ذریعے ہر مخالف آواز کو جبراً خاموش کرا دیا جائے۔ بوئر کی جنگ کا گھرے سائے آج بھی پڑ رہے ہیں اور ان سے آنے والے واقعات کی کچھ عکاسی بھی ہو رہی ہے۔ بوئر کی جنگ کا بیسویں صدی اور جدیدیت کا اہم ترین عطیہ یہ تھا کہ یہاں اس کے بازوؤں میں مکمل تشدد کا نظریہ پر افشان تھا۔ اگرچہ

خندقوں میں جنگ کا طریقہ پہلی طویل جنگ عظیم میں عام رہا مگر پہلی بار یہ طرز جنگ بوئر میں آزمائی گئی (۷) خندق کی جنگ نے آمنے سامنے بہادرانہ جنگ اور شاندار موت کے تصور کو ختم کر دیا اور پھر عالمی جنگ میں سپاہی لڑائی میں کم اور.......... کیچڑ کے پھندے میں پھنسنے اور کسی چھپے سپاہی کی رائفل سے نکلی گولی سے زیادہ مرے۔ خندق کی کمیں گاہ سے سپاہی لوگ اپنے مدمقابل کو بہت کم دیکھ پائے (۸) پہلی جنگ عظیم میں خندق کی جنگ وسیع پیمانے پر (یعنی صنعتی سطح پر) سپاہیوں کی موت کا باعث بنی۔ اس طرح دوسری جنگ عظیم میں برطانیہ نے جنگ بوئر کی ایک اور یادتازہ کی اور جبری مشقت کے قیدی کیمپ قائم کیے جو انسان کے ہاتھوں دوسرے انسان کی حد درجہ تذلیل کی خوفناک علامت بن گئے۔ جنگ بوئر کے پاکباز دنیا میں سونے کے سب سے بڑے ذخائر کے اوپر صرف خدا کے بھروسے پر نہیں بیٹھے رہے انہوں نے دشمن سے گریز کیا، برطانوی سپاہیوں کو ہراساں کیا۔ ان کی سپلائی لائن کو خراب کرتے رہے اور جدید گوریلا طرز کی جنگ ایجاد کی۔ برطانیہ والے اپنی انصاف پسندی کا بڑا ڈھنڈورا پیٹ سکتے ہیں اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے دنیا کو سپورٹسمین شپ کا بہت خوبصورت تصور دیا ہے لیکن جنگ بوئر میں انہوں نے بوئر کے خلاف ان کی عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو ریوڑوں کی صورت خاردار تاروں کے پناہی خیموں میں دھکیل دیا جہاں اموات کی سالانہ شرح 34 فیصد تھی (۹) انگریزوں کا مردانہ پن اس سے زیادہ نہ تھا کہ انہوں نے یہ مشقتی کیمپ بنا دیے تھے۔ اے جی پی ٹیلر نے بوئر کی جنگ پر تبصرہ کیا ''بوئر کے چالیس سال بعد انگریز تو کم کم مگر ہر یورپی جانتا تھا کہ نازیوں کا مشقتیوں کا کیمپ برطانیہ کے بہیمانہ (۱۰) اطوار پر ایک طنز تھا اور اس کا نام بھی انگریزوں کے ایسے کیمپوں پر طنزاً رکھا گیا تھا۔

اس صدی کے آخر میں یعنی بوئر کی جنگ کے سو سال بعد نیٹو کی فوجوں نے سربیا میں زمین سرما بنا دی تھی اور یہ بیسویں صدی میں مکمل تشدد کے حامیوں کے جبر وستم کی گواہی تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سب سے زیادہ بمباری (یعنی جہازوں کی تعداد کے لحاظ سے) سربیا اور کوسوو میں کی گئی اور پوری یکسوئی کے ساتھ اور سلوبوڈن میلوسیوک نے غیر مشروط طور پر امریکی الٹی میٹم کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ اس ہوائی بمباری کا بھی ایک منفرد قسم کا پہلو تھا اور یہ دلیل بھی جیسے کئی بار دوہرایا بھی گیا کہ اب بین الاقوامی قانون میں انسانی قدروں کی بنا پر مداخلت کے بعد بڑی بے دردی کے ساتھ انسانوں کو قتل کیا جا سکتا

ہے اور اسی کا اظہار اس جنگ میں ہوا۔ دنیا میں ایسی کوئی جنگ نہیں لڑی گئی جیسی جنگی کارروائی امریکہ اور نیٹو والوں نے سربیا میں کی اور جس کا اصول یہ تھا کہ اپنا کوئی آدمی نہیں مرنا چاہیے لیکن دشمن کے زیادہ سے زیادہ آدمی ماردو (ہر چند امریکہ نے عراق کی جنگ میں زمینی فوج اتار کر یہ تاثر دیا تھا کہ امریکی بھی اپنے سپاہیوں کو مروانے کے لیے تیار ہے) چنانچہ نیٹو فوجوں کے سپاہیوں کی جان بچانے کے لیے واحد طریقہ یہ قرار دیا گیا کہ سربیا میں جہازوں سے اتنی بلندی سے بمباری کی جائے کہ زمین سے کوئی انٹی ائرکرافٹ گولہ یا میزائل ان کو نشانہ نہ بنا سکے۔ اور یہ بمباری ایسی تھی کہ وہاں سے یہ اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ آیا نشانہ بننے والی شے فوجی ہے یا سویلین۔ جدید طریق جنگ میں یہ اصول مانا گیا ہے کہ نشانہ کے بارے میں یقین ہونا چاہیے کہ یہ فوجی ہے سویلین نہیں۔ مگر اس اصول کو بالارادہ ترک کر دیا گیا اور کہا گیا کہ سربیا میں ہر سول شے بھی فوجی مقاصد یعنی دونوں کاموں کے لیے استعمال ہوتی ہے یعنی بجلی کے پلانٹ، پل، پانی کے بند اور روزمرہ زندگی سے متعلق تعمیرات سبھی کا دوہرا استعمال ہے اس لیے یہ سب فوجی نشانہ ہیں اور ان پر بمباری کی جا سکتی ہے۔ موت ایک طرف ہے اور زندگی دوسری طرف۔ یہ غیر ایٹمی ایٹمیت کی نئی وجودی ثنویت ہے جو مغرب نے دنیا کو انعام کی ہے۔

ایک طرف بوئر کی جنگ ہے اور دوسری طرف علاقہ بلقان میں نیٹو کا فوجی جہاد۔ ان دونوں کے درمیان بیسویں صدی ہے جس کے سارے مناظر بڑے افسوسناک ہیں۔ نسل کشی، قتل عام، توسیع اور علیحدگی کی چھوٹی بڑی جنگیں، نسلی یا لسانی مخالفوں کی صفائی، قتل عام میں نوکر شاہی کا حصہ اور بے شمار مختلف النوع ہولوکاسٹ مگر ان سب کو کم ہی تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کے ثبوت ناقابل تردید ہیں اور لاشیں اب بھی دیکھی جا سکتی ہیں اور ان (جرائم) کی فہرست بہت لمبی ہے۔ بہ مانا کہ زیادہ تر استعماری جنگیں (۱۹) بیسویں صدی میں لڑی گئیں۔ امریکہ میں شروع کے سفید فام امریکیوں اور مقامی آبادی کے درمیان ابتدائی ہولناک مقابلوں کے بعد کئی دہائیوں تک مقامی لوگوں کا قتل عام (ہولوکاسٹ) ہوتا رہا اور یہ سلسلہ انیسویں صدی میں بھی جاری رہا۔ ہو سکتا ہے کہ ان حقائق کی بنا پر کہا جائے کہ بیسویں صدی کا تشدد کوئی انوکھا نہیں تھا سوائے اس کے کہ بیسویں صدی میں دو بڑی جنگیں ہوئیں جن کی پہلے کوئی مثال نہیں تھی اور ان میں انسانی جانوں کا سب سے زیادہ اتلاف ہوا۔ تاہم بیسویں صدی میں پچھلی ساری صدیوں کے مقابلے میں انسانی جانوں کا اتلاف

سب سے زیادہ ہوا۔ پہلی جنگ عظیم میں ہزاروں امریکیوں (قدیم باشندوں) کو موت کے گھاٹ اتار گیا۔ یہ لوگ جنگیں نہیں لڑتے تھے نہ ہی جنگی قیدی بنا کر مارے گئے بلکہ انہیں ریاستی پالیسی کے تحت زندگی سے رہائی دلوائی گئی تھی اور لاکھوں کا قتل صرف ایک سال میں ہوا۔ اندازہ یہ ہے کہ چھ لاکھ سے لے کر بیس لاکھ تک یہ قدیم امریکی باشندے مارے گئے تھے۔ اقوام متحدہ نے اس ضمن میں کمشن بنایا جس کی رپورٹ 1985 میں جاری کی گئی اس میں ''کم از کم دس لاکھ اموات'' کو مانا گیا ہے (۱۲) اسی طرح 1994 میں روانڈا میں ہوتو قبیلے نے آٹھ لاکھ تتسیوں کو صرف ایک موسم گرما میں ہلاک کر دیا اور انہیں کاکروچ (لال بیگ) کی موت قرار دیا اور اس قتل کی ریڈیو نشریات میں حوصلہ افزائی کی گئی۔ (۱۳)

ریمنڈ ارون نے 1954 میں ''بھرپور جنگ کی صدی (۱۴) نامی کتاب لکھی حالانکہ اس وقت تک قتل و غارت کے مندرجہ واقعات نہیں ہوئے تھے اس لیے وہ ان کے بارے میں کچھ نہ لکھ سکا۔ الجزائر کی جنگ آزادی، انڈونیشیا میں کمیونزم کے خلاف جنگ، مشرقی تیمر میں بہیمانہ مظالم، جنگ ویت نام، مشرقی پاکستان، کمبوڈیا، اور ریوانڈا میں نسل کشی، صومالیہ، سوڈان اور حبشہ کی جنگیں، ایران عراق کی آٹھ سالہ طویل جنگ، افغانستان میں بیس سالہ کشمکش، کشمیر میں دس سالہ بغاوت، فلسطین میں وقفے وقفے میں ہونے والے تشدد کے دورے امریکی فوجی سربراہی میں عراقی فوجیوں کی شکست، یوگوسلاویہ اور سربیا میں نسل کشی کے واقعات اور علیحدگی اور پھر گزشتہ پچاس برسوں میں ان کے علاوہ سینکڑوں جھڑپیں اور جنگیں اور خونیں واقعات ہوئے جو چھوٹے موٹے نہ تھے بلکہ بڑے واقعات تھے۔ تاہم صرف اس حوالے سے ہی اردن کی کتاب میں بیسویں صدی کی نقشہ کشی ہی کمزور نہیں اس نے نادانستہ طور پر اور بھی غلطیاں کیں۔ مثلاً اس نے کہا کہ جنگ ہی دراصل کسی تشدد کی مصدقہ، قابل دید اور ڈرامائی صورت ہوتی ہے۔ اردن نے سوویت روس کے معاشی معرکوں اور سٹالن کی دنیا کو فتح کرنے کی خواہش (۱۶) کو زیادہ جگہ دی جبکہ اس نے یوکرین کے ان لاکھوں باشندوں اور، شمالی کاکیشیا اور زیریں والگا کے لوگوں کا ذکر نہیں کیا جو اشتراکیت کے دشمن سمجھے جاتے تھے اور جنہیں بھوکے رکھ کر مارا گیا۔ (۱۶) ارون کے اس رویے کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ اگر ارون دو دہائی بعد یہ کتاب لکھتا تو ان تین کروڑ چینیوں کی موت کو بھی گول کر جاتا جو کمیونسٹ پارٹی کی زیادہ مزدور استعمال کرنے اور نسل کشی کی پالیسی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ یہ لوگ آگے کی طرف بڑی چھلانگ کے نعرے کے تحت جلد

از جلد صنعتی ترقی کرنے کی راہ میں مارے گئے۔ یہ الگ بات کہ چین سے باہر کسی نے ان معاملات میں کم ہی دلچسپی لی۔

میں نے بیسویں صدی کے حوالے سے 'مکمل تشدد' کی اصطلاح استعمال کی تھی اس حوالے سے دو غور طلب باتیں سامنے آئی ہیں۔ سیاسی اور معاشرتی تبصروں میں تشدد کو مخصوص روائتی شقوں تک محدود رکھا گیا جیسے جنگی تشدد، نسل کشی یا مسلح سیاسی بغاوت۔ یا پھر ایک دوسری معاشرتی سطح پر۔ وہ تشدد جو شادی شدہ فریق یعنی عورت یا بچوں پر کیا جاتا ہے یا جیسے کہ امریکہ میں ہوتا ہے کہ سکولوں میں کسی نے اندھا دھند گولی چلا دی اور بے شمار جانیں تلف ہو گئیں۔ میں نے ایک دوسرے پہلو کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے اور اس نکتہ پر آگے بھی بات کرتا رہوں گا وہ یہ ہے کہ بعض بڑے فائدہ مند فکر و عمل مثلاً ترقیات کی جڑیں بھی تشدد کے تصور اور عملی صورت میں پہنچی ہوئی ہیں۔ قوم پرست حکومتوں نے ترقی کے نام پر لاکھوں مجبور لوگوں کی قربانی دے دی۔ مثلاً اگر ڈیم بنانے کے لیے قبائلی لوگوں کو ان کی جگہ سے ہٹانا مقصود تھا تو ان کو بتایا گیا کہ یہ سب کچھ قومی مفاد کے لیے کیا جا رہا ہے۔ ان بیانات ہی سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ قحط پڑنے کی صورت میں بھی تشدد ہی صورت پذیر ہوا۔ امرتیا سین نے اس پر بڑا کام کیا جسے ابھی چیلنج نہیں کیا گیا امرتیا سین نے لکھا ہے کہ قحط ان لوگوں کی وجہ سے نہیں پڑتا جن کے پاس کھانے کے لیے کافی نہ تھا بلکہ ان لوگوں کی وجہ سے پڑتا ہے جن کے پاس کھانے کے لیے وافر تھا۔ قحط کا مسئلہ پیدا ہوا ان کی وجہ سے جو خوراک کے مالک تھے نہ کہ خوراک فراہم کرنے والوں کی وجہ سے۔ سین کی زبان میں کہ ایک شخص کی خوراک کی دستیابی کا مسئلہ اس کے معاشرتی تعلقات پر تھا اور تعلقات یہ حلقہ کسی کی شخصی زندگی بناتی ہے۔ (۱۸) اگرچہ سین کی کتابیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ قحط پڑنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وہاں انتظام یا حکومت کھلی جمہوری اصولوں پر عمل پیرا نہیں ہوتی۔ امرتیا سین نے قحط اور جمہوری حکومت میں ایک تعلق کو ثابت کیا۔ یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ استحقاق کے نظریہ میں بھی تشدد کی کوئی گنجائش نہیں جبکہ مالتھس قحط کو قدرتی آفات کہتا ہے۔ سین اسے معاشی تباہی قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ بہتر انتظام سے قحط کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ (۱۹) اب تشدد کی ایک صورت ان پابندیوں میں بھی نظر آتی ہے جو کسی ملک پر لگائی جاتی ہیں۔ مثلاً عراق کے خلاف دس سال تک جو پابندیاں لگائی گئیں ان کی وجہ سے دواؤں اور آلات جراحی کی شدید قلت پیدا ہوئی۔ ہر ماہ پانچ ہزار

بچے دواؤں کی کمی اور پیدائش کے وقت مناسب سہولتیں نہ ہونے کے باعث مرنے لگے۔ جب اتنی تعداد میں بچے مرنے لگے تب مسئلہ نے سنگین صورت اختیار کی اور توجہ طلب ہوا۔ بہر طور یہ حقیقت ہے کہ اس سے پہلے ان پابندیوں کے بارے میں یہ نہیں سوچا گیا ہوگا کہ یہ بھی تشدد کو جنم دیتی ہیں اور 1919 میں جب ورسیلز میں جرمنی کے خلاف معاشی پابندیاں لگائی گئی تھیں تو وڈرو ولسن نے کہا تھا کہ یہ پابندیاں ''پرامن خاموش اور مکمل علاج ہے اس طرح کسی طاقت کے استعمال کی ضرورت نہیں رہے گی اور یہ کوئی تکلیف دہ طریقہ علاج بھی نہیں (۲۱)

دوسری بات یہ کہ یقین کیا جاتا ہے کہ چیزوں کو فنا کرنے کی ٹیکنالوجی کی ترقی، نظر بندی یا مشقت کے کیمپوں اور خندقی طرز جنگ سے لے کر فضائی طاقت اور ایٹمی اسلحہ کی وجہ سے بیسویں صدی میں تشدد اور حیوانیت کی انتہا ہوگئی۔ یہ ان لوگوں کے لیے خاص طور پر وجہ تسلی ہے جو مستقبل کو بھی ٹیکنالوجی کا پابند دیکھتے ہیں جن کا خیال ہے کہ ٹیکنالوجی غیر جانبدارانہ شے ہے اور اسی حوالے سے یقین رکھتے ہیں کہ سوسائٹی کی برائیوں کو ٹیکنالوجی کے ذریعے ہی دور کیا جاسکتا ہے۔ ایک سیاسی نظریہ ساز نے لکھا ہے کہ شائد ہی کوئی قصہ کہانی ایسی ہو جس نے ٹیکنیکل تہذیب کے پوشیدہ پہلوؤں کے بارے میں اشارے کیے ہیں۔ اس میں جدید ٹیکنالوجی کو ترقی کے لیے صرف ایک ترقی یافتہ ہتھیار کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ (۲۲) ٹیکنالوجی کے بارے میں عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ ٹیکنالوجی کو انسانیت کی خدمت کے لیے اچھے مقاصد کی خاطر استعمال کیا جاسکتا ہے اور برے مقصد کے لیے بھی۔ کچھ لوگ زندگی کے ٹیکنیکل تصور میں زیادہ یقین رکھتے ہیں کہ ٹیکنالوجی کی کمی کو اس کے بہتر استعمال کے ذریعے دور کیا جاسکتا ہے۔ پھر ایسی مثالیں ہیں جب یہ کہا جاتا ہے کہ ٹیکنالوجی غلط ہاتھوں میں... یعنی کسی سر پھرے، گمراہ شخص یا بدمعاش ریاست کے ہاتھ لگ گئی ہے۔ علاج یہ ہے کہ اس کے استعمال کو محدود اور باقاعدہ کیا جائے اور اس کے پھیلاؤ پر بھی کچھ پابندیاں لگائی جائیں۔ سٹیلتھ فائٹرز (خفیہ یا پوشیدہ) اگر صحیح ہاتھوں میں ہوں تو وہ آزادی کی مشعلیں ہیں اور اگر کسی جنونی اور آمر کے ہاتھ لگ جائیں تو موت کے پیغامبر۔ اس اعتبار سے صرف ایک ملک کا یہ استحقاق ہے کہ وہ ایٹمی بم رکھے، اور اس کے پاس اس وقت کے کیمیکل اور بائیولاجیکل میدان میں دنیا کے بہترین ہتھیار ہوں اور پورے اعتماد سے دنیا میں کہتا پھرے کہ موت کے یہ ہولناک ہتھیار صرف مغرب

کی مہذب قوموں کے ہاتھوں میں ہوں تو پھر یہ دنیا کے پاسبان ہوں گے۔ دنیا کو پورے یقین کے ساتھ امریکہ اور اس کے اتحادیوں پر اعتماد کرنا چاہیے کہ وہ جو کریں گے عالم انسانیت کے مفاد میں کریں گے۔ تاہم ان ممالک کے رویے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان کو ضامن کے طور پر سنجیدگی سے تسلیم کیا جائے۔

موت کی جدید ٹیکنالوجی کی قابل دید نوعیت نے یہ بھی دیکھنے کی گنجائش نہیں چھوڑی کہ بیسویں صدی میں جو تشدد ہوا اس کا بنیادی اور لازمی تعلق تباہی کے حیران کن مؤثر ہتھیاروں کی ترقی سے کوئی نہیں۔ نازی جرمنی میں یہودیوں، خانہ بدوشوں اور ہم جنس پرستوں کے ہولوکاسٹ کے دوران کیمیاوی اور حیاتیاتی طریق حرب کے تجربے بھی کیے گئے مثلاً اس دوران گیس زائیکلون۔ بی (ہائیڈروجن سینائڈ) گیس بنائی گئی۔ تباہی کا یہ سارا سامان کچھ اس طرح کام میں لایا گیا کہ نوکر شاہی کو تشدد کی کارروائی تفویض کر دی گئی، جس نے بڑے جچے تلے انداز میں ہر قسم کی اخلاقی حدود کو توڑ دیا اور بہت بڑے پیمانے پر توڑا۔ مذہبی مفکر رچرڈ روبنسٹین نے اپنی مختصر مگر رونگٹے کھڑی کرنے والی تحریر میں ہولوکاسٹ پر یوں تبصرہ کیا ہے اور اس کا بہتر ابلاغ یوں کیا ہے کہ ''بیسویں صدی میں مغربی تہذیب کے بعض اہم رجحانات کا اظہار اس (ہولوکاسٹ) میں ہوا ہے۔'' (۲۳) ڈاچو یا آشوز کسی ایک جگہ قیدی کیمپوں کے کمانڈروں نے پہریداروں کو قیدیوں سے بات کرنے یا ان سے مس کرنے سے منع کر دیا تھا''۔ اسی طرح قیدیوں کو فرداً فرداً یک طرفہ طور پر سزا دینے کی بجائے گیس چیمبر استعمال کیے گئے تاکہ انسانی جانیں تلف کرنے میں زیادہ دیر نہ اور سارا کام ایک رکاوٹ کے بغیر تسلسل سے ہو اور اس میں ناموں اور ثقافتوں کا معاملہ بھی اخفا میں رہے۔ ماہر عمرانیات زیگمنٹ بومان نے یہودیوں کے قتل کو دیئے گئے امریکی رنگ (فورڈائزیشن) سے ذرا آگے بڑھ کر دیکھا اور کہا کہ ہولوکاسٹ جرمنوں کی مخصوص بیماری نہ تھی بلکہ عقل وخرد کے مرض کا تشخیصی اظہار تھا (۲۴) مگر جب ہم ہولوکاسٹ سے ہٹ کر روانڈا اور کمبوڈیا میں ہونے والے نسل کش فسادات کی طرف آتے ہیں یہاں آ کر کچھ باتیں واضح ہوتی ہیں کہ یہاں جو تشدد ہوا وہ کسی اعلیٰ درجے کی ٹیکنالوجی اور ایک پیچیدہ سرکاری نظام کے ساتھ جدیدیت اور مستعدی کے تصورات کا مرہون منت نہ تھا نہ ہی یہ چیزیں کسی قتل عام کے لیے لازمی ہیں۔ تو توؤں کی بہت بڑی تعداد کو کلہاڑیوں، بیلچوں اور خنجروں سے قتل کیا گیا۔ مارنے والوں نے سڑکیں بند کر دیں اور گروہوں کی شکل میں ان

کی آبادیوں پر حملہ کر دیا۔ کمبوڈیا میں نسل کشی کے لیے زیادہ منصوبہ بندی کی گئی، تشدد کے معمول کے طریقے استعمال ہوئے، پولیس کا انداز ستم بھی استعمال ہوا اور لوگوں کو بندوقوں کی باڑ پر رکھ کر بھی مارا گیا اور یوں ایک آبادی کو ختم کرنے کی کارروائی ہوئی۔

نوآبادیات کی آزادی

بیسویں صدی کی زیادہ تر سیاسی سرگرمی کا اظہار ایک لفظ قوم پرستی میں ہوا۔ تاہم بیسویں صدی کی انفرادیت معلوم کرنے کے لیے نوآبادیات کی آزادی زیادہ مؤثر اور توجہ طلب ہے۔ جدید سیاسی لٹریچر میں نوآبادیات کی آزادی کے سوال کی بجائے نیشنلزم (قوم پرستی) کو کیوں موضوع بنایا گیا۔ زیادہ تر لوگوں کی تربیت بھی قوم پرستی کے موضوع کے حوالے سے ہوئی۔ دلچسپ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا اور یہ سوال بھی بذات خود کم زیر بحث آیا۔ یورپی طاقتوں نے تیسری دنیا میں قوم پرستی دیکھی اور اسے اپنے مطلب کا رنگ دیا۔ حتیٰ کہ جب قوم پرستی کے کئی مظاہر کو غیر مستند، متعصبانہ یا بدقرار دیا گیا، یورپی طاقتیں پھر بھی انہیں اپنے رنگ میں ہی دیکھتیں۔ ان قوم پرست رجحانات کے علمبرداروں کو مغرب میں ایسے افراد سمجھا جاتا تھا جنہوں نے ملٹن مل اور مازینی کے اسباق سے فیض حاصل کر رکھا تھا اور وہ آزادی کی زبان میں بات کرتے تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ اپنے عمل میں لڑکھڑا جاتے یا مشرقی آمریت کے ماڈل اختیار کر لیتے۔ بہرطور قوم پرستی کی ٹھوس یا معیاری صورت قومی ریاست تھی اور جو کوئی نوآبادیات میں ایک قومی ریاست بنانے کے عمل میں مصروف تھا وہ دراصل یورپی طرز فکر کا ہی مرہون منت تھا۔ ہرچند قوم پرستی کو بھی یورپ کا فریب سمجھا جاتا اس کے باوجود یورپ والے قوم پرستوں کو یورپ کی سیاسی اور فکری میراث کے وارث سمجھتے ہوئے ان پر فخر بھی کرتے۔

دوسری طرف نوآبادیات کی آزادی ایک مختلف علمی حوالے کی طرف اشارہ کرتی کہ اس طرح علم کی ایسی سیاست ممکن ہو سکتی ہے جو نجات دہندہ بھی ہوا اور اختلاف کا اظہار بھی۔ انہیں خود جو تجربہ ہوا تھا وہ ان کے لیے اس نئی صورتِ حال کی تفہیم میں مددگار نہ تھا۔ وہ اس ساری کیفیت کو صرف اوپر اوپر سے دیکھتے اور سمجھتے تھے اور پریشان بھی تھے کہ اس طرح انہیں ایک عظمت سے محروم ہونا پڑا تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں جب بالاتر طاقتوں میں حریفانہ مقابلہ جاری ہوا، اور دوسری طرف جاپان صنعت و حرفت کے میدان میں مسلسل آگے بڑھ رہا تھا تو ان حالات میں اپنی نوآبادیوں سے محروم ہوتے ہی انہیں احساس ہوا

کہ وہ اب دنیا کی دو نمبر کی طاقتیں ہو گئی ہیں۔ اس سے کوئی پچاس برس پہلے کرزن اور چرچل کو یقین تھا کہ ہندوستان سے محروم ہونے کے بعد عظیم برطانیہ بڑی عالمی طاقت نہیں رہے گا۔ جہاں تک نیشنلزم (قوم پرستی) کا تعلق ہے اس حوالے سے نو آبادیات کی آزادی فکر کی نئی شق کے طور پر نامکمل سی رہی۔ جن نو آبادیات میں سفید فام آباد تھے یا آباد کار تھے انہیں آہستہ آہستہ ڈومینین کا درجہ دیا گیا۔ اس عبوری انتظام کو نو آبادیات کی آزادی سے جوڑنا ٹھیک نہیں کیونکہ واضح بات تھی کہ ان کے برطانیہ سے خاص تعلقات رہیں گے۔ امریکی نو آبادیات کی مادر ملک سے علیحدگی کو بھی نو آبادیات کی آزادی کے زمرے میں نہیں ڈالا جا سکتا کیونکہ وہ برطانیہ سے الگ ہو کر خود جابر قوتیں بن گئی تھیں۔ اور ان کا خیال تھا کہ انہوں نے آزادی حاصل کی ہے۔ انہیں آزادی دی نہیں گئی۔ علیحدگی کے بعد بھی امریکہ کی فکری زندگی میں برطانیہ ہی کو ثقافت اور دانش کا سرچشمہ سمجھا گیا۔ مگر تب سے لے کر اب تک سیاستدانوں کی طرح یہ بات کرنا بالکل بجا ہے کہ اب بھی امریکہ اور برطانیہ میں خاص قسم کے تعلقات قائم ہیں۔

جہاں تک غیر سفید فام نو آبادیات کا تعلق ہے اور جو یورپی تسلط میں تھیں ان کی آزادی کے بارے میں کوئی قابل ذکر سیاسی یا سماجی غور و فکر کا نہ ہونا ایک اور پیچیدہ مسئلہ ہے۔ دیکھنے والی بات یہ ہے کہ جدید سیاسی لٹریچر میں نو آبادیات کی آزادی کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے حالانکہ یہ عمل دوسری جنگ عظیم کے بعد شروع ہوا اور اس کی طرح زیادہ توجہ طلب تھا۔ یعنی یہ ایک تضاد ہے۔ انیسوی صدی کے وسط میں برطانیہ کے اہم مقبوضات تھے۔ ہندوستان، آسٹریلیا، کینیڈا اور کیپ پراونس۔ پچاس سال بعد جنگ عظیم کے شروع میں ایک چوتھائی دنیا پر یونین جیک پر لہرا رہا تھا۔ پھر افریقہ کی کارروائی جسے عموماً افریقی چال (۲۶) کہا جاتا ہے' ہوئی تو مصر، سوڈان، کینیا، یوگنڈا، نائیجیریا، رہوڈیشیا، جنوبی افریقہ، گولڈ کوسٹ، سیرالیون اور دوسرے علاقے بھی برطانوی سلطنت کا حصہ بن گئے۔ اس کے علاوہ جنوبی مشرقی ایشیا میں سنگاپور سے ملایا تک اور کیریبئین میں ترنیڈاڈ اور ٹوبیگو پر بھی برطانوی راج تھا (۲۷) پوری انیسوی صدی میں برطانیہ کی سلطنت میں ہر سال ایک لاکھ مربع میل کا اضافہ ہوتا رہا (۲۸) تاہم برطانوی سلطنت کا یہ ایک پہلو ہے جبکہ دوسری یورپی طاقتوں کی حسب حال الگ الگ سلطنتیں تھیں۔ برطانیہ کی ایک سلطنت اور بھی تھی یعنی غیر سرکاری سلطنت اور وہ یہ کہ چین اور لاطینی امریکہ کے ممالک میں اس کا

بہت اثر و رسوخ تھا۔ تاہم یورپی دنیا پر یورپی طاقتیں دو باتیں کہتی رہیں کہ وہ مقامی باشندوں کو مہذب بنا رہی ہیں اور وہ سارے عالم انسانیت کو ترقی کی راہ پر ڈال رہی ہیں۔ دوسری بڑی سامراجی طاقت فرانس تھا جس کے قبضے میں شمالی افریقہ، وسطی افریقہ کا بڑا علاقہ، ہند چینی اور دنیا کے مختلف کونوں میں واقع چھوٹے چھوٹے علاقے تھے۔ اس کے زیر اثر اور بھی علاقے تھے۔ سلطنت بننے کی چاہ میں بعد میں آنے والوں میں مثلاً جرمنی وغیرہ کے ہاتھ جو آیا اسی پر قبضہ کر لیا۔ جرمنی نے جنوب مغربی افریقہ، کیمبرون، اور آج کے تنزانیہ پر قبضہ کیا۔ پھر جس کی جتنی کم نو آبادیاتی سلطنت تھی اس کا فاشزم اتنا ہی بڑا تھا۔ جاپان کو یہ مایوسی تھی کہ اس کی نو آبادیات ایشیا سے آگے نہیں اور ایشیا میں جہاں جہاں وہ پہنچ سکتا ہے وہ کوئی ایسے تسلی بخش علاقے بھی نہیں تاہم وہ علاقے اگر اس کی بالادستی کے نیچے آ جائیں تو بھی ٹھیک مگر اصل سلطنت اپنے براعظم سے باہر کی شمار ہوتی ہے۔ جیسے انڈونیشیا میں ہالینڈ، کانگو میں بیلجیئن اور ہسپانیہ اور پرتگال والوں کے مقبوضات، ابے سینیا پر اٹلی کا قبضہ، فلپائن اور پورٹو ریکو پر امریکی قبضہ غرضیکہ اس قسم کے دوسرے مناظر جو سب مل کر ایک خاص انداز کی تصویر بناتے ہیں۔

نو آبادیات پر مشتمل سلطنت بنانے کا منصوبہ تو لمبے عرصے کے لیے تھا خاص طور پر ہندوستان کے بارے میں مگر یورپی طاقتیں بیس سال جیسے مختصر سے عرصے میں ان نو آبادیات سے ہاتھ اٹھانے پر مجبور ہو گئیں۔ اس پر ایک چھلتی نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اشارہ بڑی تصویر کی طرف ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے دو سال کے اندر برصغیر ہندوستان برطانوی حکمرانی سے آزاد ہو گیا مگر ہندوستان سے برطانیہ کی روانگی ہوئی تو ایک دوسرا ملک پاکستان بھی برصغیر میں بنا دیا گیا۔ فلپائن نے 1946 میں امریکہ سے رہائی پائی۔ ولندیزیوں کو زبردستی انڈونیشیا سے نکالا گیا، فلسطین کو چھوڑ دیا گیا۔ سامراجیوں کی واپسی میں ان کی ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ تنازعے کی بنا پر علاقے تقسیم کرتے جاتے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سامراجی جو علاقے چھوڑ گئے ان میں اب موجود متقابل نظریات کی ہم مخالفت کرتے ہیں اور نہ ہی اس سے انکاری ہیں کہ مقامی سیاسی قوت نے بھی سامراجیوں کو واپسی کی پالیسی وضع کرنے پر مجبور کیا۔ 1959 اور 1965 کے دوران برطانیہ کی متعدد نو آبادیات نے آزادی حاصل کر لی۔ کیمرون 1960، سیرالیون 1961، یوگنڈا 1962، کینیا 1963، ٹانگانیکہ 1961، یہ 1963 میں زنجبار میں مدغم ہوا

تھا۔ نام تنزانیہ رکھا گیا۔ زمبیا سابقہ شمالی رہوڈیشیا 1964 گیمبیا 1965 وغیرہ وغیرہ۔ یہ ساری کارروائی ہر بار کوئی ایسی صاف شفاف بھی نہیں ہوتی تھی کہ نئے ملکوں کی نئی حد بندی کی گئی۔ ماضی کے واحد ملک کو توڑ کر ٹکڑے کر دیے گئے اور بعض اوقات الگ الگ ملکوں کو ایک دوسرے میں مدغم کر کے واحد ملک بنایا گیا۔ کیمرون کی قومی ریاست میں دو الگ الگ علاقے شامل کیے گئے۔ ان میں سے ایک فرانس اور دوسرا برطانیہ کے قبضے میں تھا مگر برطانیہ کے زیر انتداب کیمرون کا شمالی حصہ نائیجیریا میں ملا دیا گیا اور یہ 1960 میں آزاد ہوا برطانوی صومالی لینڈ، میں مدغم ہو کر صومالیہ بنا اور ایشیا میں مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں دو ہزار میل کا ہندوستانی رقبہ حائل تھا۔

سیاسی اعتبار سے نو آبادیات کی آزادی کا رعایا کو خاصا احساس تھا جس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ سامراجی طاقت کا جھنڈا اتار کر اس کی جگہ قومی ریاست کا جھنڈا لہرایا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی قوم پرستانہ اظہار زور دار تالیوں اور نعروں میں ہو رہا ہے۔ یہ قوم پرستانہ انداز بھی اقوام متحدہ ایسے اداروں میں واضح طور پر نظر آتے ہیں جہاں تمام ریاستوں کو خواہ بڑی یا چھوٹی، طاقت ور یا کمزور، آئینی بادشاہی والی یا واحد پارٹی والی۔ ایک ایک ووٹ کا حق حاصل ہے۔ تاہم نو آبادیات کی آزادی کے تصور میں برابری یا برابر نمائندگی کا اصول بھی تھا مگر اس کے پر شروع میں ہی کاٹ دیے گئے۔ تب سے نہ صرف بڑی طاقتوں کی خارجہ پالیسی میں بلکہ اقوام متحدہ میں بھی بڑی بے دردی سے اس کا انحطاط کیا گیا۔ (۲۹) ایک طرف سلامتی کونسل بنا کر برابری کے اصول کی نفی کر دی گئی دوسری طرف اقوام متحدہ کی حالیہ سرگرمیوں سے ثابت ہوا کہ اب ایک دوسری طرح کا نو آبادیاتی عمل شروع ہو گیا ہے۔ سلامتی کونسل کے مستقل ممبران کو لامحدود اختیارات حاصل تھے۔ مثلاً یہ قانون ہے کہ جس کے ذریعے مستقل ارکان دس عارضی ارکان کے ساتھ کسی بھی ناپسندیدہ حکومت کے خلاف تادیبی پابندیاں لگا سکتے ہیں۔ چنانچہ عدم مساوات کا یہ اصول بین الاقوامی سیاست کا ناقابل شکست پہلو بن گیا ہے۔ خصوصاً اس وقت جب پانچ مستقل ارکان کو کونسل کی کارروائی کو ویٹو کرنے کا بھی حق دے دیا گیا ہے۔ اگر چین کو تبت پر حملہ کرنے کی وہی قیمت ادا کرنا پڑتی جو عراق کو کویت پر حملہ کرنے کے لیے ادا کرنا پڑی تو پھر سیکورٹی کونسل کے بارے میں ایک اچھا تاثر قائم ہو سکتا تھا۔ دوسری طرف جنرل اسمبلی کو مرحلہ بہ مرحلہ اختیارات سے محروم کیا جا رہا ہے مزید یہ کہ اس کی منظور کردہ قراردادوں پر

عمل لازمی نہیں بلکہ ان سے صرف ایک طرح کی بازگشت یا یاددہانی مراد لی جاتی ہے۔ اقوام متحدہ میں یہ قول متناقص مجسم ہے کہ اس میں بیک وقت نوآبادیات کے خاتمے اور نئی نوآبادیات کی اجازت کے اصول شامل ہیں۔

رسمی یا سرکاری طور پر نوآبادیات کی سیاسی آزادی کے اس پس منظر میں دیکھیں تو موجودہ سیاسی لٹریچر میں سے نوآبادیات کی آزادی کے بارے میں لٹریچر کا نہ ہونا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ قوم پرستی کے پس پردہ ایک قیاسی قسم کی قومی ریاست کا تصور ہوتا ہے۔ ہر نوآبادی میں آزادی کے علمبردار دراصل قومی ریاست کی حکمرانی کے جذبے سے سرشار ہوتے ہیں۔ بعض قوم پرستوں کا معاملہ استثنائی ہے جیسے ہندوستان میں گاندھی اور ٹیگور اور مارٹینق اور الجزائر میں شائد فینن کا ورنہ ہر قوم پرست یہ سمجھتا ہے کہ عہد جدید میں صرف قومی ریاست ہی ایک مسلمہ اور قابل عمل صورت ہے۔ ان کا خیال ہے کہ قومی ریاست کے اہم عناصر میں ایک مشترکہ زبان، مشترکہ تاریخ، ایک قومی کلچر، ایک قومی جھنڈا، ترانہ اور سکہ زر (کرنسی) سبھی لوگوں کو متحد کرنے کے لیے یہی چیزیں درکار ہیں۔ ان کی نظر میں یورپی ملکوں کا مضبوط پہلو یہ تھا کہ ان میں لوگوں کو متحد کرنے کی صلاحیت تھی۔ اور اگر یہ اتحاد قائم کرنے کے لیے تشدد بھی کرنا پڑے تو ٹھیک مثلاً ایک زبان کے نفاذ کے لیے تشدد... یہ ہمیشہ ایک خونیں صورت اختیار کرتا ہے اور اکثر یہ نہیں سوچا جاتا کہ انیسویں صدی کے آخر تک سارے فرانسیسی تو فرانسیسی زبان نہیں بولتے تھے یعنی فرانسیسیوں کی مشترکہ زبان فرانسیسی نہیں تھی چنانچہ اہل فرانس آج کی جدید دنیا میں ایک متحدہ اور باعزت سیاسی مقام حاصل کرنے کی خاطر لسانی تشدد کی صورت میں لازمی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ پھر یہ سمجھ لینا کہ قومی ریاست بن گئی تو سیاسی خواہش پوری ہو جائے گی غیر شعوری طور پر خود کو دوبارہ نوآبادیاتی جال میں پھنسانے کے مترادف تھی۔

یورپی ملکوں کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو نوآبادیات کی آزادی کی زبان نے دو بڑے مسائل پیدا کیے۔ پہلے یہ کہ وہ سمجھتے ہیں کہ قوم پرستی کا تصور اور وجدان کا تخلیق کردہ ہے مگر صحیح قسم کی آزادی ہوتی تو پھر اس میں قومی ریاست کا ماڈل ہی مسترد کر دیا جاتا اور کچھ نہیں تو غیر ملکیوں سے نفرت، اپنی بیمار انفرادیت اور تشدد ختم کر دیا جاتا۔ یعنی اگر قومی ریاست سیاست کا لازمی مقدر تھی تو پھر یہ پہلو ضرور ابھرنے چاہئیں تھے۔ مگر یہ سب کچھ ناممکن بلکہ ناقابل تصور سمجھا گیا۔ اس لیے کہ قومی ریاست کو تمام جائز سیاسی خوابوں اور خواہشوں کا

خزانہ سمجھ لیا گیا۔ مزید یہ کہ اسے انسانی تاریخ کا منطقی نتیجہ بھی جانا گیا۔ فرانسیسی انقلاب کے ایک نامور مؤرخ کے بقول فرانسیسی انقلاب کا صرف ایک ہی مقصد تھا کہ قوم کو ایسے متحد اور یکتا کر دیا جائے کہ یہ ناقابل تقسیم بن جائے (۳۱) ایک اور مثال دیکھیں انگریزوں کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے ہندوستان میں سینکڑوں ریاستوں اور مختلف مذاہب مختلف نسلوں، مختلف زبانیں بولنے والوں کو جو ذات پات اور دوسرے مقامی تعصبات کا بھی شکار تھے متحد کر دیا اور ان کی شناخت ہندوستان بنا دیا، انگریز اسے اپنی بڑی فتح سمجھتے اور یہ کہ اس قسم کی شناخت والا ملک قومی ریاست کی صورت میں ہی رہ سکتا ہے اور پھر قومی ریاست کی حیثیت سے لازم ہے کہ اس کے اداراتی خدوخال یہ ہوں کہ اس کی قومی زبان ہو، نمائندہ جمہوریت ہو اور یہ دو عوامل ہی اسے پائیدار بنا کر قوموں کی صف میں ایک اچھا مقام دلا سکتے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ نوآبادیات کو آزاد کرنے کا خیال یورپی طاقتوں کو پسند نہیں آیا اور پھر اس سے ایک ناگوار پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ یورپی طاقتیں (اندرونی طور پر) خود کو بھی آزاد کریں۔ یورپ نے دنیا بھر کو نوآبادیات بنانے سے پہلے اپنے آپ کو نوآبادیات بنایا اور ہزاروں ڈھنگ سے ایسا کیا یعنی خود کو قید کیا (۳۲) مگر شائد ہی اس بات کو تسلیم کیا گیا ہو اور یہ حقیقت تو ہرگز نہیں تسلیم کی گئی کہ انہوں نے اپنی اقلیتوں اور اسی زمرے کے دوسرے افراد پر ظلم و ستم کیا۔ اس زمانے میں یورپ کے ہر ملک کے سیاسی سماجی اور مذہبی اداروں پر معاشرے کے موقر مردوں کا غلبہ تھا اور اشرافیہ کے ملازم کسان نچلے طبقے کے لوگ، خانہ بدوش مذہبی اقلیتیں اور عورتیں سبھی غلامانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ اب بحری جہاز رانی کے ذریعے سے یورپ پر ایک نئی دنیا کا باب وا ہو چکا تھا، سیاح، تاجر، فاتحین اور ہوس زدہ غلام ان نئی سرزمینوں میں قسمت آزمائی کر رہے تھے چنانچہ یورپی طاقتوں نے اپنے مذہبی مخالفین، سیاسی باغیوں اور عام مجرموں کو ان علاقوں میں بھیجنا شروع کیا سزا کے طور پر۔ پھر انہیں دوسری کالونیوں میں بھیجتے رہے۔ یہ سچ ہے کہ غریب اور ایسے ہی دوسرے طبقوں کو یورپ سے باہر قسمت آزمائی کا موقع مل گیا اور ہندوستان ایسی نوآبادیات میں نچلے طبقے کے چھوٹے انگریز ان ہزاروں مقامی ماتحتوں پر حکومت کرنے لگے۔ ایسے بہت سے قصے ہندوستان میں مشہور ہیں۔ بہر طور اس وقت مخالف آواز کو دبانے کا یہی ایک آدھ طریقہ تھا جبکہ جدید علمی تحقیق نے ہمیں ان طریقوں کا حامی بنایا ہے

جن کو اختیار کر کے ایک جدید ریاست غلبہ حاصل کرتی اور رعایا کو راہِ راست پر لاتی ہے۔ یہ رعایا شہری بننے سے پہلے مزدور مزارعے قسم کی چیز تھے انہیں شہری اس وقت بنایا گیا جب انہوں نے ریاستی ادب و آداب کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیا۔ مثال یہ کہ 1991 کے شروع میں امریکہ میں عراق پر حملہ کرنے کے بارے میں جتنے پول ہوئے ان میں نوے فی صد امریکیوں نے کہا کہ عراق پر حملہ کیا جانا چاہیے مگر اس وقت پچاس فی صد امریکیوں کو یہ پتہ نہیں تھا کہ عراق ہے کہاں بلکہ انہیں یہ بھی علم نہیں تھا کہ جدید مشرق وسطیٰ میں کون کون سے علاقے ہیں۔ اسی سے اندازہ لگائیں کہ جدید ریاست کس طور اپنی رعایا کو غلام بناتی ہے۔ (۳۴) مثلاً انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے شروع میں ذرائع ابلاغ میں سے اخبار اور ریڈیو آئے تو یورپی طاقتوں نے ان سے کام لینے کا آغاز کیا چنانچہ وہ ذرائع ابلاغ کے حوالے سے اپنی رعایا کو اپنے توسیعی یا سامراجی مقاصد کے ہم نوا بنانے میں بڑی کامیاب ہوئیں۔

نو آبادیات کی آزادی کا تصور ہی یورپ کے لیے غیر دلکش تھا کیونکہ اس کے حوالے سے مغرب کی دانش و بینش اور بصیرت کی ساری تاریخ تلپٹ ہوتی تھی۔ مغرب والے اپنے بارے میں جو قیاس کرتے ہیں، اس کے مطابق ان کا دعویٰ ہے کہ یورپ اور امریکہ نے نشاۃ الثانیہ کے زمانے سے کھلی تلاش اور جستجو کا جذبہ' فکر کی سطح پر مقابلہ اور اختلاف رائے والے معاملات کے بارے میں رواداری کا طریق اپنا رکھا ہے۔ وہ تو نشاۃ الثانیہ سے بھی پیچھے یونانی عہد تک چلے جاتے ہیں کہ یہ اوصاف ان میں اس وقت سے چلے آتے ہیں۔ ان کی دلیل سائنس کے بارے میں یہ ہے کہ یہ خیال اس مفروضے پر مبنی ہے کہ ایک شے کے بارے میں بہت سے خیالات اور نظریات پیش کیے جاسکتے ہیں مگر جب تصدیق کیے جانے کی منزل آئے گی اس وقت جس نظریے یا عمل کی تصدیق ہوگی وہی فاتح قرار پائے گا۔ اس کے برعکس بے شمار محققین کی تحقیق سے یہ بات سامنے آ رہی ہے کہ مغرب کے علم و عرفان اور مختلف نصابی علوم پر جن فکری ڈھانچوں کا غلبہ ہے وہ غیر معمولی حد تک ہم جنس یا متجانس ہیں یعنی ان میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔

یہاں نیوٹن اور گوئٹے کی مثالیں کارآمد ہیں۔ نیوٹن کے کام کا بڑا حصہ الکیمیا کے شعبے میں ہے جس سائنسی قوانین کی دریافت کا اس کے سر سہرا ہے وہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے اور ان کی دریافت کے بہت دیر بعد تک نیوٹن کی ساری دلچسپی اور مصروفیت الکیمیا میں

ہی رہی۔ اس کا خیال تھا کہ اس شعبہ میں بڑے روشن امکان ہیں۔ نیوٹن کی سائنسی دلچسپی کا یہ حصہ اور اس کی تاریخ ہمیشہ زیادہ تر اخفا میں رہے گی اور نیوٹن اور دوسرے سائنس دان اس بعد والے تحقیقی کام (الکیمیا) کو سائنس کے لیے باعث خفت سمجھتے رہیں گے۔ (۳۶) مغربی انسان دوستی کے ایک عظیم نمائندہ گوئٹے نے ایک اور بڑی دریافت کی وہ نباتات ارضیات اور حیوانیات کے علوم کا اچھا طالب علم تھا۔ اس نے رنگوں، روشنی، پودوں جانوروں، فوسلز چٹانوں اور موسم وغیرہ کے بارے میں بڑا کام کیا اور بڑا کام چھوڑا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے موضوعات پر اس نے سائنسی کام کیا۔ خود گوئٹے کو یہ امید تھی کہ ایک دن اس کے ادبی کام کی بجائے اس کے سائنسی کام کو انسانیت کی خدمت کے سلسلے میں بہت بڑا کارنامہ تسلیم کیا جائے گا۔ (۳۷) لیکن ان سائنسی علوم میں نمایاں بیکن' نیوٹن اور ڈیسکارٹس کو بلیک وغیرہ نے تمسخر سے اڑا دیا اور پھر سائنس دان گوئٹے کسی کو یاد بھی نہ رہا۔ گوئٹے نے کہا تھا کہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے کہ وہ صداقت دریافت کرنے کا ایک ایسا طریقہ وضع کرے جس میں قدرت کی صرف چیر پھاڑ کر کے مخصوص نتائج ہی نہ حاصل کیے جائیں بلکہ فطرت کو زندہ اور مصروف کار دکھایا جائے اپنے کسی ایک حصے یا عضو کی بجائے اپنے پورے وجود میں تمام اعضا اور حصوں میں بیک وقت مصروف کار (۳۸)۔ گوئٹے کی اس بات سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ سائنس دانوں نے اسے کیوں معاف نہیں کیا۔ جدید سائنس دان چیر پھاڑ کا غلام ہے۔ یہی اس کا جوہر ہے اور تاریخی اعتبار سے اسے دیکھیں تو چیر پھاڑ کے طریق کو اس بات سے تقویت ملی کہ انسان بجا طور پر فطرت پر فرمانروائی کا حقدار ہے (۳۹) گوئٹے ایسی سائنس کے ڈھانچے سے ہی انکاری تھا۔

میرا ہرگز یہ ارادہ نہیں کہ میں یہ کہوں کہ الکیمیا اور جدید سائنسی علوم ایک ہی شے ہیں یا ایک جیسے ہیں یا یہ کہ ہمیں الکیمیا کا دوبارہ اختیار کرنا چاہیے یا یہ کہ الکیمیا میں بڑے امکان پوشیدہ ہیں یعنی ایک شعبہ علم کی حیثیت سے یا زندگی کو طول دینے کے لیے۔ نہ ہی میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ گوئٹے کا سارا سائنسی کام کارآمد ہوسکتا ہے اور اس کے احیا کی ضرورت ہے۔ سائنس کے بارے میں ایک انتہا پسند نظریہ ہے کہ کوئی ایسی شے نہیں ہے جسے مکمل طور پر سائنس کا نام دیا جا سکے یا یہ کہ سائنس کے بارے میں معاملہ زیادہ سائنٹیفک نہیں ہے۔ اس کی اہمیت اتنی ہی ہے جیسا کہ ہم مانتے ہیں کہ سائنس کی بہت سی قسمیں ہیں اور یہ کہ

جدید سائنس کسی بھی ایسی سائنس کو مسترد کر دیتی ہے جو اپنا اظہار سائنسی محاورے میں نہیں کرتی۔ سائنس کے مؤرخ اور اہل کار اس خوبصورت کہانی کو جاری رکھنے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ کس طرح جدید سائنس اپنی صلاحیتوں کی بنا پر انتہائی بلندیوں تک پہنچ گئی ہے۔ اس نے کیسے کیسے حقائق اور آفاقی سچائیوں کی تصدیق کی۔ یہ سب ٹھیک مگر جدید سائنس کی چودھراہٹ بھی تشدد کی مرہون منت ہے۔ اپنی کامیابی کے لیے اس نے دوسرے سائنسی انداز کو اپنی راہ سے ہٹا دیا اور پھر اس میں غلام بنانے (نوآبادیات بنانے) کی تباہ کن حرص موجود ہے۔

ایک مثال: مغربی یا ایلوپیتھک دواؤں کی کامیابی دراصل کلینک ریسرچ اور ادویہ سازی کی ترقی کی مرہون ہے جس کی کامیابی کا اعلان ڈھول بجا بجا کر کیا جاتا ہے اور اس ضمن میں سب سے زیادہ سرگرم امریکن میڈیکل ایسوی ایشن (اے ایم اے) اور برطانیہ اور یورپ کی اسی قسم کی تنظیمیں ہیں (۴۰) اس صدی کے اوائل میں ہومیوپیتھی بھی اتنی ہی مقبول تھی جتنی ایلوپیتھی مگر امریکی اور برطانوی میڈیکل ایسوسی ایشنوں نے ہومیو پیتھ ڈاکٹروں کو مارکیٹ سے باہر کر دیا۔ کہا گیا کہ ہومیوپیتھک کی دوائیں مخصوص ماہرانہ انداز میں تیار نہیں کی جاتیں اور ہومیوپیتھی کا طریق کار بھی کبھی سائنٹیفک تحقیق پر مبنی نہیں رہا۔ غالباً انداز لگایا گیا تھا کہ ہومیوپیتھی کو دولت کمانے کی ایک بڑی مشین میں منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ متعدد میڈیکل سپیشلسٹوں، دوا ساز صنعتوں، کیمسٹوں اور ہسپتالوں نے بڑے زور کے ساتھ ہومیوپیتھی کی مخالفت کی۔ ایلوپیتھی کے حوالے سے کینسر کے بارے میں تحقیق کو ''مقدس مقصد'' قرار دے کر بہت بڑا فراڈ کیا جا رہا ہے اور اس پر اربوں اور سنکھوں ڈالر خرچ ہو چکے ہیں مگر یہ فراڈ ہومیوپیتھی کے طریق علاج میں نہیں ہو سکتا تھا۔ (۴۱)

ایلوپیتھی دنیائے ادویات کو غلام (نوآبادی) بنائے گی۔ نوآبادی کے ذکر سے اس کے ابتدائی معنوں کی طرف چلتے ہیں اور وہ تھے صرف غلبہ پانے کے لیے آگے نہ بڑھو بلکہ کایا ہی پلٹ کر رکھ دو اور اس کے (نوآبادی) متبادل جو بھی صورت (نظریہ) آئے، اس کو روک دو۔ 'ڈی کالونائزیشن یعنی مقبوضات کو آزاد کرنے کا مطلب ہے دو ایسی چیزوں یا تصورات کو جوڑ دو جو شائد ہی کبھی جوڑی گئی ہوں یہ بھی دراصل یہ بھی عہد جدید میں چیزوں کو خانوں میں تقسیم کرنے کی علت کا نتیجہ ہے اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قوموں کو نوآبادیاتی درجہ سے آزاد کرنے کے سیاسی کام کو علم کو نوآبادیاتی درجے سے آزاد کرنے کے فکری کام سے جوڑنے میں

ناکامی ہوئی ہے۔ جیسا کہ میں پہلے جسارت کر چکا ہوں کہ آزادی (ڈی کالونائزیشن) کے علمبردار بھی اس محاورہ میں بات کرنے سے ہچکچاتے ہیں اور اس کی جگہ قوم پرستی کی اصطلاحات میں بات کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نوآبادیاتی مرحلہ سے مکمل آزادی اسی صورت میں ممکن ہوسکتی ہے جب ہم اس عہد میں مسلم بالذات علوم کے علمی درجوں کو بھی سمندر میں غرق کر دیں۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں دنیا کے بہت سے غلام ملک آزاد ہوئے اور یورپی ملک اپنے گھروں کو لوٹنے پر مجبور ہوئے عین اسی زمانے میں یورپ کے علوم کے قلعے کو نوآزاد ممالک (سابق نوآبادیات) کے لوگوں کی طرف سے متفقہ حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔

انسانی حقوق

انسانی حقوق سے متعلق عام رائے ہے کہ ان کی جڑیں عہد حاضر کے سیاسی اور قانونی افکار میں ہیں اور بعض پہلوؤں سے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ بیسویں صدی کی اہم ترین یافتوں میں شمار ہوتی ہے۔ تمام معاشروں میں ایک خاص طبقے کے لوگوں کو روز ازل سے حقوق حاصل ہیں یا دوسری ذرا مختصر زبان میں یہ کہ انہیں وہ مراعات حاصل تھیں جو دوسروں کو حاصل نہ تھیں۔ ایک ملک میں دوسرے ملک کے سفیر کو ملکوں کے باہمی تعلقات کے حوالے سے خاص مراعات اور تحفظات حاصل ہوتے ہیں۔ اور یہ اس مسلمہ طریق کا حصہ ہیں۔ اسی طرح کچھ اور پیچیدہ اصول اور ضابطے بھی تھے جو دو ملکوں کے خرابی تعلقات یا جنگ کے دوران مانے جاتے تھے۔ ان پر واقعی عمل درآمد ہوتا تھا۔ مثلاً تمام شہریوں کو فوجیوں کی طرح یا فوجی مقاصد کے لیے یرغمال نہیں بنایا جاتا تھا۔ جب سپاہی ہتھیار ڈال دینے پر راضی ہوتا تو اس پر گولی نہیں چلائی جاتی۔ جو زخمی ہوتے انہیں مارنا ممنوع تھا وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے روائتی آداب یا ضابطے اب قانون کی شکل میں آگئے ہیں اور انہیں حقوق بنا دیا گیا ہے چنانچہ جب ایک فوجی قید کر لیا جاتا ہے تو یہ اس کا حق ہے کہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے اور اسے مناسب خوراک، لباس اور رہنے کی جگہ دی جائے۔ بعض ایسے حقوق ہیں جو ایک شہری حکومت/ریاست سے بچاؤ کے لیے طلب کرتا ہے۔ دوسری صورت میں یوں سمجھنا چاہیے کہ یہ حقوق ملک کے ایجنڈا پر پڑنے والے دباؤ سے نکلتے ہیں یعنی خود حکومت ہم آہنگی پیدا کرے اور مخالفانہ قول و عمل کو محدود کرے۔ فرد کو اور بھی بہت سے حقوق دیے گئے ہیں اور عہد حاضر میں سب سے منفرد بات یہ ہے کہ ان حقوق کو قانونی تحفظ بھی حاصل ہو گیا ہے۔

بیسویں صدی میں بالغ رائے شماری یعنی ووٹ دینے کا حق بہت سے ممالک میں رائج ہوا، اسی طرح انسانی حقوق بھی بہت سے مختلف طبقوں کے لوگوں کو ملنے لگے ہیں۔ عالمی سطح پر متعدد معاہدے ہوئے ہیں مثلاً جنیوا کنونشن، انٹرنیشنل کانوینیٹ آن سول اینڈ پولیٹیکل رائٹس، دی یونائیٹڈ نیشنز چارٹر اور یونیورسل ڈکلیریشن آف ہیومن رائٹس۔ان کے ذریعے حقوق کے معاملے میں ممالک کو پابند کردیا گیا ہے۔ یہ ہمارے زمانے کی بات ہے کہ بین الاقوامی برادری اس بات پر تیار ہے کہ جو ممالک ان حقوق کی خلاف ورزی کریں ان پر پابندیاں لگادی جائیں۔ اس موضوع پر مجھے کچھ اور بھی کہنا ہے جو بعد میں کہوں گا۔کمیونزم کے خاتمہ سے یہ مطلب لیا گیا کہ انسانی حقوق کے بڑے دشمنوں کو ختم کر دیا گیا ہے اور اب انسانی حقوق بذات خود ایک ہمہ گیر خود مختار شے کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ تو گویا کیا ہم جدید مغرب کے لبرل جمہوری نظام میں پروان چڑھنے والے انسانی حقوق کے کلچر کی غیر مشروط تصدیق کر دیں۔ بلاشبہ ختم تاریخ کے ساتھ ساتھ ایک نئے عالمی نظام کی نمو یعنی نیپال کے الفاظ میں ''ہماری آفاقی تہذیب'' (۴۲) لے کر آیا ہے؟ اس کے برعکس میرے نزدیک بہت سی مؤثر وجوہ ایسی ہیں کہ ہم یہ نہ مانیں کہ انسانی تعلقات میں ایک زبردست باب انسانی حقوق کے حوالے سے کھل گیا ہے۔ ہمیں انسانی حقوق کا معاملہ اس کی نظری یا آدرشی روشنی میں نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ اسے سیاسی عمل میں دیکھیں تو یہ مغربی امپیریلزم کی ایک بہت ہی گتھی اور مربوط شکل میں نظر آتا ہے۔ مغرب خصوصاً دوسری جنگ عظیم کے بعد کے حق کے علمبردار امریکہ کی تازہ فریب کاری ہے... امریکہ اس حوالے سے دنیا میں اپنے آپ کو تہذیب کے منتخب روزگار نمونہ کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہے اور انسانی اقدار میں صرف اس کا قول،قول فیصل ہے۔

آدمی کے حقوق کے بارے میں یورپی روایت کے مطابق آدمی اور شہری کے حقوق کے تصور کا فرانسیسی اعلان 1789 میں کیا گیا اور اسے نافذ کیا گیا۔ اس سے پہلے ''فطری حقوق اور'' فطری قوانین'' تھے جیفرسن نے 1776 میں آزادی کا اعلان کیا تو اس میں انسان کے ان ناقابل تنسیخ حقوق کا تذکرہ تھا جو خالق نے اسے ودیعت کر رکھے ہیں یہ ایک طرح کی پیش آگہی یا نیک شگون تھا۔ اس سے پہلے کے برطانوی امریکہ کے حقوق کے اختصار نامے میں 1774 میں دعویٰ کیا جا چکا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اس کے ہم وطن قانون فطرت سے حاصل کردہ حقوق کے حقدار ہیں اور یہ حقوق کسی چیف مجسٹریٹ کی

طرف سے تحفتاً نہیں ملے (۴۳) بہرطور آج کے انسانی حقوق کی تحریک یا پس منظر کو جاننے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے بارے میں جو دو تصور یا آرا ہیں ان کو الگ کر کے دیکھیں وہ دو تصور ہیں فرد اور قانون کی حکمرانی۔ مغرب کے جدید معاشرتی ماہر کو پڑھیں تو لازماً یہ بات سامنے آتی ہے کہ انفرادیت پسندی یورپی تاریخ کی ایک اہم خاصیت ہے۔ اسی طرح کم از کم نشاۃ الثانیہ کے زمانے سے یورپی افکار میں یہ بات جزو اعظم بنی ہوئی ہے کہ فرد ایک حقیقی یونٹ بالذات ہے، معاشرے کی تعمیر میں اینٹ پتھر جبکہ غیر مغربی ثقافتوں میں فرد نہیں بلکہ مذہبی، لسانی، نسلی، قبائلی گروپوں کی اجتماعی اور مشترک صورت کو مانا جاتا ہے چنانچہ 27 فروری 1909 کے شمارے میں دی اکانومسٹ نے بڑی واشگاف انداز میں لکھا۔ ''ہندوستان میں سیاسی صورت حال جیسی بھی ہے اور لوگ جو بھی ہیں وہاں مغربی جمہوری نظریے کے مطابق پرورش پانے والا موجود ہی نہیں بلکہ وہاں فرد کو نہیں ایک برادری یا گروہ کو شمار کیا جاتا ہے۔''

یورپ کے بڑے بڑے مبصرین اور ماہرین کی ایک فوج ظفر موج ہے جو سارے کے سارے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ یورپی معاشروں کی ترقی میں سب سے اہم عوامل ہیں نجی ملکیت کا احترام، بڑی بڑی جائدادوں کا نہ ہونا، خودمختاری پر زور اور سرد آب و ہوا جس سے فرد کو مصروف عمل رہنے میں مدد ملتی ہے۔ ان ماہرین میں شامل ہیں۔ میکس ویبر، ایرک جونز، رابرٹ کپلان، برنارڈ لیوی، ارنسٹ، گیلز، سیموئل ہنٹنگٹن، جیرڈ ڈائمنڈ مائیکل مان اور دوسرے جو تعصب کی حد تک تنگ یورپیت یعنی یورپ کی بالادستی پر مکمل ایمان رکھتے ہیں۔ مغرب میں فرد تن تنہا ہے اور اسے شاندار علیحدگی یا خلوت حاصل ہے۔ یعنی یہ تصور کہ فرد کو اکملیت ورثے میں ملی ہے۔ غیر مغربی معاشروں میں فرد کی کوئی حیثیت نہیں، ہمیشہ ایک اجتماع یا گروہ کا حصہ اور اسی گروہ کے حوالے سے اس کا وجود قائم ہے کبھی اپنے انفرادی وجود میں خود کو آزاد نہیں سمجھتا۔ جہاں ایک فرد کا کوئی وجود نہ ہو وہاں اس کے حقوق کے بارے میں کیا بات ہو سکتی ہے اور جہاں حقوق ہوں ہی نہیں وہاں ان کی حقوق سے محرومی یا حقوق کے خاتمے کا ذکر کیا معنی۔

مغربی نکتہ نظر سے اگر انسانی حقوق کے لیے شرط یہ ہے کہ فرد اپنی جگہ پر آزاد اور الگ اکائی ہو تو پھر یہی قانون اس حکمرانی یا حکومت کا بھی ہو گا جس کے تحت ان انسانی حقوق کو مکمل طور پر تسلیم کیا جاتا ہے ان کا احترام کیا جاتا۔ جو معاشرہ ایک خاص قانون کی

پابندی کرتا ہے تو اس معاشرے کی حکومت جو قانون بنائے گی وہ ایک خاص ضابطہ اور معیار کے مطابق ہی بنائے جائیں گے۔ مثلاً وہ غیر امتیازی ہوں گے۔ ان میں نسل، تذکیر و تانیث، طبقے اور لسانی پس منظر کا کوئی فرق نہیں رکھا جائے گا۔ بجز اس صورت کے کہ جب قانونی مساوات قائم کرنے کے لیے خاص گروپوں کو مخصوص مراعات دی جائیں یا بعض گروپوں کو ان فرائض سے مستثنیٰ قرار دیا جائے جو باقی سارے لوگوں پر لازم گردانے گئے ہیں۔ مثلاً مصدقہ امن پسندوں کو لازمی فوجی ملازمت سے استثنیٰ حاصل ہے۔ جو معاشرہ قانون کی حکمرانی کے مطابق چلایا جا رہا ہے وہاں قوانین لوگوں میں مشتہر کیے جاتے ہیں تاکہ کل کو کوئی شخص یہ نہ کہے کہ اسے تو اس قانون کا پتہ ہی نہیں۔ اسی طرح جس عدالتی نظام کے تحت ایک شخص کو کسی قانون کی خلاف ورزی کرنے پر سزا دی جاتی ہے، لازم ہے کہ وہ نظام بھی منصفانہ اور مساویانہ ہو۔

جہاں تک فرد کا معاملہ ہے، کہا جاتا ہے کہ قانون کی حکمرانی کا تصور بھی مغرب نے انسانی تہذیب کو دیا۔ اس کی بنیاد بھی دو دعووں پر ہے کہ نظریہ جمہوریت بھی مغرب نے دیا اور جمہوری ادارے بھی مغرب نے ہی دیے اور یہ کہ غیر مغربی دنیا میں حکومت کی صرف ایک ہی طرز یا قسم تھی اور وہ تھی آمریت کی۔ ارتقائی حیاتیات کے ماہر جیرڈ ڈائمنڈ کا کہنا ہے کہ یورپ کی ترقی کے جو فوری یا قریبی عوامل ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ یہاں مطلق العنان حاکم پیدا نہیں ہوئے اور تباہ کن ٹیکس نہیں لگائے گئے۔ (۴۴) مشرقی آمریت کا اصل جزو یہ تھا کہ قانون وہی کہلاتا جو آمر بناتا اور رعایا کے ہر فرد کی جان اور جسم آمر نے یرغمال بنا رکھی ہوتی ان کا وجود عدم وجود آمر کی رضا کا مرہون منت تھا۔ عام آدمی اس لیے زندہ تھے کہ اپنے آمر کی خوشیوں میں اضافہ کر سکیں (۴۵) ایسی مطلق العنان حکومت میں ”فرد“ صرف ایک ہوتا تھا یعنی آمر۔ اس کے ماتحت عوام کالانعام تھے۔ حد نظر تک اڑنے والی خاک کے ذرے تو۔ پھر ایسی حکمرانی میں کون سے حقوق اور کن حقوق کا تذکرہ؟

انسانی قوتوں کے حوالے سے مختصراً ہم نے دیکھا کہ فرد کا کیا تصور ہے اور قانون کی حکمرانی کیا شے ہے۔ اور ان کے باہم ہونے سے انسانی حقوق کا کیا تصور بنتا ہے۔ اب ہم آگے بڑھتے ہیں اور ادھیڑ اکھاڑ میں ہمارے سامنے کیسے پریشان کن پہلو آتے ہیں اور پھر اس تصور سے کیسی کیسی کھردری پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ جہاں کبھی مذہب آزادی کی زبان تھا وہاں قانون نجات کی زبان بن گیا ہے۔ روح کے محافظوں کو بے دخل تو نہیں کیا

گیا مگر آزادی کا مفہوم صرف چند ایک انفرادی یا ذاتی سوالات تک رہ گیا ہے یعنی فرد کے حقوق عدالتوں تک رسائی، وکیلوں کی خدمات وغیرہ وغیرہ حالانکہ آزادی اس بات کی مطلوب تھی کہ حالات کا فلسفیانہ اور اخلاقی جائزہ لیا جائے مباحث ان موضوعات پر ہوں۔ آج دنیا بھر میں انسانی حقوق کا ایک ہی مفہوم لیا جا رہا ہے اور وہ ہے اس کا قانونی پہلو۔ انسانی حقوق میں کوئی نئی طرح ڈالنے پر ایک معاہدہ کے تحت پابندی لگا دی گئی ہے جس کے دستخط کنندگان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس معاہدے کی پاسداری کریں یا دوسری قوموں کے ہاتھوں بدنامی اور رسوائی کو اپنا مقدر بنا لیں۔ پہلے بین الاقوامی معاہدوں کی تنسیخ کا منسوخ کرنے والے ملکوں پر کوئی قانونی اثر نہیں پڑتا تھا مگر اب جو ڈھانچہ بنایا گیا ہے اس میں ان معاہدوں سے علیحدگی فرض سے غفلت شمار ہوتی ہے اور اس کے قانونی نتائج بھگتنے پڑتے ہیں۔ کوئی بھی اس بات کے بارے میں کسی قسم کے شک میں مبتلا نہیں ہے کہ جب کوئی شخص سزا یافتہ مجرم کے حقوق کی بات کرتا ہے تو اس کا اخلاقی پہلو بھی فوراً سامنے آ جاتا ہے مثلاً جس نے جرم کیا اسے اس کے کم ترین استحقاق سے محروم نہیں کیا جا سکتا یا یہ کہ جس شخص کو موت کی سزا سنا دی گئی ہے اسے حق ہے کہ وہ روحانی راہبری یا ہدایات حاصل کرے۔ ان باتوں سے صاف عیاں ہے کہ اس اخلاقی پہلو کے پس پردہ بھی قانون کی طاقت ہی کام کر رہی ہے اور اگر یہ نہ ہو تو ہو سکتا ہے ہمارا جی کرے اور ہم اخلاقی پہلوؤں کو ایک طرف پھینک دیں۔ اگر انتہائی قابل نفرت مجرموں، عصمت دری کرنے والوں، بچوں سے زیادتی کرنے والوں اور منصوبہ بنا کر مسلسل قتل کرنے والوں کو یہ قانونی حق نہ ہوتا کہ انہیں جیل کے دوسرے قیدیوں اور وارڈنوں کی طرف سے نقصان دہ کارروائی سے بچایا جائے تو پھر یہ بات غیر یقینی ہے کہ انہیں صرف اخلاقیات کے فلسفے کی مدد سے بچایا جا سکتا تھا۔ قیدی عورتوں کا یہ حق ہے کہ انہیں جنسی طور پر پریشان نہ کیا جائے یا زنا کی دھمکی نہ دی جائے تو یہ حق بھی قانون کے جبر کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔

انسانی حقوق کے قانون کی شکل میں نفاذ سے بھی بعض مسائل پیدا ہوئے ہیں کیونکہ عملی دعوے یا مفروضہ یہ ہے کہ انسانی حقوق کا اظہار صرف ایک زبان میں ہو سکتا ہے۔ تیسری دنیا کے اکثر ممالک میں رسم و رواج ہی صدیوں تک قانون کے طور پر استعمال ہوتے رہے ہیں اور قانون کی حکمرانی کے بغیر بھی ایسی رسمیں، روائتیں تھیں جو ایک شخص کو پابند کر دیتی تھیں کہ وہ دوسرے کے حقوق کا احترام کرے مگر مغرب کی نادرہ کاری یعنی قانون کی حکمرانی کے علمبردار

یہ بات (یعنی روایات کے ذریعے احترامِ حقوق) ماننے کو تیار نہیں۔ قانون کی حکمرانی اور مفصل قانونی نظام کو عموماً انصاف کے ہم پلہ یا ہم معنی سمجھا جاتا ہے مگر یہ بات ان معاشروں میں سے بے معنی ہوگئی ہے جہاں معاشرتی، معاشی اور عدل گستری کے پیچیدہ تصورات رائج تھے۔ مثلاً ماقبل جدیدیت والے معاشروں میں مذہبی عبادات کی آزادی کو شاذ شاذ ہی مانا جاتا تھا۔ مگر آپ سیکولر جدید قومی ریاست میں یہ آزادی آئین کا حصہ بن گئی ہے لیکن کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا معقولیت ہے کہ ماقبل جدید معاشروں میں مذہبی آزادی کا وجود ہی نہ تھا۔ یورپ میں تو مذہبی جبر ایک خوفناک مرض بن گیا تھا مگر کس چابک دستی کے ساتھ (یورپ کا معاملہ بھلا کر) ہندوستان، افریقہ اور دوسرے ملکوں کی تاریخ کو مذہبی جبر سے مخصوص کیا جا رہا ہے اور کہا جا رہا ہے کہ وہ یورپ کی مثال سامنے رکھیں؟

ماضی میں ہندوستان میں سامی دشمنی کی کوئی مثال آج تک نہیں مل سکی تاہم جو شہادت موجود ہے اس کے مطابق یہودیوں کو دوسرے گروہوں یا برادریوں کی طرح برابر کے حقوق حاصل رہے (۴۶) لیکن ایک عالم فاضل کہ دنیا کی تاریخ سے اس کی لاعلمی قابل غور ہے، فرانسیسی انقلاب کے بعد یہودیوں کو دیے گئے حقوق کے حوالے سے کمال آسانی کے ساتھ کہتا ہے کہ دنیا میں کسی بھی جگہ حتیٰ کہ امریکہ میں بھی یہودیوں کو پورے شہری اور سیاسی حقوق حاصل نہ تھے۔ (۴۷) (یہ "حتیٰ کہ امریکہ" میں بھی نہیں، کیوں؟ امریکہ نے دنیا کے لیے کون سے معیار قائم کیے؟ کیا امریکہ کے آئین میں کالے آدمی کو خفیہ طریق سے ایک فرد کا تین بٹہ پانچ نہیں کر دیا گیا؟ (۴۸) آتش پرست ایران سے بھاگے اور ہندوستان میں پناہ لی اور یہ سرزمین ہندوستان ہے جس میں ہندومت، بدھ مت، جین مت اور سکھ مت نے جنم لیا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان مذہبی عبادات کے حوالے سے ہمیشہ جدت پسند یا آزاد رہا تاہم یہ بات بمشکل کہی جا سکتی ہے کہ یہاں مذہبی اختلاف کی بنا پر ایذا رسانی کبھی نہیں رہی۔ امریکہ اور یورپ میں جن دنوں مذہبی آزادی دی گئی، ہندوستان میں اس سے بہت پہلے معاشرہ میں مختلف مذاہب کی عبادات کی آزادی عام تھی۔ صرف ایک ہی ٹھوس توجیہہ قابل قبول ہے اور وہ یورپی تاریخ کا اپنا تجربہ ہے اور وہ یہ کہ یورپ میں ایک طویل عرصہ تک مذہبی رواداری نہ ہونے کے برابر تھی۔ انتہا پسندی عام تھی اس لیے وہاں پر مذہبی آزادی کا حق دینا ضروری تھا۔ مغرب میں انسانی حقوق کے علمبردار لوگ یہ بات ماننے کو تیار نہیں مگر حق یہ ہے کہ انسانی حقوق کے بارے میں موجودہ

زور شور مغرب کے ایک بنیادی رجحان کا آئینہ دار ہے۔ وہ یہ کہ وہ مختلف انسانی تجربات کو قانونی صورت دینے کے مشتاق ہیں اور اس قانونی معیار کو ہی عالمی معیار بنا کر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ دوسرے معاشرے اس معیار پر پورے نہیں اترے''۔ یہ دوسرے بات ہے کہ ان ملکوں اور معاشروں کا انسانی حقوق کے حوالے سے تجربہ یورپ کے مقابلے میں زیادہ بھرپور اور پرمایہ ہو۔

اس وقت جو ملک خاص طور پر انسانی حقوق کا سوال بڑے پرزور طریقے سے اٹھا رہے ہیں وہ کبھی اپنے حال پر غور کرنے کی اجازت کم ہی دیتے کہ اس طرح وہ اپنی تبلیغی پٹڑی سے اتر نہ جائیں۔ مگر قانون کی حکمرانی کے بارے میں ایک معیار نافذ کرنے میں تضادات ہیں اور ان تضادات کو چھپانے کے لیے انسانی حقوق کے تصور کو کھلے عام استعمال کیا جا رہا ہے۔ ہم توقع کرتے ہیں کہ حقوق کو قانونی تحفظ دیا جائے اور ملکوں کو قانون کی حکمرانی کے تابع یا مطابق لایا جائے۔ مگر کس حق کے تحت اور کس مقتدرہ کے زیر انتظام اور یہ جو بعض ملک دوسرے ملکوں کو قانون مخالف یا مجرم یا منحرف قرار دیتے ہیں وہ کن نتائج کی توقع کرتے ہیں یا ان سے کیا نتائج برآمد ہوں گے۔ ان ممالک سے کہا جاتا ہے کہ وہاں قانون کی حکمرانی نہیں۔ وہ اپنے عوام کے حقوق کا احساس نہیں رکھتے اس لیے بین الاقوامی برادری کی طرف سے ان پر پابندیاں لگائی جانی چاہئیں؟ قانون کی حکمرانی کا ایک معیار تو طاقتور ملکوں کے لیے ہے اور دوسرا بالکل ہی مختلف معیار ان ملکوں کے لیے جو مغرب کی طرف سے نافذ کردہ باہمی تبادلے کی زبان کی آفاقی صورت کے مطابق عقلی، سفارتی اور ہوش و حواس کی زبان میں بات نہیں کرتے۔ (۴۹) قصہ یہی نہیں، بلکہ جب امریکہ اور اس کے اتحادی اپنے دشمنوں کے خلاف کارروائی کرتے ہیں تو اسے انصاف کی جنگ کہا جاتا ہے۔ اسے قومی سلامتی کے نام پر دفاعی اقدامات قرار دیا جاتا اور اسے انسانی بنیادوں پر مداخلت کا نام دیا جاتا ہے مگر جب ایسے ہی اقدامات لیبیا، شام یا فلسطین والے کرتے ہیں تو انہیں دہشت گرد کہا جاتا ہے اور یہ بھی کہ وہ جابر آمر ہیں جو بین الاقوامی غلبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بہت واضح مسئلہ ہے جس کی مختلف شکلوں صورتوں پر بھی اگلے باب میں تفصیل سے بات کروں گا۔ پولیس پر قابو پانے کے لیے کون سی پولیس ہے؟ امریکہ کا دعویٰ ہے کہ وہ بین الاقوامی قانون کی پاسداری کرتا ہے مگر جب عالمی عدالت نے نکاراگوا میں امریکہ کی غیر اعلانیہ جنگ کی مذمت کی تو اس نے عالمی عدالت کے اختیار کو ہی

مسترد کر دیا۔ ابھی عشرہ بھی نہیں گزرا امریکہ کی سپریم کورٹ نے ٹیکساس کی سرکٹ عدالت کے آئینی فیصلے کو برقرار رکھا جس کے تحت امریکہ کے قانون نافذ کرنے والے افسر کو یہ اجازت دے دی گئی کہ وہ کسی ایسے شخص کو اغوا کر کے جس نے امریکی قانون کی خلاف ورزی کی امریکی عدالت میں پیش کر سکتا ہے اس طرح یہ ثابت کیا گیا کہ امریکی قانون کی عملداری ساری دنیا پر ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ امریکی ذرائع ابلاغ نے شاذ ہی اس کا نوٹس لیا ہو۔ پرانے زمانوں میں یہ لاقانونیت بجا طور پر ڈاکہ زنی کہلاتی تھی۔ (۵۰)

انسانی حقوق کے تحفظ کے نام پر عالمی آرڈر (نظام) کے قانونی تصور کے ساتھ خفی مگر بڑے ہی اہم مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ انسانی حقوق کا موجودہ تصور ملک یا ریاست اور سول سوسائٹی کے درمیان فرق پر مبنی ہے۔ یہ فرق دراصل اپنے دامن میں خوفناک نتائج سمیٹے ہوئے ہے۔ جن حقوق کی بات کی جاتی ہے وہ حکومت سے حاصل کیے جاتے ہیں دوسرے لفظوں میں حکومت کی مہربانی سے حاصل ہوتے ہیں اور یہ حقوق ہیں اظہار کی آزادی جلسہ عام میں شرکت کی آزادی، آئین کے اندر رہتے ہوئے اپنی شکایات کے اظہار کی آزادی وغیرہ وغیرہ۔ ملک ان حقوق کا ضامن بنتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا بھر میں یہ ملک یا حکومت ہی ہے جو انسانی حقوق کو پامال کرتی ہے۔ اس طرح انسانی حقوق کے حوالے سے ریاست کو رعایت مل جاتی ہے بلکہ حقوق ضرورتاً محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ گرفتاری کے بعد منصفانہ سماعت کا حق یا اپنے ملک کی حکومت میں شریک ہونا ایک غیر مشروط سیاسی اور شہری حق ہے مگر مکان، خوراک، صاف ہوا اور صاف ستھرا ماحول مفت پرائمری اور ثانوی تعلیم، سرکاری ٹرانسپورٹ، صحت کا اعلیٰ معیار، اپنے نسلی اور ثقافتی وجود کو محفوظ رکھنے، بے روزگاری یا بیماری اور سن رسیدگی کے باعث وظیفہ یہ وہ حقوق ہیں جنہیں انسانی حقوق کے برابر درجہ نہیں دیا جاتا۔ یہ متضاد صورت حال یا تقسیم اقوام متحدہ کے قیام سے لے کر آج تک کی کارروائیوں میں دیکھنے میں آتی ہے جبکہ اقوام متحدہ کے معاشی اور سماجی منشور میں ان مسائل پر زیادہ دلسوزی سے بات کی گئی ہے اور اس کی ہلکی سی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ جبکہ یونیورسل ڈکلیریشن آف ہیومن رائٹس تو صرف سیاسی اور شہری حقوق کا منشور ہے۔ اگر مقصود یہ تھا کہ ڈکلیریشن کو زیادہ تشہیر ملے اور سماجی اور معاشی حقوق پس پردہ رہیں تو اس ضمن میں مغربی جمہوریتوں کو شاندار کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ اس ضمن میں امریکہ کا رویہ سمجھنے کے لیے کسی لمبے چوڑے سازشی نظریے کی ضرورت نہیں کہ اس

وقت امریکہ میں افریقی امریکی، قدیم امریکی باشندے پورٹوریکو کے لوگ اور ایشیائی امریکی باشندے مزدوری کررہے تھے ہیں ان سے امتیازی سلوک کیا جاتا ہے انہیں بے شمار باتوں سے محروم رکھا جاتا ہے۔ اس لیے امریکہ کو انسانی حقوق کے ایسے وسیع تصور کی ضرورت نہ تھی جو خود امریکہ سے سوال کرتا کہ اس نے اپنی ان اقلیتوں سے کیا سلوک اختیار کررکھا ہے؟

ہمیں اس بات پر اپنا ذہن بالکل صاف رکھنا چاہیے کہ ترقی یافتہ، ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک کو مباحثہ کی یہ عیاشی نہیں کرنی چاہیے کہ وہ انسانی حقوق کے موجودہ تصور کے بارے میں دلیلیں دینے لگیں کہ یہ ایشیائی اقدار یا لوگوں کے دیسی ثقافتی اور سیاسی طریقوں کے خلاف ہیں۔ جو سیاسی لیڈر اس قسم کی دلائل بازی میں پڑے مثلاً ملیشیا کے مہاتیر محمد۔ تو اس نے انتقاماً مغرب کا ہی ترقیاتی ایجنڈا قبول کرلیا، یہ لیڈر آزاد منڈی ٹیکنالوجی کی غیر معمولی صلاحیت اور اطلاعات کی تاثیر کے پرجوش حامی بن گئے ہیں۔ بات صاف ہے کہ ان سب کے ساتھ ایشیائی اقدار کی مطابقت پیدا کی جاسکتی ہے مگر مہاتیر نے جس انداز کا اپنے مخالف سابق ڈپٹی پرائم منسٹر اور فنانس منسٹر انور ابراہیم سے سلوک کیا، اس کے حوالے سے انسانی حقوق سے مطابقت پیدا نہیں ہوسکتی۔ (۵۱) انور ابراہیم کے خلاف ہم جنس پرستی اور رلونڈے بازی کے الزام گھڑے گئے جن کے تحت وہ قید کی لمبی سزا کاٹ رہا ہے۔ مہاتیر اور اس کے ہم نوا ہمیں ارتقائی نمونوں کے مضحکہ خیز خاکے نظر آتے ہیں اور غیر مغربی ملکوں کا یہی مقدر ہے۔ ہمیں یہاں اختتام تاریخ کا ہیولا نہیں بھولنا چاہیے۔ اور جب تک وہ ستمبرانہ انداز میں ترقی کی طرف بڑھیں گے اور ترقی کے بعد وہ اس طرح آزاد اور جمہوریت نواز ہوتے جائیں گے اور پھر بلاشبہ انسانی حقوق بھی رائج ہو جائیں گے۔ اگر اس طریق اور نمونے پر بڑی لے دے نہیں ہوئی جیسی کہ بجا طور پر ہونی چاہئے تھی تو اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ بالکل یورپی ملکوں کی روائت اور تاریخی تجربے کے عین مطابق ہوا۔ یورپی ملکوں نے پہلے یورپی دنیا پر اپنے ظلم وستم کے ذریعے قبضہ کیا اور بعد میں انہوں نے اپنی رعایا کو یہ حقوق دیئے اور دوسرے اس لیے کہ اب یہ دانشمندی سمجھی جارہی ہے کہ آزاد منڈی کے نظریہ سے وابستگی کی بنا پر مناسب وقت کے اندر تمام اچھی چیزیں ہمارے ہاتھ لگ جائیں گی۔

ایشیائی اقدار کی طرف سے بولنے والوں کی ایک ستم ظریفی پر کم ہی دھیان دیا گیا ہے کہ بیسویں صدی میں انسانی حقوق کے زیادہ تر علمبردار اور مبلغ قوم پرست اور سابقہ نوآبادیات کے لیڈر رتھے۔ (۵۲) مہاتما گاندھی کا اصرار تھا کہ سماجی اور معاشی مساوات کے لیے جدوجہد کی جائے اور یہی خیالات انہوں نے 30 جنوری 1948 کو اپنے قتل سے پیشتر انڈین نیشنل کانگریس تک پہنچائے۔ انہوں نے کہا کہ کانگریس کے راہ نما اور ارکان تمام ہندوستانی باشندوں کے مکمل سماجی، معاشی، ثقافتی اور سیاسی حقوق کے لیے جدوجہد کریں مگران خیالات کو ''بہت زیادہ خیالی'' کہہ کر رد کر دیا گیا (۵۳) جب نہرو، ناصر اور سوئیکارنو نے انسانی حقوق کی بات کی (۵۴) نہ صرف انسانی حقوق کی بلکہ دنیا بھر میں موجود غیر مساویانہ صورتوں کی بات کی تو انہیں مشورہ دیا گیا کہ وہ صرف قابل حصول مقاصد کی بات کریں۔ دنیا بھر میں جس اونچی سطح پر استحصال ہو رہا ہے جو نابرابری موجود ہے اس میں انسانی حقوق کی بات کرنا دشمن کو ایک بہانہ فراہم کرنے کے مترادف ہے۔ سرد جنگ کے پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے امریکہ نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ سابق نوآبادیات کو اپنے حقوق کے بارے میں زیادہ نہیں سوچنا چاہیے بلکہ انہیں کمیونزم کو روکنے کے لیے آزاد دنیا کی مدد کرنے کا فریضہ نبھانا چاہیے۔

انسانی حقوق کا خیال بلاشبہ ایک اعلیٰ خیال ہے اور اس سے انکار انسانیت کی تذلیل ہے۔ قابل فہم بات ہے کہ یہ مغرب خصوصاً دنیا کی واحد سپر پاور امریکہ کا ایک اور نظریاتی اور سیاسی ہتھیار ہے اور یوں انسانی حقوق کے نظریے میں بھی ملاوٹ ہوگئی ہے۔ امریکہ اس وقت اپنے آپ کو انسانی حقوق کی تحریک کا لیڈر سمجھتا ہے اور چاہتا ہے کہ ساری دنیا اس تحریک میں جس شامل ہو۔ مگر اس سے پیشتر کہ ان کی خلاف ورزی خود امریکہ میں ہونے لگے، انسانی حقوق کا حال احوال کا وہاں جائزہ لینا چاہیے جہاں سے یہ تحریک شروع ہوئی۔ سامراجی یورپی ملکوں اور امریکہ کا اس ضمن میں وحشیانہ کردار دیکھنا ہو گا جنہیں یہ واحد اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے اپنے مخالفوں اور مفروضہ مخالفوں کو ایسے ایسے طریقوں سے تہہ تیغ کیا کہ جس کی گواہی تاریخ دیتی ہے۔ مخالفوں کو بالاارادہ بیماریوں کا شکار کیا ان پر کیمیاوی ہتھیار استعمال کیے۔ نیپام بموں کا نشانہ بنایا، ایٹمی ہتھیار کے ذریعے نابود کیا، دہشت گردی کے بہانے بم برسائے۔ یہ سب کچھ یہ ثبوت فراہم کرتا ہے کہ انسان کی مکاری کی کوئی حد نہیں ہے اور پھر انسان یہ سوچ اور دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے کہ کسی اور جگہ پر نہیں بلکہ لینگلے ورجینیا میں سی آئی

اے کے ہیڈکوارٹر کی عمارت پر بائبل کا یہ اقتباس کنندہ ہے ''تم سچائی جان جاؤ گے تو یہ سچائی تمہیں آزاد کردے گی'' (جان8:32)

مکاری کی یہ صورتیں اس وقت بھی نظر آتی ہیں جب نوم چومسکی کی دبنگ آواز سے بھی تیسری دنیا کے لوگ نہیں جان سکے کہ مغربی کلچر میں کلیت پسندانہ لہر کتنی مضبوط ہے نہ ہی وہ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ مغربی کلچر کی وحشت اور بیزاری کس قدر ہے۔ (۵۵) اور پھر بھی دانائی کی بات ہے کہ مغرب چومسکی اور اس جیسے نقادوں کی باتوں کو ثبوت کے طور پر پیش کرتا ہے کہ وہ معاشرے کس قدر روادار اور خود تنقیدی سے لیس ہیں۔ (۵۶) میں نے کہیں اور اسی قسم کے فکری تانے بانے کا ذکر کیا ہے اور یہ کہ ان دنوں اس قسم کی لامحدود معذرتوں نے یورپ اور امریکہ کو گھیرے میں لے رکھا ہے، مغربی قوموں نے اپنی ماضی کی کچھ ظالمانہ کارروائیوں کے بارے میں معذرت پیش کی مثلاً (امریکہ اور کینیڈا میں) قدیم امریکی باشندوں پر کیے گئے ظلم و ستم پر معذرت اور پھر دلیل یہ دی جاتی ہے کہ مغربی ثقافت میں گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی بھی صلاحیت ہے کہ وہ معذرت اور معافی مانگنے کو ہمہ وقت تیار ہے اور یہ اس کی کشادہ دلی کا ثبوت ہے۔ انسانی حقوق کے حوالے سے عصری گفتگو کے بارے میں بنیادی پریشانی یہ ہے کہ مغرب اب انہی انسانی حقوق کو انسانی اخلاقیات کا عالمی معیار بنانا چاہتا ہے۔ یہ آفاقیت اور اسی قسم کی ہمہ گیری کے دوسرے پہلو جو جدیدیت کا تانا بانا ہیں ان سب کا سرچشمہ مغربی تہذیب کی ثقافتی اور سیاسی تاریخ ہے یہی آفاقیت ہے جو اختتام تاریخ کی پشت پر ہے اور ان کی مخالفت اصولی طور پر ممکن نہیں رہی۔ لیکن اس کا یہ پہلو بھی ہے کہ جب تک سیاسی نظام نامکمل ہیں اور سیاسی لیڈروں کے لیے اقتدار کے حصول میں کشش ہے انسانی حقوق کی تلاش اور پیاس جاری رہے گی۔ ہم عصر کلچر میں جتنے بھی افکار پیدا ہوئے ہیں ان سب میں انسانی حقوق کا سوال اپنے فلسفیانہ مفروضوں، نظریاتی تازگی اور وسعت کے اعتبار سے بڑا پرکشش رہا ہے۔ سربیا اور کوسوو پر نیٹو فوج کی بمباری سے ہمیں انسانی حقوق کی دہشت گردی کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھنے کو ملی مگر اصل دہشت دیکھنا ابھی باقی ہے۔

باب 3

طریق حکمرانی... اکیسویں صدی میں

اس وقت امریکہ دنیا کی واحد سپر پاور (سب سے بڑی حکومت) ہے۔ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ممالک جنہیں امریکہ نے دہشت زدہ کر رکھا ہے، یا وہ ملک جو مستقل اسی فکر میں ہیں کہ امریکہ کہیں ان کے معاملات میں دخل اندازی شروع نہ کر دے وہ اس نئی حقیقت سے پوری طرح باخبر ہیں کہ نہیں کہ امریکہ سپر پاور ہے یا یہ کہ خود امریکہ اس بات پر حیران کھڑا ہے کہ موجودہ عالمی سیاست میں واقعی وہ سب سے زیادہ قدر آور ہے اور آقا کا درجہ رکھتا ہے۔ دو تین برس سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ امریکہ کی ایک سابق وزیر خارجہ میڈیلین البرائٹ نے کہا تھا کہ امریکہ "دنیا کی ایسی طاقت ہے جس کے بغیر دنیا رہ نہیں سکتی"، یعنی دنیا اور امریکی قوم لازم وملزوم ہیں۔ خیر یہ تو ہوا مگر اس کے زمانے کا ایک اور قصہ بھی بڑا مشہور ہوا کہ جب اس کا تقرر اس اعلیٰ سیاسی عہدہ پر ہوا تو اسے فوج کا جو مختصر تعارف پیش کیا گیا جس پر وہ حیران رہ گئی اور کہنے لگی حیرت ہے کہ ایسی زبردست مشین (فوج) کو کثرت سے استعمال کیوں نہیں کیا جا رہا (۱) تاہم بعد میں جب اسی کے زمانہ سفارت میں فوج کا جو استعمال ہونے لگا تو یقیناً وہ اس بات پر بڑی خوش ہوئی ہوگی۔ اسی کے زمانہ وزارت میں افغانستان اور سوڈان پر حملے شروع کیے گئے۔ عراق کو ایک طرف شدید پابندیوں (۲) کی مار دی جا رہی تھی دوسری طرف اس پر بمباری بھی شروع ہوگئی۔ انہی دنوں مسلسل کئی ہفتوں تک سربیا پر کارپٹ (یکسار) بمباری کی گئی۔

یہ بات یقینی طور پر جان لینی چاہیے کہ برائی اور سنگدلی کے ایسے مظاہرے صرف البرائٹ تک ہی مخصوص نہیں۔ سب اعلیٰ امریکی حکام اسی قاہرانہ رنگ میں رنگے ہوئے

ہیں۔ نخوت اور گھمنڈ کی چمک البرائٹ پر کم اور دوسرے امریکیوں پر زیادہ نمایاں ہے۔ یعنی اس کا مظاہرہ دنیا کے بارے میں امریکیوں کے رویے سے صاف جھلکتا ہے۔ اور شروع ہوتا ہے جارج بش جونیئر کے اس بیان سے کہ گرین ہاؤس گیسوں کے دنیا پر اثرات کے بارے میں جس قدر تحقیقی کام امریکہ نے کیا ہے باقی دنیا کو اس کے بارے میں خبر ہی کوئی نہیں۔ امریکہ یہ گیسیں سب سے زیادہ پیدا کرتا ہے۔ اس سے یہ کہنا یعنی مقصود ہے کہ بندوقیں زیادہ ہوں تو جرائم کم ہو جاتے ہیں۔ (۳) ٹیموتھی میکوے نے 168 امریکیوں کو ہلاک کر دیا تھا تو کہا گیا کہ امریکی سرزمین پر دہشت گردی کا یہ سب سے بڑا اور افسوس ناک واقعہ ہوا جیسے گزشتہ کئی سو سال سے قدیم امریکی باشندوں اور افریقی امریکیوں کے ساتھ کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ اگر یہ ذکر کر دیا جاتا تو امریکہ کا دعویٰ کمزور پڑ جاتا ہے کہ اس کا مشن تو دنیا کی راہ بری کرنا ہے۔ یورپی یونین میں موت کی سزا دینے کی اجازت نہیں ہے جبکہ ہیومن رائٹس واچ اور ایمنسٹی انٹرنیشنل نے موت کی سزا کے حوالے سے امریکہ کو چین، ایران اور سعودی عرب کے ساتھ کھڑا کر دیا ہے۔ (۴) کندہم جنس باہم جنس پرواز کے مطابق امریکہ ان پانچ ملکوں میں شامل ہے جو دماغی طور پر معذور افراد پر بھی مقدمہ چلاتے ہیں اور انہیں سزائے موت دیتے ہیں اور ایسے مجرموں کو بھی جن سے جرم سرزد اس وقت ہوا تھا جب وہ نابالغ تھے۔ اس صف میں امریکہ کے ساتھ جو ملک کھڑے ہیں امریکہ ان کو بدمعاش ملک، آمریت اور کلیت پسند ممالک کا نام دیتا ہے۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل نے اپنی تازہ رپورٹ میں کہا کہ امریکہ انسانی حقوق کی وکالت بھی بہت کرتا ہے مگر ان حقوق میں رکاوٹیں بھی اسی حساب سے ڈالتا رہتا ہے۔ (۶) چنانچہ توقع کی جا سکتی تھی کہ میکوے کی سزا کے بعد امریکہ پر جو سخت تنقید ہوئی تھی اس سے امریکہ میں کچھ شائستگی پیدا ہو گئی ہو گی مگر نیٹو کے لیے ایک سابق امریکہ سفیر کا بیان تو کچھ اور کہتا ہے۔ اس سفیر نے کہا تھا کہ امریکہ والے سمجھتے ہیں کہ باہر خصوصاً یورپی ممالک کی طرف سے امریکہ میں موت کی سزا کے خاتمے کے بارے میں جو کچھ کہا جاتا وہ ہمارے معاملے میں مداخلت ہے۔... لیکن صرف یورپی ہی کیوں؟ یورپ والوں نے تو خود پوری ایک صدی بربریت کا مظاہرہ کیا ہے اور ان کے ہاتھ کون سے صاف ہیں، اور پھر خود امریکہ نے یورپیوں کی اس بربریت میں بھی کئی ایک بار حصہ ڈالا ہے۔ (۷)

قطع نظر امریکی قیادت کی سیاسی وابستگیوں کے عالمی حکمرانی کی سہ پہلو صورتوں (یا

تکونی صورتوں) میں امریکہ ایک پہلو کی نمائندگی کرتا ہے اور یہی اس باب کا موضوع ہے۔
گزشتہ سالوں خصوصاً سوویت روس کے ٹوٹنے کے بعد جب یہ افسانہ بنانے کا امکان بڑھ گیا تو امریکہ نے کہنا شروع کر دیا کہ اب دنیا ایک ہی سمت اور ایک ہی مقصد کے لیے بہتر اتحاد و اتفاق کے ساتھ آگے بڑھے گی اور اس مرحلے پر امریکہ نے عالمی برادری کو یہ بھی باور کرانے کا عمل شروع کر دیا کہ کامیابی زیادہ تر اسی کی پالیسیوں کی ہوئی ہے اس لیے ان پالیسیوں پر ایمان لایا جانا چاہیے۔ امریکہ کا مفروضہ یہ تھا کہ اب روس اقوام متحدہ میں اس کے عالمی مفادات میں رکاوٹ نہیں ڈالے گا اور حالات کے مطابق کسی حد تک ایسا ہی ہوا (امریکہ کے خیال میں روس، امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے مفادات کے خلاف نہیں جائے گا اگر امریکہ عالمی برادری کے نام پر منصفانہ طرزِ عمل اختیار کرے گا تو یقیناً خود امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو اس حوالے سے بے شمار فوائد حاصل ہوں گے۔ کامیابی کے اس مرحلے پر امریکہ نے کشادہ دلی کا مظاہرہ کیا۔ جمہوریت پسندی کا بھی مظاہرہ کیا اور مہربان بھی رہا تاہم وہ دوسری قوموں سے مل کر اگلی کارروائی کے لیے تیار بھی ہو رہا تھا۔ صدام حسین کے کویت پر حملے کے بعد امریکہ نے اپنے حوالے سے اقوام متحدہ کو استعمال کیا۔ اقوام متحدہ نے عراق پر پابندیاں لگائیں۔ عراق کے مقابلے اور اسے کویت سے نکالنے کے لیے کثیر القومی (اس کی ظاہری شکل وصورت تو ایسی ہی تھی) فوج بھی بنائی اس وقت چند ایک ممالک اس کے (امریکہ کے اقوام متحدہ کے ذریعے اقدامات) خلاف بھی تھے مگر عالمی برادری بھی غیر یقینی کیفیت میں تھی، چنانچہ مخالفت کرنے والوں کی مخالفت کے باوجود اس ساری کارروائی کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا نہ ہوئے۔ دوسرے بلاکوں مثلاً نیٹو، وارسا پیکٹ، اوپیک (تیل پیدا کرنے والے ممالک کی تنظیم) اواے یو (آرگنائزیشن آف افریقین یونیٹی) کی نوعیت تو کچھ نظریاتی قسم کی تھی۔ اس کے برعکس عالمی برادری کا یہ اتفاق نظریاتی نہیں انسانی سمجھا گیا جس کے ذریعے دنیا میں امن کو دوام دینا مقصود تھا۔ امریکہ کو عالمی برادری کی طرف سے بہت کچھ حاصل کرنا تھا اور اس طرح کہ اس میں امریکیوں کا جانی نقصان بھی نہ ہو۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گزشتہ عشرہ میں عالمی حکمرانی کے حوالے سے اقوام متحدہ زیادہ سرگرم اور سرمیدان نظر آنے لگی۔ تاہم اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اسے اہمیت بھی زیادہ حاصل ہو گئی ہو۔ اس مرحلہ پر یہ یاد رکھنا ہی کافی ہو گا کہ خیال تھا کہ اقوام متحدہ اپنے عمل کے

باعث روایتی سیاسی معنوں میں ایک بین الاقوامی فورم کی صورت اختیار کرتی جائے گی مگر اس کے برعکس اس کی طرف سے عالمی رائے عامہ کی نمائندگی کم ہونے لگی یعنی یہ عالمی برادری کی پوری نمائندگی نہ کرسکی۔ تاہم اس کے حق میں یہ بات بھی جاتی ہے کہ اس کے ذریعے بہت سے خیالات تصورات اور پیرایہ عمل بھی سامنے آئے۔ مثلاً سماجی سائنسی علوم میں سے پائیدار ترقی اور انسانی حقوق کو فروغ بھی ہوا۔ اور اقوام متحدہ کے سائے تلے یہ نظریے مقبول ہوئے۔ اسی طرح غیر سرکاری سماجی تنظیموں (این جی اوز) کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوئی۔ اور بعض ممالک میں مثلاً نیپال اور بنگلہ دیش میں تو این جی اوز نے سرکاری پالیسیوں کی تشکیل میں بہت زیادہ حصہ ڈالا۔ یہ سب کچھ اقوام متحدہ کے طفیل ہوا جس نے سول سوسائٹی کے اندر ترقی کی خواہش اور عمل کو فروغ دیا اور این جی اوز کو مشاورت کا مرتبہ بھی دیا۔ دنیا بھر میں متعدی امراض مثلاً ہیضہ، پولیو، تپ دق کو روکنے کے لیے اقوام متحدہ کی تحریک اور کوششوں کو پذیرائی حاصل ہوئی۔ اقوام متحدہ کی متعدد خاص ایجنسیاں جن میں سے ایک صحت کی عالمی تنظیم (WHO) ہے جس نے دنیا میں چیچک کو ختم کرنے کے لیے ایک بڑی کامیاب تحریک چلائی۔

اقوام متحدہ اور اس کی خاص ایجنسیوں کے بعض شعبوں میں کیے گئے کام کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اقوام متحدہ کی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع ہوگیا ہے پھر اس کے سیکرٹری جنرل کا عہدہ گزشتہ پچپن سالوں میں زیادہ افریقہ، ایشیا، جنوبی امریکہ وغیرہ کے سفارت کاروں کے پاس رہا ہے اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ادارہ واقعتاً ایک اجتماعی اور عالمی اتحاد کا مظہر بن چکا ہے تاہم سیاسی اور معاشی انتظام یا حکمرانی کے حوالے سے پورے ادارہ پر نظر ڈالی جائے تو نہیں کہا جاسکتا کہ یہ ادارہ پورے سچ کا نمائندہ ہے۔ اس ادارے نے ان قوموں کے مسائل پر کس قدر توجہ دی جو بالائی طبقے سے تعلق نہیں رکھتیں۔ یا اس نے یہ نظریہ پوری طرح قبول کرلیا ہو کہ انسانی زندگی جہاں کہیں بھی ہے اس کی اقدار ایک جیسی ہی ہیں۔

اقوام متحدہ کی وجہ سے جو ناہمواریاں اور غیر مساوی صورتیں پیدا ہوئیں وہ بڑی واضح ہیں ان پر بعد میں بحث کی جائے گی۔ مثلاً مصلحت آمیز پابندیوں کا اندھا دھند نفاذ، ان کا پورا روپ سامنے نہیں آتا تاہم یہ بہت ہی سخت پابندیاں اقوام متحدہ کے امن قائم کرنے کے مشن کا ایک حصہ ہیں۔ تاہم انسانی شعبے میں اقوام متحدہ کی ان کارروائیوں پر بات چیت کم ہی کی گئی ہے۔

جس زمانے میں اقوام متحدہ قائم کی گئی، انہیں دنوں بریٹن وڈز کانفرنس (1944) کے بعد دو تنظیمیں عالمی بنک (ورلڈ بنک) اور بین الاقوامی مالیاتی ادارہ (انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ) آئی ایم ایف (اکثر اوقات صرف فنڈ کے نام سے) بنائے گئے آج اس کو عالمی ادارہ تجارت (ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن) سے جوڑ دیا گیا ہے۔ یہی دو ادارے دنیا پر معاشی حکمرانی چلانے کے ذمہ دار ہیں۔ ان کے فرائض خصوصاً گزشتہ عشرہ کے دوران جب نج کاری اور ضابطوں سے آزادی کو امریکہ بڑا فروغ دے رہا تھا یہ تھے کہ وہ (معاشی اعتبار سے) بھٹکے ہوئے ملکوں کو واپس راہ راست پر لائیں۔ میرے نزدیک ان بھٹکے ہوئے ملکوں کو بھی ''بدمعاش ممالک'' کے ہم معنی یا ہم پلہ شمار کیا گیا۔ طریقہ یہ تھا کہ انہیں مدد دے کر جلدی سے عبوری دور سے گزارا جائے مثلاً اجناس وغیرہ کی ریاستی امداد بند کی جائے اور درآمد پر ٹیکس ختم کر کے انہیں آزاد منڈی کے معاشی نظام میں لایا جائے۔

عالمی ادارہ تجارت (ڈبلیو ٹی او) کا پہلا ڈائریکٹر جنرل اس ضمن میں بڑا پر جوش تھا اور اس کے خیال میں دنیا بدل رہی تھی اور جدید تاریخ کا فیصلہ کن لمحہ آ پہنچا تھا جب گاٹ (جنرل اگریمنٹ آن ٹیرفز اور ٹریڈ) پر دستخط کنندگان اب ڈبلیو ٹی او کے تحت ایک زوردار اور وسیع الاطراف قسم کے نئے معاہدہ پر دستخط کرنے کے لیے آمادہ ہو چکے ہیں۔ پیٹر سدر لینڈ نے اعلان کیا ''حکومتیں اس نتیجے پر پہنچ چکی ہیں کہ نیا عالمی نظام نہ صرف پر کشش ہے بلکہ انتہائی لازم بھی ہے اور عالمی مارکیٹ کی حقیقت اس وقت مکمل ہو گی جب کثیر الجہتی اور کثیر الاقوامی تعاون ایک خاص سطح پر حاصل ہو جائے گا۔ جبکہ یہ تعاون حاصل کرنے کے لیے پہلے کوئی کوشش نہیں کی گئی، ڈبلیو ٹی او کے طرفدار اور ان سے بھی زیادہ علاقائی سطح کی آزاد تجارت کی تنظیمیں کچھ ایسے ڈھنگ اور محاورے میں بات کرتی ہیں جس کے باعث اس موقف سے اختلاف کرنے والوں پر بھاری بوجھ آ جاتا ہے۔ اختلاف کرنے والوں کو دکھائے جانے والے منظر حیران کن ہیں۔ جن میں وہ مبہوت ہو کر رہ جاتے ہیں۔ جسے عالمی نظام کا رخ کہا جاتا ہے تو سوال یہ ہے اور محض افہام وتفہیم کے لیے کہ بات کس عالم یا دنیا کی ہو رہی ہے؟ ایک نئے نظام سے مراد کیا ہے؟۔ کس زبان میں، کس شعبہ میں، کس سزا کی، کس نفاذ کی، کس پر سکونیت کی اور کس کے اخراج کی؟ نظام کے ساتھ ہی یہ ساری چیزیں بھی تو آتی ہیں؟

جمہوریت، کلیت یا آمریت: امریکہ کے لیے نوحہ

امریکہ دنیا کی تاریخ میں ایک نادر مثال ہے۔ وہ مثال نہیں جو اس کے حمائتی، عاشق اور لالچی خودغرض سیاستدان پیش کرتے ہیں۔ ہر مہینے دو مہینے کے بعد امریکہ کا صدر اور اس کے سربرآوردہ سیاستدان ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ امریکہ اس دھرتی پر عظیم ترین ملک ہے۔ اس کے علاوہ بڑے پرشور بے معنی القابات اور بے حقیقت جملے ہیں جو امریکی زبان میں پھلتے پھولتے رہتے ہیں۔ سنتے ہیں کہ یہ ''آزاد منش بہادروں کی سرزمین'' ہے۔ قربتوں میں جذب ہوئے وہ لوگ ہیں جو کھردری تنہائیوں اور فرد کی تنہائی کی سزا سے بچ کر آئے ہیں۔ اور وہ جو ''امریکہ کے خواب'' میں بڑے من بھاونے شمار ہوتے ہیں۔

صرف پختہ کار مشاہدہ باز ہی اس بات پر حیران نہیں ہوتے کہ امریکی لوگ کس طرح یہ سوچتے ہیں کہ امریکہ اور یہ ساری دنیا دو ایک جیسی ہی چیزیں ہیں۔ امریکہ کو حال ہی میں اقوام متحدہ کی دو تنظیموں کمشن برائے انسانی حقوق اور انٹرنیشنل نارکوٹکس کنٹرول بورڈ (۹) سے خارج کر دیا گیا ہے۔ امریکیوں نے غیض وغضب میں جو کچھ کہا ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اب یہ دونوں تنظیمیں عالمی سطح کی تنظیمیں نہیں رہیں۔ اب جب امریکہ کو ایک تل بھر مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا ہے تو امریکی مبصرین کے تبصرے پڑھ کر ایسے لگتا ہے جیسے وہ کہہ رہے ہوں کہ جب امریکہ ختم ہو گا تب دنیا بھی ختم ہو جائے گی تاہم یہی وقت ہے جب اس حقیقت کو امکان کی حد تک مان لیا جائے کہ امریکہ کے خاتمے میں ہی انسانیت کا روشن مستقبل پنہاں ہے۔

امریکی خودنگری کا رشتہ اعلان آزادی اور برطانوی تسلط سے نوآبادیوں کی آزادی کے لیے جنگ سے جا کر ملتا ہے بلکہ آج سے پہلے کے عالموں کا کہنا ہے کہ امریکیوں کا اپنے بارے میں قیاس پیری ملر کے الفاظ میں ''صحرا میں سفر کے بیچ اور کچھ برطانوی خصوصیات کے ورثہ'' سے پھوٹتا ہے (۱۰) انیسویں صدی میں انگریز (برطانوی) بلاشبہ یہ سوچتے تھے کہ وہ بڑے سخت کوش حاضر دماغ، شجاع، معاملہ ساز، کاروباری سوچ کے مالک، بلند عزائم رکھنے والے لوگ ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جس حساب سے ان کی سلطنت پھیلی اس سے یقیناً کچھ کو یہ بھی خیال آیا کہ انہوں نے دنیا کی تاریخ میں ایک منفرد اور ممتاز کردار ادا کرنا ہے۔ جس زمانے میں قوموں کے اوصاف کے تعین کا کاروبار بڑا عام تھا ان دنوں اکثر یہ کہا جاتا تھا کہ انگریزوں کا مزاج روح جمہوریت سے مطابقت

رکھتا ہے۔ تاہم بعض مبصرین کا خیال تھا کہ انگریز یہ سمجھتا تھا کہ عوام پر جمہوریت کے دروازے کھولنے کا کام اشرافیہ کے توسط سے ہو یعنی اس میں اشرافیہ کا احسان قسم کا جذبہ چھپا ہوا تھا۔ اب انگریزوں اور دوسروں کا تقابلی مطالعہ کریں تو جرمن کی عسکریت پسندی کے انگریزوں کے لیے ایک چیلنج بننے سے پہلے انگریز اپنا مقابلہ فرانس کے آمرانہ انداز سے کیا کرتے تھے اور انگریزی تحریروں میں بھی یہ لکھا ہے'' 1833 میں ایڈورڈ لٹن بلویر نے لکھا ''فرانسیسی کو اس بات پر فخر ہوتا ہے (جیسا کہ میں نے کہیں پڑھا ہے) کہ وہ اتنے بڑے ملک کا باشندہ ہے'' جبکہ انگریز اس بات پر نازاں ہوتا ہے کہ اتنا بڑا ملک اس کا ہے (۱۱) بہرطور انگریزی تحریروں میں یہ بات خال خال ہی نظر آئے گی کہ برطانیہ کے انگریزوں کو کوئی خاص انعام ودیعت کیا گیا ہے۔ جبکہ اللہ کی طرف سے خاص انعام کا تصور تو امریکی خودنگری کا ایک بنیادی پتھر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس عنایت نے ان عیسائیوں (شیکرز) کو متحرک کیا جو ظہور عیسیٰ ثانی میں یقین رکھتے ہیں پھر مورمینوں کو بھی خدا کی میزبانی نے قائم کیا پھر ہفتے کو آرام کا دن قرار دینے والے عیسائی اور ان مسیحوں کے کئی دوسرے گروپ عنایات خداوندی پر بڑا تکیہ کرتے تھے۔ انہی کی طرح ہر امریکی یہ سمجھتا ہے کہ اللہ نے جتنا کرم ان کے ملک پر کیا ہے کسی اور قوم پر نہیں کیا (۱۲) دوسری طرف امریکیوں کے اعلان آزادی کا آغاز عوام کے نام سے ہوتا ہے جس سے لازم ہے کہ جب امریکہ کا نام آئے تو یہ دھیان رہے کہ امریکہ عوام کے بارے میں بہت حساس رویہ رکھتا ہے اور امریکہ وہ جگہ ہے جہاں عوام اور اشرافیہ میں کوئی امتیازی حد بندی نہیں ہے۔

یہ دو فکری میلانات ایک یہ کہ امریکیوں پر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایات ہیں اور وہ اس کے وارث بنائے گئے اور دوسرے یہ کہ آج کی دنیا میں جمہوریت کا تصور امریکہ نے دنیا کے سامنے پیش کیا' ان دونوں صورتوں نے مل کر امریکہ کو پوری دنیا میں ایک بڑی خطرناک قسم کی شکل دے دی ہے جو اس سے پہلے دنیا نے نہیں دیکھی تھی۔ 2001 میں ایک مضمون چھپا تھا ویسے ایسے درجنوں مضامین چھپے ہیں اس مضمون میں کہا گیا تھا اور بلاشبہ خاص قسم کی منظوری کے بعد کہ دنیا میں امریکی خارجہ پالیسی کے طفیل جو اتفاق پیدا ہوا ہے وہ امریکی تاریخ کے واضح مقصد کی تکمیل کر رہا ہے اور مقصد یہ ہے کہ جمہوری سرمایہ داری کے فروغ اور امریکی طرز حیات (۱۳) کے باعث آزادی حاصل ہو.... جو ہو رہی ہے۔ امریکہ میں ہر نسل کے سیاستدان اپنی طرز فکر کو اپنے اپنے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ کلنٹن نے امریکہ

کو ایسی قوم قرار دیا جو تاریخ کے صحیح (دائیں) ہاتھ پر ہے (۱۴) اسی طرح دوسرے ممالک کے لیڈروں کے برعکس امریکی سیاستدان جب تقریر کرتے ہیں تو عوام کے نام سے ہی شروع کرتے ہیں۔ یہاں مراد صرف یہی نہیں کہ عام لوگوں کو بھلایا نہیں گیا بلکہ یہ کہ امریکہ جو کچھ کر رہا ہے وہ بھی عوام کے حوالے سے ان کے نام پر کر رہا ہے ان کی منظوری اور ان کی بھلائی کے لیے۔ یہ ایک طریقہ ہے تاکہ اختلاف پیدا ہی نہ ہو۔ جو کام عوام کے نام پر کیے جا رہے ہوں ان پر لوگ کم ہی انگلی اٹھاتے ہیں۔ خود صالحیت اور خود ثنائی کا اظہار بھی ایک برائی ہے اور اس برائی پر امریکہ کو کم و بیش اجارہ داری حاصل ہے۔ تاہم دوسرے ملکوں کے سیاستدانوں کے لیے یہ بات قابل تسلیم نہیں کہ اللہ تعالیٰ اور امریکہ ہمیشہ ایک اعلیٰ مکالمے میں مصروف ہیں۔ امریکہ کے گزشتہ صدارتی انتخاب نے دنیا میں الیکشن کا ایک معیار بھی قائم کیا اور پھر جب قصہ عام ہوا کہ انتخاب میں ووٹ چرائے گئے ہیں تو امریکہ کو خفت بھی اٹھانا پڑی تو اس الیکشن کے بعد دنیا نے دیکھا کہ قتل عام کا مرتکب بلند درجہ پر فائز ہوا جو بغیر کسی خفت کے یہ بھی کہتا ہے کہ عیسیٰ اس کا فلاسفر (راہبر) ہے۔ یہ سیاستدان جو اپنی تقریر اس دعا پر ختم کرتا ہے کہ ''اللہ امریکہ پر مہربان ہو'' مسلمہ طور پر یقین رکھتا ہے کہ اللہ کے دل میں امریکہ کے لیے خاص گوشہ ہے۔ اس کے ساتھ اس کے ذہن میں ایک یہ مفروضہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ قوموں کو خاص طور پر نوازا ہے اور کچھ کو اس قابل نہیں سمجھا۔ مغرب کے صنعتی ترقی والے ممالک کے مقابلے میں امریکہ کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ اس کے شہریوں کی اکثریت مذہبی خیال کی ہے اور باقاعدہ چرچ جاتی ہے۔ یہ امتیازی وصف بھی امریکہ کا ہے کہ یہاں اسقاط حمل کرنے والوں کا تعاقب کر کے انہیں قتل کیا جاتا ہے اور ان کا جرم یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ اللہ کے کام کو ضائع کرتے ہیں۔

امریکہ کا زیادہ قریبی تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ مکمل طور پر کلیت پسند جمہوریت کا مظہر ہے۔ اس کی یہ خواہش کہ وہ دوسرے ملکوں خصوصاً جنوبی امریکہ کے ممالک کو جمہوریت برآمد کرے اس کا اظہار وڈرو ولسن نے ان الفاظ میں کیا ہے ''میں جنوبی امریکی جمہوریتوں کو یہ سبق سکھانے جا رہا ہوں کہ وہ اچھے لوگ منتخب کریں' (۱۵) امریکہ ایک طویل عرصہ سے یہ کہتا آ رہا ہے کہ جمہوریت کی اصل پرکھ اس کے منصفانہ اور آزادانہ الیکشن پر ہوتی ہے مگر امریکہ نے دنیا کی سیاست میں جمہوریت کے حوالے سے جو حصہ ڈالا ہے وہ تو سیاسی منڈی کی ضرورتوں کے مطابق تھا اور اس کے مندرجہ بالا اصول کی

نفی ہے۔ کسی ملک میں کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے بار بار ایک سے لوگوں کا پڑھے لکھے ووٹروں کی طرف سے منتخب ہونا جیسا کہ ہندوستان کے صوبہ کیرالہ میں ہوتا ہے امریکہ کے لیے ناقابل قبول تصور ہے۔ جب یہ حق اختلاف رکھنے والے موجود ہوں تو پھر ان کا اختلاف یا ووٹ کے حق کا استعمال بامعنی بھی ہوسکتا ہے۔ امریکہ کی خارجہ پالیسی اور اس کے ظالمانہ رویوں پر ولیم اپیل مین ولیمز، نوم چومسکی، مائیکل پیرنٹی، ایڈورڈ سعید، گورے وائڈل، اور سیمور ہرش اور دوسرے لوگوں نے بڑی تنقید کی مگر اس پالیسی میں کسی قسم کی ذرہ بھر تبدیلی نہیں آئی۔ تاہم ان کی موجودگی اور اختلاف کے حوالے سے انہی کے امریکی ناقد ین یہ ثابت کرتے ہیں کہ امریکہ میں آزادی اظہار کی کتنی آزادی ہے۔ مخالف نکتہ نظر کو برداشت کیا جاتا ہے اور معاشرہ کو بحث مباحثہ کی لگن ہے۔ مگر جب ملوسیوک کا معاملہ ہیگ (عدالت انصاف) سے آگے بہت دور چلا گیا تو پھر خال خال ہی سہی ایک پکار ہوئی کہ ہنری کیسنگر اور رابرٹ میکنا مارا کے جنگی جرائم کے سامنے میلوسیوک تو ایک عام سا قاتل نظر آتا ہے اس لیے ان دونوں (کیسنگر اور میکنامارا) پر جنگی جرائم کے الزام میں اسی سطح پر مقدمے چلائے جائیں۔ (۱۶) مگر کسنگر کو بڑا تدبیر ساز اور بزرگ مدبر سمجھا جاتا ہے اور خود اس سے میلوسیوک کے بارے میں رائے طلب کی گئی تھی۔

امریکہ تاریخ میں قومی ریاست کی ایسی قدر آور مثال ہے جو دنیا کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوگیا ہے کہ وہ آزادیوں کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ جبکہ یہ ملک اپنے جابرانہ رویے میں مذہبی خضوع وخشوع کے ساتھ تسلسل قائم رکھے ہوئے ہے اور جبر وہ خود اپنی آبادی کے ایک حصے پر کرتا رہا ہے۔ امریکہ کی آزادی کے تصور اور سیاسی نظام کا یہ ایک تمسخرانہ پہلو ہے جو کلیت پسند جمہوریت کی صنعت تضاد کا جواز فراہم کرتا ہے۔ اس وقت امریکہ میں دوسرے تمام ملکوں کے مقابلے میں قیدیوں کی تعداد زیادہ ہے یعنی ایک لاکھ کے پیچھے 690 افراد قیدی ہیں۔ یہ تعداد روس اور جنوبی افریقہ کے قیدیوں سے بھی زیادہ ہے۔ (۱۷) دنیا کے ایسے ممالک کو جو آزاد نہیں یا جہاں جمہوریت نہیں امریکہ انہیں جمہوریت رائج کرنے پر مائل کرتا رہتا ہے۔ فریڈم ہاؤس ایک ادارہ ہے جو مختلف قوموں کی جمہوری کیفیت کے حوالے سے ان کا مقام (رتبہ) متعین کرتا رہتا ہے۔ یہ ادارہ ایسا نادر سا لگتا ہے جیسے ابھی ابھی ہکسلے کی بریو نیو ورلڈ کے صفحات سے نکل کر سیدھا یہاں آیا ہو۔ یہ ادارہ جن ممالک میں جمہوری اقدار کی کیفیت کو کمزور پاتا ہے امریکہ انہیں مزید جمہوریت

پر مائل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسری طرف امریکہ کی خاصی بڑی آبادی یعنی افریقی امریکیوں نے طویل جدوجہد کے بعد ووٹ کا حق 1964 میں حاصل کیا تھا۔ ان افریقی امریکیوں کی آبادی کے خاصے بڑے حصے کو ایک بار پھر تاحیات ووٹ کے حق سے محروم کر دیا گیا ہے۔ امریکہ کی صرف دو ریاستوں میں قیدیوں کو ووٹ کا حق حاصل ہے۔ مگر آٹھ ریاستوں میں قیدیوں یا سزا یافتہ افراد کو تاحیات حق سے محروم کر دیا گیا ہے۔ مزید پانچ ریاستوں میں اکثر سزا یافتگان کو ووٹ کے حق سے محروم کر دیا گیا۔ کالوں کی اس محرومی کا اصل معاملہ یہ ہے کہ امریکہ میں زیادہ تر کالے ہی سزا یافتہ ہوتے ہیں اور سات ریاستوں میں چار کالوں کے پیچھے ایک کالا ووٹ کے حق سے تاحیات محروم ہے۔ اس وقت پورے امریکہ میں تیرہ فیصد کالے ووٹ کے حق سے محروم ہیں۔ یعنی قومی اوسط سے سات گنا زائد (۱۸)۔ جیلوں میں پڑے ان لوگوں سے نہ صرف ان کی زندگی چھین لی جاتی ہے بلکہ انہیں ٹیلی فون کمپنیاں بھی لوٹتی رہتی ہیں۔ ان قیدیوں سے فی الحال عام شہریوں کے مقابلے میں کئی گنا زائد پیسے وصول کیے جاتے ہیں اور جیلوں میں بڑا زبردست منافع بخش کاروبار ہو سکتا ہے۔ (۱۹)

امریکہ میں غالباً سب سے زیادہ بدقسمت یہی افریقی کالے ہیں اس لیے کہ امریکی عدلیہ کا نزلہ بھی انہی کالوں پر گرتا ہے۔ جو جیل جانے سے بچ جاتے ہیں نہیں فوج میں بھرتی کر کے دوسرے ممالک میں امریکی ظلم وستم توڑنے کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ ثبوت یہ ہے کہ آبادی کے تناسب کے اعتبار سے ان کی فوج میں موجودگی بہت زیادہ ہے۔ ویت نام اور لاؤس کے کسانوں، مرکزی امریکہ میں پھلوں کے کاشتکاروں فلپائن میں چاول کے کاشتکاروں دنیا بھر کے سامراج دشمن کارکنوں، سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں ان سب پر امریکی فوجیوں نے ستم توڑے ہیں اور تاریخ کا یہ دور تو خاصی حد تک ریکارڈ بھی ہو چکا ہے۔ یہ دستاویزی ثبوت بھی بہت ہیں اس کے ساتھ ساتھ افریقی امریکیوں ۔امریکہ کے قدیم باشندوں اور دوسرے گروہوں نے بھی امریکی تاریخ کی برتری کو کھل کر مسترد کرنا شروع کر دیا ہے۔ خارجہ پالیسی میں امریکہ کا گھمنڈی پن اسے برابر نقصان پہنچا رہا ہے۔ امریکہ نے ایک لحہ کے لیے بھی رک کر اپنی لغزش پر نظر نہیں ڈالی کہ یہ وہ واحد ملک ہے جس نے ایٹمی ہتھیار استعمال کیا اور اس کے حق میں سب سے بڑی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اس طرح بہت سی جانوں کو بچالیا گیا تھا۔ اس دلیل کے جھوٹے سچے ہونے سے قطع تعلق امریکہ کے

پاس انسانی زندگی کا اپنا ہی تصور ہے یعنی جو زندگیاں بچائی گئیں وہ امریکی تھیں۔ اور امریکہ کے نزدیک انسانی وجود کو ماپنے کا یہی پیمانہ ہے۔ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹمی بم پھینکنے کے پس منظر میں دو متحرک تصور تھے جن کی نوعیت الگ الگ تھی اور یہ دونوں تصور 1990 کی دہائی میں امریکی بالادستی کا بھرپور اظہار بن گئے۔ یعنی غیر ایٹمی ایٹمیت اور بدمعاش ریاستیں۔

غیر ایٹمی ایٹمیت

ہر چند ایٹمی ہتھیار ایک آدھ دن کے وقفے سے صرف دوبار استعمال ہوا ہے مگر سرد جنگ کے سارے زمانے میں اس کی تلوار دنیا پر لٹکتی رہی۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ امریکہ نے 1945 میں ایٹمی ہتھیار تیار کرنے اور ایٹمی اسلحہ کے ذخیرہ پر پانچ ہزار بلین ڈالر خرچ کیے تھے۔ (۲۱) (ڈالر کی مالیت وہی تھی جو 1996 میں تھی) ایٹمی جنگ کی تیاریوں میں مختلف ذخیرہ الفاظ اور اصطلاحات بھی بنائیں گئیں مثلاً ''ایٹمی ڈراوا'' ایٹمی حفاظت خانے، تباہی کی باہمی ضمانت وغیرہ وغیرہ۔ بالکل اسی قسم کی ذہنیت کا مظاہرہ ہندوستان اور پاکستان نے کیا۔ امریکہ کے بہت سے ماہرین کے علاوہ برصغیر کے بعض دانشوروں کا بھی خیال ہے کہ ایٹمی لڑائی کا بڑا خدشہ برصغیر میں ہی ہے گزشتہ چند سالوں سے ان ماہرین نے ایٹمی دہشت گردی کی بھی باتیں شروع کر دی ہیں۔ انہیں یہ خدشہ جنونیوں (خصوصاً مسلمان جنونیوں) اور بے مہار سیاسی طالع آزماؤں سے ہے اور یہ بھی کہ کچھ ملکوں خصوصاً عراق اور ایران کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ایٹمی دہشت گردی کی سرپرستی کے اہل ہو سکتے ہیں۔ روس کے ٹوٹنے کے سبب تین اور ملک ایٹمی طاقتیں بن گئے۔ یہ ہیں یوکرین بیلاروس اور قازقستان اس وجہ سے امریکی پالیسی سازوں کے دماغوں میں طرح طرح کے خطروں نے جنم لے لیا مثلاً یہ کہ ایٹمی اسلحہ ان ملکوں کو فروخت کیا جائے گا یا بنانے میں مدد دی جائے گی جو مطلق العنان ملکوں اور بدمعاش ملکوں کی فہرست میں آتے ہیں۔ امریکہ میں سب سے بڑا مفروضہ یا خوف جو ذہنوں میں موجود ہے وہ یہ ہے کہ ایٹمی ہتھیار جب بھی استعمال کیا گیا یہ امریکہ کے خلاف ہوگا یا اس کے دوستوں خصوصاً اسرائیل کے خلاف ایٹمی دہشت گردی ہوگی۔ تاہم لازم ہے کہ یہ بات یاد رکھی جائے کہ یہ امریکہ تھا جس نے ہیروشیما اور ناگاساکی کو آگ میں جھلسا دیا تاکہ جاپان کو دہشت زدہ کر کے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا جائے۔ یہ بات بھی ریکارڈ پر ہے کہ امریکہ نے ہی ویت نام اور کوریا کی جنگوں

میں ایٹمی ہتھیار استعمال کرنے کا سوچا تھا۔ دنیا بھر میں سب سے زیادہ ایٹمی اسلحہ امریکہ کے پاس ہے اور امریکی ہی سے سب کو ایٹمی خطرہ ہے۔ امریکہ کے صدر ٹرومین نے ہیروشیما کی تباہی کی خبر سن کر بے حیا مسرت کا اظہار کیا تھا۔ ''یہ تاریخ میں سب سے بڑا کام ہوا'' اس جملے سے ہی اندازہ لگایا جا سکتا کہ امریکہ کو ایٹم سے کس قدر محبت ہے (۲۲) سوال یہ ہے کہ کون کس کو دہشت زدہ کرتا ہے؟

اب ایٹمی جنگ سے اس قسم کی رسوائی اور بدنامی وابستہ ہوگئی ہے۔ بہر طور یہ سوچنا کوئی دانائی نہیں کہ ایٹمیت کا معاملہ صرف اس کے استعمال، تنصیب اور ایٹمی ہتھیاروں تک ہی محدود ہے۔ ہیروشیما اور ناگاساکی پر حملہ سے پہلے کئی ہفتے، مہینے جاپان پر روایتی ہتھیاروں اور بموں کے حملے ہوتے رہے۔ یہ معاملہ دراصل پیش لفظ ہے 1990 کی دہائی میں سامنے آنے والے غیر ایٹمی ایٹمیت کا حالانکہ اس پہلو کو بہت دیر نظر انداز کیا گیا۔
دوسری جنگ عظیم میں ہٹلر نے برطانیہ پر اندھا دھند بمباری کی جس کے جواب میں اگرچہ برطانیہ نے جرمن سویلین آبادی کو دہشت زدہ کرنے کے لیے بمباری کی لیکن امریکہ نے بار بار یہ کہا کہ اس نے شہری علاقوں پر بمباری نہیں کی لیکن فروی 1945 میں امریکی وزیر جنگ ہنری سٹمسن نے ایک کانفرنس میں تصدیق کی کہ ''ہماری کبھی بھی یہ پالیسی نہیں رہی کہ شہری آبادی کو دہشت زدہ کرنے کے لیے ان پر بمباری کی جائے۔ (۲۳) لیکن جب جاپان سے واسطہ پڑا تو یہ پالیسی ترک کر دی گئی اور 10 مارچ 1945 کو ٹوکیو پر تین گھنٹے مسلسل بمباری میں ایک لاکھ پچیس ہزار سویلین مارے گئے اور ٹوکیو شہر کا چالیس فی صد حصہ تباہ ہوگیا۔ اتنی اموات تو ناگاساکی اور ہیروشیما پر ایٹمی بمباری سے بھی نہیں ہوئی تھیں ۔ پھر ٹوکیو اور دوسرے شہروں میں مسلسل تین دن بمباری ہوئی جس میں تین لاکھ افراد مارے گئے۔ یعنی یہ اموات ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹمی حملے سے ہونے والی کل اموات سے بھی دوگنا زیادہ تھیں (۲۴) جن امریکی ماہروں نے ٹوکیو پر آتش گیر حملے کروائے جس سے چاروں طرف آگ لگ گئی ان ماہروں کا کہنا تھا کہ ان بموں کا نشانہ بننے والے 'جھلسائے گئے، پھر ابالے گئے اور پھر پکائے گئے'' گرمی اتنی شدید تھی کہ رگوں میں پانی ابلنے لگا۔ دھاتیں پگھلنے لگیں اور عمارتیں اور انسان ایک دم آگ کے شعلے بن گئے۔ (۲۵)

پھر حد سے اتنا تجاوز کر گئے کہ انہوں نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر مہلک ایٹمی بم چلانے کا فیصلہ کر لیا۔ یعنی بیک وقت بے انتہا اموات اور پھر موت کے بھی نئے نئے

ہولناک مناظر۔ ایک طرف ایک موت نے ایک پل میں انسانوں کو تلف کر دیا اور دوسری موت نے تابکاری کی صورت میں اپنے شکار کو ناکارہ مگر گھٹ گھٹ کر اور سالوں پر پھیلے مہلک عمل کے ذریعے مارا اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ پہلی والی بمباری سے دوسری والی بمباری کس قدر مختلف ہے۔ کسی کو بھی اس بات پر شک نہیں ہو سکتا کہ ایٹمی ہتھیار کے استعمال سے ایک دم نفسیاتی اور اخلاقی حدود کو توڑ دیا گیا تھا۔ لیکن اس زمانے کے امریکی مبصرین اور جنگی کاموں سے وابستہ امریکی مدبرین یہ اندازہ نہ کر سکے کہ دونوں قسم کی بمباری...... ایٹمی بمباری اور مہلک مگر روائتی بمباری...... میں کیا اور کس قدر فرق ہے۔ ٹوٹل وار کے مصنف نے لکھا ''سٹالن کی طرح زیادہ تر امریکیوں نے یہی سوچا کہ بس یہ ایک اور بڑا مہلک ہتھیار ہے۔ (۲۶) مگر ایک مختلف پس منظر کے حوالے سے دیکھیں تو یہ امتیاز یا فرق (دونوں بمباریوں) ڈالنے کی بھی وجہ ہے۔ ٹوکیو پر یکسار (کارپٹ) بمباری اور پھر ہیروشیما پر آگ کا نزول۔ دراصل اس احساس کی پیداوار تھے کہ جاپانیوں کا زندگی پر کوئی حق نہیں نہ کوئی دعوے۔ مگر ساری جنگ کے درمیان کسی بھی مرحلہ پر جرمنی کے بارے میں اس طرح نہیں سوچا گیا۔ جرمنی میں عسکریت پسندی کھلی نظر آ رہی تھی مگر جرمن لوگوں کا زندگی پر حق مانا جاتا رہا کسی نے جرمنوں کے مکمل صفایا کی کبھی بات نہیں کی یعنی وسیع سطح پر جرمن شہریوں کے اتلاف کی بات۔ دوسری طرف وار مین پاور کمشن کے چیئرمین پال میکنٹ نے علی الاعلان کہا ''میں جاپانیوں کے مکمل صفایا کرنے کے حق میں تھا۔ (۲۷) پھر 1990 کی دہائی میں امریکی بمباری نے ایک اور منحوس صورت اختیار کر لی، ایٹمی بمباری سے پرہیز کا یہ نتیجہ نکال لیا گیا ہے کہ اب روائتی بمباری پر کوئی بھی حد باقی نہیں ہے یعنی اندھا دھند اور من مرضی کے مطابق بمباری کا اجازت نامہ حاصل کر لیا گیا۔

تنقیدی نظر سے دیکھیں اور جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ غیر ایٹمی ایٹمیت کی موجودہ صورت میں ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کو روکنے والی حدود کہیں متعین ہی نہیں کی گئیں نہ انہیں تسلیم کیا گیا ہے۔ ایسی کیفیت کو یہ نام دیا جا سکتا ہے کہ اس وقت لوگوں میں دنیا کی پوری تباہی یا عدم وجود کا تصور ہے یعنی یہ تباہی بھی یک طرفہ طور پر ہو گی اور اس کے خلاف جوابی کارروائی کی کوئی گنجائش تک باقی نہیں رہے گی۔ اگر امریکہ کو یہ یقین ہوتا کہ جاپان جوابی کارروائی کرنے کے اہل ہے تو ایسی صورت میں امریکہ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ہرگز ایٹم بم نہ

گراتا۔ امریکہ کا یہی بزدلانہ رویہ عراق اور یوگوسلاویہ پر بمباری میں جھلکتا ہے۔ گویا ہمارے زمانے میں "بدمعاش ریاستوں" کے خلاف اس قسم کے جنگی حربوں کو انسانی جنگی حربے قرار دیا جا رہا ہے۔

بدمعاش ملک

رونلڈ ریگن نے "بدی کی سلطنت" کی اصطلاح کو عام کیا تھا، مگر 1990 کی دہائی میں سیاسی لغات میں "بدمعاش ملکوں" کی اصطلاح پکی پکی شامل کر لی گئی۔ ایک عالم نے اس لفظ اور اصطلاح کے بارے میں جو تحقیق کی ہے اس کے مطابق بدمعاش نظریہ یا اصول کو پہلی بار 1985 میں ریگن نے اپنی تقریروں میں استعمال کیا۔ اس زمانے کی بات ہے جب ریگن کے نزدیک کچھ "اشتہاری (مجرم) ملکوں کی کنفیڈریشن" نے ان گروہوں کو سیاسی اور مالی امداد دی تھی جنھوں نے امریکہ اور دوسرے ممالک میں موجود امریکیوں کے خلاف دہشت گردی کی تھی۔ ریگن کے جانشین بش سینئر نے یہ زبان اور محاورہ کثرت سے استعمال کیا کیونکہ تب روس ٹوٹنے کے بعد جب ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کا خطرہ اور بڑھ گیا تھا۔ امریکہ کے ایک وزیر جیمز بیکر نے سینٹ کی خارجہ امور کی کمیٹی کے سامنے 1989 میں کہا تھا۔ "کیمیاوی جنگی ہتھیار اور بلاسٹک میزائلز ایسی حکومتوں اور گروہوں کے ہاتھ لگ گئے ہیں جو جارحیت اور دہشت گردی کے مرتکب رہے ہیں اور اس سلسلے میں ان کا ریکارڈ بھی موجود ہے (۲۹) امریکہ نے کچھ دیر تک امریکہ سے عناد رکھنے والے ممالک کو بدمعاش ممالک ہی گردانا۔ مگر سب سے بڑا عدو "بدی کی سلطنت" تھی اور وہ امریکہ کے لیے ایک ٹھوس دھمکی نظر آتی تھی کہ روس کے بکھرنے کا عمل شروع ہوا اور صدام حسین نے کویت پر حملہ کر دیا۔ اس طرح امریکہ کو بہانہ ہاتھ آ گیا کہ وہ بدمعاش ملک کی اصطلاح کو کوئی قابل شناخت شکل دے دے۔ کویت پر صدام حسین کے قبضے کے چند روز بعد رپورٹروں سے باتیں کرتے ہوئے بش نے صدام حسین اور ان جیسوں کو عالمی اشتہاری مجرم قرار دیا (۳۰) اس کے کچھ عرصہ بعد کلنٹن کے قومی سلامتی کے مشیر انتھونی لیک نے انہیں رجعت پسند ممالک (پچھل پیرے) کہا۔ یہ الفاظ یا اصطلاحات ایسے ممالک کے لیے استعمال ہوئیں جنہیں باقی دنیا سے کچھ پرخاش تھی۔

بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ امریکہ نے ''بدمعاش ممالک'' کا لفظ ضرورت سے زیادہ مرتبہ استعمال کیا ہے کہ اب یوں لگتا ہے کہ اس کے استعمال سے متعلقہ ملک کا تو اتنا نقصان نہیں ہوگا البتہ امریکہ کو زیادہ نقصان ہوگا (۳۲) جب ایک ملک کو بدمعاش ملک کہا جاتا ہے جیسے ایران کو تو پھر اس سے گفتگو (مکالمہ) مشکل ہو جاتی ہے۔ لفظوں کی اس تعبیر میں یہ بھی مضمر ہے کہ ایک زمانے میں جو ملک بدمعاش رہا وہ اپنی اصلاح بھی کر سکتا ہے۔ تاہم نام رکھنے کی اس سیاست کے بارے میں سوال نہیں اٹھایا جا سکتا۔ نہ ہی اس طاقت کے بارے میں جو کچھ ممالک کو یہ حق دیتی ہے کہ وہ دوسروں کو بدمعاش کہہ دیں اور پھر ان کے پاس یہ طاقت بھی ہو کہ وہ ان ملکوں سے بھی منوا لیں کہ وہ واقعی بدمعاش ملک ہیں۔ نام رکھنا کوئی معمولی بات نہیں۔ نام رکھنے کا مطلب ہے کوئی صورت گری کرنا، شامل کرنا یا خارج کرنا، شناخت بنانا یا خراب کرنا۔ اس کا مطلب ہے کہ کسی کو کوئی مراعات دینا یا مراعات دینے سے انکار کرنا۔ بے شمار ممالک نے اکثر چاہا ہے کہ امریکہ کو ایک انتہائی بدمعاش ملک قرار دیا جائے کیونکہ اس نے لاتعداد مرتبہ عالمی قانون کی خلاف ورزی کی اور سول آبادی کے خلاف غیر اعلانیہ جنگیں کی ہیں۔ مگر عالمی ذرائع ابلاغ پر امریکی کارٹلوں کا قبضہ ہے اس لیے ان ممالک کی وہاں آواز نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ کوئی حادثہ یا اتفاق بھی نہیں ہے اور اب ضرورت پڑ گئی ہے کہ بدمعاش ملک کی اصطلاح کا تجزیہ کرتے ہوئے دیکھا جائے کہ کیا غلبہ پانے اور بالادستی قائم کرنے والے بھی بدمعاش ممالک ہیں اور یہ کہ کیا بدمعاش ممالک روس کے جانشین بن چکے ہیں اور اینگلو امریکی دنیا کے سیاسی .... تصور میں مشرقی بلاک کے ممالک... بدمعاش ملک ہیں۔ چرچل کی آہنی پردے والی تقریر کی پچاسویں سالگرہ پر بیرنس تھیچر نے تقریر کرتے ہوئے مغرب کو متنبہ کیا تھا کہ بدمعاش ممالک پر پاگل' مسلمہ انسانیت دشمن' مردان آہن یا کمزور' غیر مستحکم یا ناجائز حاکم مسلط ہیں۔ ایک زمانے میں انہیں سوویت یونین نے قابو کر رکھا تھا مگر اب وہ مغربی ممالک کے صدر مقامات کو تباہ کرنے کی نیت سے وسیع تباہی کے ہتھیار حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ (۳۳)

اگر قومیں اور عوام کسی حد تک اپنے دوستوں کے ذریعے پہچانے جاتے ہیں تو پھر ہمارے عہد میں امریکہ بہت بڑا بدمعاش ملک ہے۔ بہت سے ظالم مضبوط مرد امریکہ کے پالے، دوست اور اتحادی تھے۔ اس وقت تک جب تک ان کی افادیت باقی نہ رہی۔

میئول توریگا کو سی ائی اے اقتدار میں لایا تھا: صدام حسین کے بارے میں کہا گیا کہ وہ سیکولر ہے جو خمینی کی اسلامی بنیاد پرستی کا مقابلہ کرے گا یہاں تک کہ ایک عرصہ تک امریکی اور عراقی اپنی خفیہ رپورٹوں کا تبادلہ کیا کرتے تھے۔ طالبان جن دنوں صرف مجاہد تھے انہیں آزادی کے سپاہی کہہ کر قابل تعریف قرار دیا جاتا۔ ان طالبان کی سخت کوشی اور انفرادیت دراصل ابتدائی امریکیوں (یانکیز) کی یاد دلاتی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی وجوہ ہیں جن کی بنا پر بدمعاش ملک کے القاب کا اصل اطلاق اس کے خالق پر ہوتا ہے (۳۴) لفظ بدمعاش کے اشتقاق اور معانی کو دیکھیں تو ان معنوں میں صرف آوارہ اور غنڈہ اور حیلہ ساز ہی نہیں وہ بھی آتے ہیں جو متکبر ہو چکے ہیں۔ امریکہ نے جو موقف اختیار کر لیا ہے وہ بہت سے اہم عالمی معاہدوں کا ہرگز پابند نہیں ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ گلوبل وارمنگ کے سلسلے میں کیوٹو پروٹوکول کی توثیق پر امریکہ رضامند نہیں ہے۔ اسی طرح امریکی کانگریس نے کامپر یہنسو بین ٹریٹی (سی ٹی بی ٹی ایٹمی تجربوں وغیرہ پر پابندی) کی توثیق کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن بدمعاشی کی صفات تو ان معاہدوں سے بھی آگے کی ہیں جہاں تک سی ٹی بی ٹی کا تعلق ہے وہاں امریکہ اکیلا نہیں، اس وقت پاکستان اور اسرائیل نے بھی اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ ایک بین الاقوامی فوجی عدالت قائم کرنے کی تجویز کی مخالفت میں امریکہ، چین، شام اور عراق کی صف میں شامل ہو گیا۔ وہ بدمعاش ممالک جن میں انتہائی قابل ملامت سیاسی نظام ہے اور امریکہ دونوں کچھ اور بین الاقوامی فرائض سے بھی انکاری ہیں۔

☆ معاہدہ بحر کا قانون

☆ عورتوں کے خلاف ہر نوع کے امتیازات کے خاتمے کا معاہدہ

☆ بچے کے حقوق کے بارے میں کنونیشن

☆ بارودی سرنگوں پر پابندی کا (اٹاوہ والا) معاہدہ

ان معاہدوں پر امریکی معترضین کے دلائل یہ ہیں کہ ان معاہدوں سے اقوام متحدہ کی خود مختاری کی تصدیق ہوتی ہے۔ یا یہ کہ اس طرح امریکی قوانین کے مقابلے میں بین الاقوامی قانون کو فوقیت حاصل ہو جائے گی یا یہ کہ اس طرح امریکہ مفادات پر زد پڑے گی۔ ایک اور بودا قسم کا موقف جو بار بار پیش کیا جاتا ہے یہ ہے کہ ان معاہدوں (مقاصد) کی تو انسانی حقوق کے عالمی منشور میں ضمانت موجود ہے اور اس دستاویز میں تو معاملہ خاصا جامع ہے اور اس کے

لیے حکومتوں کو مجاز بنانا پڑے گا کہ وہ اس قسم کے معاہدوں پر دستخط کر سکیں۔ امریکی آئین میں تو پہلے ہی بڑا واضح موقف موجود ہے کہ حکومت اس حد تک جانے کی مجاز ہے اس سے آگے نہیں۔ انسانی حقوق کے عالمی اعلان کی مخالفت کے بارے میں ہمیں بتایا جاتا ہے کہ اس کا ایک دستخط کنندہ جوزف سٹالن ہے۔ کیونکہ تاہم اس معاملہ کو زیادہ پھیلایا نہیں گیا یعنی اسے منطقی انجام تک نہیں پہنچایا گیا اور وہ یہ ہے کہ کیونکہ بدمعاش اور آمر ملکوں میں سے کئی ایک نے لاتعداد عالمی معاہدوں پر دستخط کیے ہیں تو کیا پھر امریکہ کو ان معاہدوں میں سے بھی باہر نکل آنا چاہیے؟ (۵) چنانچہ بندہ یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہے کہ امریکی افکار میں ایک شدید قسم کی کشمکش ہے ایک طرف امریکہ کی خلوت پسندی کی شدید خواہش ہے، دوسری طرف اسے باقی ماندہ واحد عالمی طاقت (سپر پاور) کی حیثیت سے دنیا بھر کے معاملات میں شریک یا ملوث ہونے کا بھی اشتیاق ہے... تاہم زیادہ دلکش خیال یہ ہے کہ آخر کار تمام بدمعاش ملک اکٹھے ہو جائیں گے۔

قومیں۔ اتحاد سے دور۔ حجری عہد کی سیاسیات

اقوام متحدہ کی تاریخ عموماً اس کی پیشرو تنظیم لیگ آف نیشنز سے شروع کی جاتی ہے۔ یہ بات یقیناً قابل فہم ہے کہ لیگ کے بنانے والوں کے ذہن میں پہلا مقصد جنگ کی روک تھام تھا۔ لیگ آف نیشنز پہلی جنگ عظیم کے فوراً بعد بنائی گئی تھی۔ لیگ کے رکن ممالک اس بات پر متفق تھے کہ ایک دوسرے کی خودمختاری کا احترام کریں گے، باہمی تنازعوں کو مل کر حل کرنے کے لیے مختلف قسم کا نظام وضع کیا جائے گا اور سب ملک اجتماعی سلامتی کا معاہدہ کریں گے۔ ان جیسے معاملات اور لیگ کی طرف سے خلاف ورزی کرنے والے ملک کے خلاف پابندیاں لگانے کے جو اختیارات وضع کیے گئے وہی آگے چل کر اقوام متحدہ کے منشور میں شامل ہوئے۔ لیگ کو ابتدائی ایام میں کچھ کامیابیاں بھی ہوئیں اس کے زیر اہتمام سیلیس (سسلی) میں استصواب رائے ہوا۔ بلغاریہ اور یونان کے سرحدی تنازعہ کو طے کیا گیا۔ اسی طرح پولینڈ اور لیتھونیا کا جھگڑا مٹایا گیا۔ مگر مؤثر سیاسی تنظیم کے طور پر لیگ کے وجود کو اس وقت خطرہ لاحق ہوا جب حبشہ پر اٹلی کے مسولینی کے حملے کو روکنے کے لیے کچھ نہیں کیا گیا اور منچوریا پر جاپان کے حملے کو لیگ نہ روک سکی نہ اس کی مذمت کر سکی۔ لیگ کی کمزوریوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا

گیا ہے۔ اگست 1941 میں چرچل اور روز ویلٹ کی ملاقات میں معاشی اور سلامتی کے معاملات پر منشور بحراوقیانوس (اٹلانٹک چارٹر) طے پایا اور اسی معاہدہ سے اقوام متحدہ نے وجود پایا۔ اقوام متحدہ کے بانیوں نے (لیگ آف نیشنز کے انجام کے حوالے سے) پختہ ارادہ کرلیا کہ نئے ادارے کو غیر مؤثر بنانے کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا جائے گا۔

اقوام متحدہ کا منشور 1944 میں بنایا گیا اور اس میں لکھا گیا کہ صرف امن سے محبت کرنے والے ملکوں کو اس کی رکنیت دی جائے گی (باب دوئم، دفعہ 4.1) ویسٹ فیلئن کی خودمختاری کے تصور کے مطابق اقوام متحدہ اور جنرل اسمبلی میں بھی یہ تصور رکھا گیا۔ جنرل اسمبلی کے بارے میں میں پہلے بھی کہہ آیا ہوں کہ اس میں ایک ملک ایک ووٹ کا اصول رکھا گیا ہے۔ منشور و چارٹر میں واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ تمام رکن ممالک کی حیثیت مساوی اور خودمختارانہ ہوگی۔ (باب اول دفعہ 2.1) تاہم قابل غور بات یہ ہے کہ اقوام متحدہ کا رکن خودمختار بھی ہے اور برابر بھی اس حوالے سے کسی دوسرے حصے میں یہ اصول نہیں رکھا گیا۔ مثلاً باب پنجم کے تحت سلامتی کونسل کے مستقل رکن بنائے گئے۔ امریکہ، برطانیہ، چین، فرانس اور سوویت یونین انہی پانچ ممالک کو سلامتی کونسل کے اصل اختیارات حاصل ہیں اور دفعہ 27.1 میں وضع کردہ اصول کے بارے میں کہا گیا ہے۔ ''سلامتی کونسل کے ہر رکن کا صرف ایک ووٹ ہوگا''۔ یہ سراسر غلط اور گمراہ کن بات ہے کیونکہ اس شق کی موجودگی کے باعث ایک دوسری بات پس پشت چلی گئی ہے اور وہ یہ کہ استرداد (ویٹو) کا اختیار صرف پانچ مستقل ارکان کو دیا گیا ہے۔ یعنی سارے ووٹ برابر نہیں ہیں۔ سرد جنگ کے زمانے میں اس میں 121 مرتبہ اپنے اپنے ویٹو اختیارات استعمال کیے گئے۔ امریکہ نے 72 مرتبہ۔ چین امریکہ نکاراگوا اور السلویڈور میں ملوث ہوا۔ سوویت، روس نے افغانستان پر قبضہ کرلیا، چین نے تبت پر یلغار کی مگر ان سب کے بارے میں سلامتی کونسل کوئی بھی قابل عمل قرارداد منظور نہ کرسکی۔ (۳۶)

چنانچہ اپنے قیام سے ہی اقوام متحدہ میں حجری عہد کی سیاست کے دو ر رجحان در آئے۔ پہلا یہ کہ قومی ریاست کسی ملک کی بہترین نمائندہ ہوتی ہے اور دوسرے یہ کہ سیاسی یافت یا حاصل میں قومی ریاست ہی بلند ترین مقام پر فائز ہے۔ 1648 میں ولیٹ فیلیا میں ایک امن معاہدہ ہوا تھا جس کے ذریعے تیس سالہ جنگ ختم ہوئی تھی جس کے ذریعے مندرجہ ذیل امور کو جائز قرار دیا گیا۔ قومی ریاست کی خودمختاری یعنی صرف قومی ریاست ہی

خود مختار ہوتی ہے۔ اور تب سے یہ معاہدہ ہر جگہ ہر موقع پر امن دشمن ثابت ہوتا رہا ہے۔ آج بھی یہی تصور رائج ہے۔ اس زمانے میں مذہبی دہشت گردی نے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور تقریباً اسی زمانے میں ''جدید سائنس'' بھی اپنی بنیاد پرستی نافذ کرنے لگی تھی۔ قومی ریاست کی بنا پر اپنے وجود کو حتمی اور یقینی بنایا گیا۔ قومی ریاست کے بارے میں خیال کیا گیا کہ یہ انسانی خواہشات کی فطری تکمیل کا نام ہے۔ اس کے ذریعے ہی ملک کی علاقائی حدود لوگوں کی ثقافت اور سماجی زندگی کا تعین ہوتا ہے۔ اب کوئی سیاسی طاقت یا قیادت ملک سے ہٹ کر غیر ملکی مشاورت نہیں چاہے گی۔ غیر ملکی مشاورت سے مطلب ہے کہ یورپ کا مشورہ یا ملکی حدود سے باہر واقع کسی سلطنت کی طرف سے دیا جانے والا مشورہ۔ قومی ریاست میں ہی یہ تصور بھی پنہاں تھا کہ کسی دوسری ریاست یا ریاستوں کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی اور ریاست کے اندرونی معاملات میں مداخلت کریں۔ ان بین الاقوامی قوانین کے بنیادی اصول ولندیزی عالم ہیوگو گروٹس نے پہلے ہی طے کر دیے تھے۔ یہ تعجب کی بات نہیں کہ قومی ریاست نے اس میں مطلق خود مختاری کا تصور بھی شامل کر لیا۔ تاہم بعد کے معاملات کچھ اور ہی قصہ بتاتے ہیں۔ یورپی سامراج کی تاریخ سے اندازہ ہوتا ہے کہ قومی ریاست کا تصور یورپ کی حدود سے باہر دیکھنے میں نہیں آیا اور یورپی حکمرانوں نے ایشیا، افریقہ اور دوسرے مقامات کے حاکموں کی خود مختاری کو ہرگز تسلیم نہیں کیا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ جب اقوام متحدہ کا منشور تیار کیا گیا تو اس میں ویسٹ فیلئن روائت کو واضح طور پر خراج پیش کیا گیا اور طریقہ یہ رکھا کہ ''اقوام متحدہ کو کسی ملک کے ان اندرونی معاملات میں دخل دینے کا حق نہیں جو کسی ریاست کے احاطہ اختیار میں آئے ہیں''
(باب اول دفعہ 2.7)

قومی ریاست اپنے تصور اور بقا اور انحصار کے لحاظ سے سیاسی زندگی کی معیاری شکل اختیار کر گئی اور اقوام متحدہ سیاسی افکار کے افلاس کا اظہار بنی۔ اقوام متحدہ کی بنیاد ہی عدم مساوات پر رکھی گئی۔ ایک طرف تو قومی ریاست نے جدید سیاسی زندگی میں ناگزیر لازمی شے کی حیثیت اختیار کر لی جبکہ دوسری طرف یہ فرض کر لیا گیا کہ زیادہ تر غیر یورپی ملکوں میں لوگوں کی سیاسی خواہشات کے مطابق نہ ہونے کے باعث قومی ریاست کا تصور تشنہ تکمیل رہے گا۔ در صل کسی ایسی ریاست کو جو آپ کی مرضی کے خلاف دوسرے راستے پر چلی گئی ہے پھر دھرے پر لانے کے لیے یہ مفروضہ استعمال کیا جاتا تھا یا یہ بہانہ بنایا جاتا

تھا۔ ملکوں کی خود مختاری مسلمہ تھی اسے چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا مگر چونکہ ''اندرونی احاطہ اختیار'' کی وضاحت نہیں کی گئی اس لیے کوسوو میں نیٹو کی بمباری جیسی اختراعات وضع کرنا ممکن ہو گیا۔ اس بمباری کا دفاع یہ کہہ کر کیا گیا کہ یہ انسانیت کے بچاؤ کے لیے کی گئی ہے۔ پھر نظم و ضبط کی نگرانی کی دعویدار حکومت نے خلیج میں جنگ کی ناکامی کے بعد عذاب کے دروازے عراق پر کھول دیے۔ چین نے تبت پر حملہ کے بارے میں مغربی طاقتوں یا اقوام متحدہ کی طرف سے کسی قسم کی مداخلت کی اجازت نہیں دی اور کہا کہ تبت چین کا بالکل اندرونی معاملہ ہے۔ مگر جب عراق نے کویت کے بارے میں یہ کہا کہ تاریخی طور پر کویت عراق کا حصہ ہے اور یہ اس کا اندرونی معاملہ ہے اور اس دلیل میں وزن بھی زیادہ تھا کہ نوآبادیات کو یک طرفہ طور پر تقسیم کرنے والی طاقتوں نے عراق کی بات نہیں سنی۔ انڈونیشیا نے دعویٰ کیا کہ مشرقی تیمر انڈونیشیا کا حصہ ہے اور اندرونی معاملہ ہے اور اگر تیمر کا معاملہ عالمی عدالت یا کسی اور جگہ اٹھایا گیا تو یہ انڈونیشیا کے بنیادی حق کی خلاف ورزی ہوگا، چونکہ اس وقت سوہارتو امریکہ کی کمیونسٹ مخالف مہم کا بڑا پرجوش اور وفادار ساتھی تھا اس لیے اس کی بات مان لی گئی۔

حجری عہد کی سیاست کا ایک خاص اصول یہ ہے کہ آخرکار طاقت ہی فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے (جس کی لاٹھی اس کی بھینس) آج تک کوئی بھی نسل اس اصول سے دستبردار نہیں ہوئی۔ مغرب کی طاقت پسند سیاست کے پہلے مفسر تھوسی ڈائڈائڈز نے کہا کہ ہیلنز نے یونانیوں سے جان بخشی کی ناکام اپیل کی۔ انہیں قتل عام سے بچایا جا سکتا تھا بشرطیکہ وہ یہ نکتہ سمجھ سکتے کہ لفظ حق صرف دو برابر کی طاقتوں میں بامعنی ہوتا ہے جبکہ طاقتور وہی کچھ کر سکتا ہے جو وہ کر سکتا ہے اور کمزور کو سہنا پڑتا ہے اور سہنا ہی چاہیے۔ (۳۷) صاف لگتا ہے کہ اقوام متحدہ کی طرف سے تمام اقوام کی برابر کی وکالت، انسانیت کے ماضی کی تاریخ میں اس طور اضافہ ہے کہ وہ بھی لیگ آف نیشنز کی طرح یورپ کے مستقبل کے بارے میں زیادہ فکر مندی کو ملکوں کی مکمل برابری کے وعظ میں چھپاتی ہے۔ ایک فاضل کا کہنا ہے کہ اقوام متحدہ نے ایک زندہ آگاہی کا ثبوت یہ دیا ہے کہ غیر یورپی ملکوں کی بڑھتی ہوئی اہمیت کے پیش نظر ان کو بھی عالمی معاملات میں مکمل نمائندگی دی ہے۔ یہ نیا نظام ایک ایسی دنیا کے مسائل کے بارے میں وضع کیا گیا ہے جس میں یورپ بری طرح سکڑ گیا ہوتا جبکہ ایشیا اور افریقہ بہت ہی قدر آور ہو گئے ہوتے۔ (۳۸) میں پہلے ہی کہہ آیا ہوں کہ اقوام متحدہ

کی جھوٹی سیاست بڑی جلدی سینے سے لگا لی گئی اور اسے اداراتی روپ یوں دیا گیا کہ نہ صرف سلامتی کونسل میں دو قسم کے رکن رکھے گئے مستقل اور عارضی اور وہ بھی گردشی اور پھر ان میں سے مستقل ارکان کو ویٹو کا حق بھی دے دیا گیا بلکہ ان ممالک کا اثر ورسوخ زیادہ مانا گیا جو عالمی بنک، آئی ایم ایف اور اقوام متحدہ کی دوسری تنظیموں کو کچھ دیتے رہتے ہیں۔آج کی بات نہیں دراصل یورپی طاقتوں نے شروع ہی سے اقوام متحدہ پر قبضہ جمار کھا ہے۔ جنرل اسمبلی کو صرف رسمی تقریروں کا پلیٹ فارم بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔(اسے اقوام متحدہ کی بجٹ سازی کا اختیار ہے) جس اہم زمانے میں کوریا کی جنگ شروع ہوئی اور اقوام متحدہ میں چین کی نمائندگی کی بات چلی ان دونوں یورپی ملکوں کو جنرل اسمبلی میں اکثریت حاصل تھی تو انہوں نے ایچسون معاہدہ کیا جس کے تحت سلامتی کونسل کے کچھ اختیارات جنرل اسمبلی کو دلوانا مقصود تھے۔ وجہ یہ کہ سلامتی کونسل میں روس ویٹو کا حق استعمال کر لیتا تھا مگر جب نوآبادیات کے خلاف جدوجہد تیز ہوگئی تو غیر جانبدار ملکوں کی تحریک بھی تیسرے فریق کی حیثیت سے اہمیت حاصل کرنے لگی تو یورپی طاقتوں کی جنرل اسمبلی میں پوزیشن اور حمائت کمزور ہونے لگ پڑی۔ چنانچہ یورپی ملکوں نے زور دینا شروع کیا کہ سلامتی کونسل سب سے مضبوط ادارہ ہونا چاہیے جسے امن قائم کرنے، سلامتی اور اس ضمن میں ضروری لوازمات کرنے کا خاص اختیار ہونا چاہیے۔(۳۹)

جو کوئی بھی ملکی اور علاقائی سیاست کا طالب علم ہے اسے عالمی امور میں سلامتی کونسل کے ابھرتے اور گھٹتے ادوار بھی یاد ہوں گے اور یہ بھی کہ امریکہ اور اس کے اتحادی اپنے مفادات کی خاطر کونسل کو زیادہ فیصلہ کن اہمیت دیتے اور اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتے رہے ہیں۔ روس کے ٹوٹنے کے بعد روس اور مشرق بلاک (یورپی) سرمایہ کاری اور قرضوں کے لیے مغرب کے محتاج ہوئے تو پھر سلامتی کونسل ایک سیاسی فریق بن کر ایسے فیصلے کرتی رہی جن کا ماضی میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ چنانچہ مابعد سرد جنگ کے زمانے میں سلامتی کونسل نے بڑے بڑے فیصلے کیے۔عراق کے خلاف کثیر القومی فوج کو لڑایا گیا، امریکہ نے دباؤ' دھمکی، رشوت، معاشی محرومی وغیرہ (۴۰) کے سارے حربے سلامتی کونسل کے زیر سایہ آزمائے۔ خلیج کی جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی عراق کے خلاف پابندیاں لگا دی گئیں اور حکم سلامتی کونسل نے دیا۔ سلامتی کونسل کی قرارداد 687 کے ذریعے عراق کے کیمیاوی' جرثومی اور ایٹمی اسلحے ضائع کرنے کا جائزہ لینے کے لیے یونائیٹڈ نیشنز سپیشل کمشن

بنایا گیا اور جنگ بندی کے 6 اپریل 1991 کے معاہدے پر عملدرآمد کے لیے بھی سلامتی کونسل کی طاقت استعمال کی گئی۔ بہر طور مغربی طاقتوں کا اعلان ہے کہ اقوام متحدہ کو عالمی حکمران ادارہ ضرور بنائیں گے چنانچہ دنیا کی اعلیٰ ترین سیاسی حکمرانی کا ادارہ اقوام متحدہ خصوصاً سلامتی کونسل کو بنایا جا رہا ہے لیکن مغربی طاقتوں نے اقوام متحدہ کو اس وقت نظر انداز کر دیا جب انہوں نے یوگوسلاویہ پر فضا سے بمباری کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یوگوسلاویہ اقوام متحدہ کے بانی ارکان میں سے ہے۔ اس طرح غیر جانبدار ملکوں کی تحریک کا بھی بانی رکن ہے اس نے دوسری جنگ عظیم کے دوران نازی ازم اور فاشزم کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اب یوگوسلاویہ سے عالمی برادری کی شرائط منوانے کے لیے بمباری کی جا رہی تھی۔

بعض ناقدین کی نظر میں کسی حد تک بجا طور پر سلامتی کونسل اپنی ذات میں قانون ہے۔ رویہ آمرانہ ہے اور جو اس کے رحم و کرم پر بھی ہیں ان کی بربادی اور بدقسمتی کا نصیب بھی۔ عراق کو کچھ ریلیف (امداد) دینے کے لیے تیل برائے خوراک پروگرام بنایا گیا، لیکن عراق کو اقوام متحدہ کی منظور کردہ قراردادوں کے حوالے سے کوئی رعایت نہیں دی گئی۔ اقوام متحدہ کے متعدد ملازمین کو اس پروگرام کی نگرانی کا کام سونپا گیا مگر ان میں سے اکثریت نے اس بنا پر استعفیٰ دے دیا کہ ان کی نظر میں یہ امدادی کام نہیں بلکہ امریکہ اور برطانیہ کی عراق کے بارے میں نسل کشی کی پالیسی کا حصہ ہے۔ (۴۱) اقوام متحدہ کے کمشن پر بھی اسی قسم کا الزام آئے جنہیں اس کے سابق سربراہ رچرڈ بٹلر نے جھٹلانے کی خفیف کوشش کی۔ الزام یہ بھی تھا کہ کمشن تفویض کردہ حدود کے اندر کام کرنے کی بجائے سی آئی اے کی طرف سے جاسوسی کا کام بھی کر رہا تھا۔ یہ سب کچھ اپنی جگہ لیکن اقوام متحدہ نے بعض شعبوں میں قابل تعریف کام بھی کیا ہے۔ خاص طور پر عورتوں کے حالات بہتر بنانے، دنیا میں صحت کی کیفیت بہتر بنانے اور بیماریوں کے علاج' پناہ گزینوں کے بارے میں کوائف کی فراہمی اور ان کو آباد کرنے کا اچھا کام کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے مختلف معاملات پر چوٹی کی کانفرنسوں کی سرپرستی بھی کی۔ مثلاً آب و ہوا کی تبدیلی، ماحولیاتی پالیسی، منشیات کی سمگلنگ، عورتوں کو بااختیار بنانے'' خوراک کی یقینی فراہمی، توانائی، پانی، بچوں کی مشقت اور اسی قسم کے ضروری معاملات پر مدد دی مگر سیاسی میدان میں اقوام متحدہ دو مختلف کارروائیوں میں خاص طور پر نمایاں نظر آئی۔ ان کارروائیوں پر بھی بڑی تنقید ہوتی ہے تاہم یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ عالمی امن اور استحکام کے سلسلے میں یہ اقوام متحدہ کا

زبردست کام ہے۔ 1990 کی دہائی میں اقوام متحدہ کی قائم کردہ امن کی فوج کا بڑا تذکرہ تھا اور اسی زمانے میں بدمعاش ملکوں کے خلاف پابندیاں بھی لگائی جانے لگیں۔ یہ ملک بدمعاش کم اور ضدی زیادہ تھے۔ لیکن بین الاقوامی سیاست میں اضافہ کیے گئے ان نئے خانوں کا اگر بغور جائزہ لیا جائے تو شائد ان کی مفروضہ اثر انگیزی اور اخلاقیات میں بھی شک اور جھول نظر آ جائے۔

قیام امن

امریکہ کے بارے میں اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ موت کا سوداگر ہے۔ اسے امن کے سوداگر کے طور پر کم ہی جانا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا لقب ہے جس سے کسی انجان کو یہ شک ہونے لگتا ہے کہ یہ قصیدہ ہے۔ امریکہ کئی دہائیوں تک اسلحہ فروخت کرنے اور نفع کمانے میں دنیا میں سب سے آگے تھا۔ 1994 سے 1998 تک امریکہ نے 53.9 ارب ڈالر کی اسلحے کی تجارت کی جو باقی پندرہ ملکوں کی کل تجارت سے بھی زیادہ مالیت کی ہے۔ (۴۲) اسی دورانیہ میں روس نے 12.3 ارب ڈالر، فرانس نے 10.6 ارب ڈالر، برطانیہ نے 8.9 ارب ڈالر اور چین نے 2.8 ارب ڈالر کا اسلحہ ناجائز طریقے سے فروخت کیا۔ یہ پانچوں سلامتی کونسل کے مستقل رکن ہیں جن کو دنیا نے اپنی سلامتی اور فلاح کا فرض سونپ رکھا ہے۔ اس زمانے میں دو بڑے خریدار تائیوان اور سعودی عرب تھے۔ تائیوان صرف چین کا نام لے کر امریکہ کے قانون ساز نمائندوں کی ہمدردیاں حاصل کرتا۔ سعودی عرب بادشاہی آمریت والا ملک ہے جو تیل میں تیراکی کا لطف اٹھاتا ہے اور دنیا میں سب سے زیادہ تیل پیدا کرنے والا ملک ہے۔ اتنی بھاری تعداد میں اسلحہ کی اس فروخت کے حق میں بھی بہت دلائل دیے گئے ہیں لیکن اس حقیقت کو چھپایا نہیں جا سکتا کہ دنیا میں جارحیت اور تشدد کو سب سے زیادہ امریکہ نے فروغ دیا۔ امریکی حکومت نے اسلحہ کارپوریشن کی طرف سے ہی یہ منافع بخش کاروبار کیا۔

یہ بات بھی برمحل ہوگی کہ اقوام متحدہ کی قیام امن کی فوج کے اخراجات کے لیے امریکہ کا مالی تعاون سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس فوج کا آغاز 1948 میں اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل اور ان کے سیکریٹریٹ نے کیا۔ اقوام متحدہ کے منشور میں تنازعات کو پرامن طور پر حل کرنے کی ایک شق ہے مگر قیام امن کے لیے فوج کے قیام کی کوئی شق نہیں۔ (گنجائش نہیں)

اس طرح نہ تو امریکہ اور نہ ہی روس نے یہ اجازت دی ہوگی کہ ان کے اتحادیوں یا زیر اثر ریاستوں میں یہ فوجی مداخلت کرتے پھریں چنانچہ مدعا یہ قرار پایا کہ فریقین کی رضامندی کے ساتھ غیر لڑاکا فوجی متعین کیے جاسکتے ہیں۔ بیسویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں بے شمار اہم بحرانوں اور کشاکش میں اقوام متحدہ کو ایک طرف کر دیا گیا۔1991 کے بعد اب تک اقوام متحدہ کی تاریخ میں 54 میں سے 36 آپریشن قیام امن کے تھے۔ سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد آپریشنوں کی تعداد آٹھ سے بڑھ کر اٹھارہ ہوگئی۔ بظاہر یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ سرد جنگ کے خاتمہ نے متشددانہ جھگڑوں کا خاتمہ ممکن بنا دیا ہے۔ (۴۳)

1991 میں قیام امن فوج کے اخراجات (بجٹ) چالیس کروڑ ڈالر تھے۔ دو سال بعد جب یہ کارروائیاں بڑھ گئیں یونوسوم دوئم، (صومالیہ میں کارروائی) ان پر وفور (سابق یوگوسلاویہ میں حفاظتی فوج) دونوں اپریشن بھر پور تھے تو خرچہ بڑھ کر ساڑھے تین ارب (3.6) ڈالر سے بھی زیادہ ہو گیا۔ بہر طور ان اخراجات کے بقایا جات ابھی امریکہ، روس، فرانس، جاپان اور چین کے ذمے ہیں۔ اسی طرح دوسرے ممالک کے ذمے بھی بقایا جات ہیں مگر سب سے زیادہ بقایا جات جو امریکہ کو اکتوبر 2000 میں ادا کرنے تھے، وہ ایک ارب اور چودہ سو کروڑ ڈالر تھے۔ جو ملک دنیا میں سب سے زیادہ اسلحہ فروخت کرتا ہے اگر وہی قیام امن فوج کے اخراجات میں اپنا حصہ ادا کرنے میں تامل کرے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ امریکہ نے ہر قسم کے ملک، آمرانہ، ڈکٹیٹرانہ، بادشاہی والے ان سب کو اسلحہ فروخت کیا یعنی اس ملک نے یہ کچھ کیا جس نے قسم اٹھا رکھی ہے کہ وہ تمام امتیازات کو ختم کرے گا۔ 1993 میں اقوام متحدہ کے مالی معاملات پر تیار ایک رپورٹ میں کہا گیا کہ اقوام متحدہ کے رکن ممالک اپنی افواج پر اگر ایک ہزار ڈالر خرچ کرتے ہیں تو اقوام متحدہ کی امن فوج پر صرف 10.40 ڈالر حصہ ڈالتے ہیں۔ امریکہ کے حصے میں جو رقم آتی تھی اس نے وہ بھی ابھی ادا نہیں کی۔ 1997 کے مالی سال میں اقوام متحدہ نے امریکہ کے ذمے بیالیس کروڑ پچاس لاکھ ڈالر لگائے تھے مگر امریکی کانگریس نے پینتیس کروڑ چوبیس لاکھ ڈالر کی منظوری دی۔ کانگریس کی مسلسل یہ کوشش رہی ہے کہ امریکہ کا حصہ کم کرتی جائے۔ روس کے ٹوٹنے کے بعد روس کا حصہ نئے سرے سے مقرر کیا گیا تو پھر اس ضمن میں امریکہ اور دوسرے ملکوں کے حصے میں معمولی اضافہ کیا گیا۔ امریکہ نے اس اضافے کا ذمہ دار روس کی شکست کو قرار دیا، امریکہ اسے افسوس ناک بھی کہتا ہے۔ (۴۵) اقوام متحدہ کی امن فوج کی صفت پھیل رہی ہے مگر امریکہ اس سے لاتعلقی ظاہر کرتا ہے۔

بعض مبصرین نے امریکہ اور یورپی اقوام کی اقوام متحدہ کی امن فوج سے لاتعلقی یا کم جوشی کا سبب صومالیہ کو بتایا ہے۔ انداز لگایا جا سکتا ہے کہ موگا دیشو میں جس طرح اٹھارہ امریکی سپاہیوں کو (جو اقوام متحدہ کی امن فوج میں تھے) مارا گیا اور پھر ان کی لاشیں گھسیٹی گئیں۔ یہ سارے مناظر پوری دنیا میں دکھائے گئے تو اس کے بعد امریکہ کا ارادہ پکا ہو گیا ہے کہ اس کے سپاہی میدان میں نہیں بھیجے جائیں گے۔ تاہم یہ بات بھلا دی جاتی ہے کہ امریکی فوجیوں پر حملے سے بھی پہلے امن فوج میں شامل تئیس پاکستانی فوجی، جنگ باز محمد فرح عدید کے ملیشیا نے مار دیے تھے اور یہ کہ 1993 میں بھی اموات غیر معمولی طور پر زیادہ (250 سے زائد) تھیں۔ نقصان صرف امریکیوں کا ہی نہیں ہوا تھا۔ عموماً امن فوج کے ہر سال اوسطاً پچاس آدمی مارے جاتے تھے اور ان میں کوئی بھی امریکی نہیں ہوتا۔ یونوسوم کو بھی دو مشکلات درپیش ہیں۔ ایک تو فیلڈ کمانڈروں اور سیکرٹری جنرل میں جھگڑا رہتا ہے۔ اس پر امریکہ کا یہ اصرار ہے کہ اس کے فوجیوں کو اقوام متحدہ کی کمان میں نہ دیا جائے۔ دوسرے اس کے بارے میں یہ بات ابھی لوگوں کے علم میں ہے کہ امریکہ یہ اپریشن ختم کرانا چاہتا ہے اور یہ کہ وہ امریکی فوجیوں کی ہلاکت برداشت نہیں کر سکتا۔ عدید نے اسے کھلا چیلنج سمجھ لیا اور بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اگر حملہ امریکی فوجیوں پر کیا جائے تو وہ جلدی ہی واپس چلے جائیں گے۔ (۴۶) صومالیہ میں امریکی سپاہیوں کی موت سے یہ مطلب اخذ کیا جا رہا ہے کہ صومالیہ میں انہیں بہت ہی تلخ تجربہ کرنا پڑا اور یہ حقیقت بھی دیکھنا پڑی کہ اقوام متحدہ نے یو این پارٹیسپیشن ایکٹ (1945 ترمیم پبلک لا 264-79) کے تحت غیر لڑاکا امن فوج میں امریکہ کے صرف ایک ہزار فوجی رکھے جا سکتے ہیں اور یہ کہ امن کے قیام کے لیے امریکی فوجیں بہت زیادہ تعداد میں کبھی بھی نہیں بھیجی گئیں۔

2000 میں امن فوج کے مالی سلسلہ میں سب سے زیادہ امریکہ حصہ ڈالتا تھا۔ مگر امن فوج میں اس کے فوجیوں کی تعداد پہلے بیس ممالک سے بھی کم تھی یعنی بیس ممالک کے فوجی امن فوج میں امریکہ کے مقابلے میں زیادہ تعداد میں تھے۔ سب سے زیادہ تعداد کا اعزاز ہندوستان کو حاصل ہے جس نے 3233 کی نفری بھیجی۔ دوسرے نمبر پر نائیجریا ہے جس کے فوجیوں کی تعداد 2971 ہے۔ بہت ہی تھوڑی آبادی کے ملکوں مثلاً فجی، گنی، آئرلینڈ، نیوزی لینڈ اور فن لینڈ کے بھی فوجیوں کی تعداد ساڑھے پانچ سو اور آٹھ سو کے درمیان ہے۔ (۴۷) کوئی تنگ مزاج تو بلاشبہ یہی کہے گا کہ غریب ملک اپنے فوجیوں کو

امن مشن پر اس لیے بھیجتے ہیں کہ انہیں نسبتاً زیادہ تنخواہیں ملیں گی اور پھر اس قسم کے آپریشن سے اپنے لوگوں کو دوسرے ملکوں کے طور اطوار اور ثقافت کا بھی پتہ چلے گا۔ ان قیاس آرائیوں سے قطع نظر اس بات میں کوئی شک نہیں کہ امریکہ کی طرح دوسرے بڑے ملک جو اپنے سپاہی کم ہی بھیجتے ہیں، دراصل یہ سمجھتے ہیں کہ ساری جانوں کی قدر و قیمت ایک جیسی نہیں ہوتی۔ یہ ہے صحیح معنوں میں کرایہ دارانہ رائے۔ جدید دور میں مالتھس کے زمانے کے تصورِ جہاں کا یہ توثیق نامہ۔ واضح رہے کہ سینیٹر فل گرام 1995 میں صدارتی امیدوار تھا اس کی انتخابی مہم کے دوران اس سے سوال کیا گیا کہ کیا وہ بوسنیا میں قیام امن کے لیے بھیجی جانے والی فوج کے لیے امریکی سپاہی بھیجنے کی حمایت کرے گا تو اس نے کہا تھا کہ پورا بوسنیا ہمارے ایک امریکی سپاہی کی زندگی کے برابر بھی نہیں ہے۔ (۴۸) جیسا کہ میں پہلے حوالہ دے چکا ہوں یہ وہ اصول ہے جس کے تحت امریکہ اور نیٹو نے کوسوو میں کارروائیاں کیں۔ اگر قیام امن کا مفہوم یہی ہے تو اس تصور سے بندے کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور سوال اٹھتا ہے کہ پھر جنگی کارروائی کے معنی کیا ہیں۔

پابندیاں

1990 کی دہائی اس لیے بڑی اہم ہے کہ اس میں ''نئے عالمی نظام'' (نیو ورلڈ آرڈر) نے پر پرزے نکالنے شروع کر دیے تھے۔ دنیا کو باور کرایا گیا تھا کہ اسے بدمعاش ملکوں سے بڑا خطرہ ہے۔ سلامتی کونسل نے عالم پر حکمرانی کرنے کی خواہش کے حوالے سے قیام امن کی کارروائیوں اور پابندیوں کے نفاذ میں سخت اقدامات کیے تھے۔ جب اقوام متحدہ کا قیام عمل میں آیا تو فیصلہ کیا گیا کہ لیگ آف نیشنز نے اپنے احکام کی تکمیل نہ کرنے والوں کے خلاف وقتاً فوقتاً جو پابندیاں لگائی تھیں وہ اقوام متحدہ اور دوسری علاقائی سیاسی تنظیموں کے اسلحہ خانے میں شامل رہیں گی تاکہ اپنے احکام کی تکمیل کرائی جا سکے۔ افریقی نیشنل کانگرس نے جنوبی افریقہ کے خلاف پابندیاں لگانے کا بارہا مطالبہ کیا تاہم 1962 میں جنرل اسمبلی نے جنوبی افریقہ کے خلاف معاشی پابندیاں لگانے کا فیصلہ بہت بڑی اکثریت سے کیا۔ لیکن جنوبی افریقہ کی درامدی برآمدی تجارت کا بہت بڑا حصہ تو برطانیہ، امریکہ، مغربی جرمنی اور جاپان کے ہاتھ میں تھا اس لیے انہوں نے ان پابندیوں کی مخالفت کی۔ چنانچہ ان پر عملدرآمد ہو سکا۔ جنرل اسمبلی نے اصرار کیا کہ جنوبی افریقہ میں نسل پرستی کا پرامن حل اسی میں ہے کہ اس کے خلاف مکمل معاشی پابندیاں لگائی جائیں۔ (۴۹) اور

یہ کارروائی اقوام متحدہ کے منشور کا باب ہفتم کے تحت ضروری ہے۔ اس باب کی شق 2-41 کے تحت صرف سلامتی کونسل ہی لازمی پابندیاں لگانے کی مجاز ہے۔ مگر اس کے تین مستقل ارکان نے جنوبی افریقہ کے خلاف کارروائی کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا۔ مگر جنوبی افریقہ کے خلاف عالمی سطح پر اٹھی لہر کو پوری طرح نہ روکا جا سکا حتیٰ کہ امریکہ کے اندر نسل پرستی کے خلاف اور جنوبی افریقہ سے سرمایہ نکالنے کی تحریک بھی زور پکڑتی گئی۔ چنانچہ جامع نسل پرستی مخالف قانون (کامپریہینسیو انٹی اپارتھیڈ ایکٹ) امریکی کانگریس نے منظور کیا امریکی صدر ریگن نے اسے ویٹو کیا تھا۔ افریقن نیشنل کانگریس نے دنیا بھر سے کہا تھا کہ وہ جنوبی افریقہ کا بائیکاٹ کر کے اسے تنہا کر دے مگر اب جبکہ کامیابی بہت ہی قریب تھی اس نے (اے این سی) 1993 میں پھر کہا کہ اب جنوبی فریقہ کے خلاف لگائی گئی پابندیاں اٹھا لی جائیں۔

جنوبی افریقہ کے خلاف لگائی گئی سخت پابندیوں کی مثال بڑی ہی اہمیت اختیار کر جاتی مگر 1990 کی دہائی کے وسط سے سب سے زیادہ سخت پابندیاں عراق کے خلاف لگائی گئیں۔ صدام حسین کی حرکتوں کے باعث کویت پر اس کا قبضہ ہوا تو سلامتی کونسل نے بڑی تیزی سے کارروائی کر کے عراق کے خلاف مکمل پابندیاں عائد کر دیں۔ قرارداد 661 کے ذریعے سارے رکن ممالک سے کہا گیا کہ وہ عراق کے ساتھ ساری تجارت ختم کر دیں۔ صرف طبی مقاصد کے لیے ان کی فراہمی کی اجازت تھی اور انسانی حالات کے پیش نظر خوراک کا معاملہ مستثنیٰ کیا گیا۔ (۵۰) امریکہ کی سربراہی میں 1991 کے شروع میں جو فوج عراق کے مقابلہ کے لیے بھیجی گئی اس کی عراق سے باقاعدہ ٹکر سے پہلے ہی پابندیاں لگ گئیں جس سے عراقی معیشت مفلوج ہو کر رہ گئی۔ پابندیوں کے حامیوں کا کہنا تھا کہ عراق خاصی حد تک کمزور ہو چکا ہے اس لیے بین الاقوامی فوج وہاں بھیجنے کی ضرورت نہیں اس کے علاوہ سخت پابندیاں اسے اقوام متحدہ کی اطاعت پر مجبور کر دیں گی۔ دوسری طرف امریکہ اور اس کے ساتھی اس بات کے قائل نہ ہوئے کہ عراق سخت پابندیوں کے باعث ہتھیار ڈال دے گا انہوں نے عراق کے خلاف فیصلہ کن فوجی کارروائی کر کے اسے کویت سے نکالنے کی کارروائی بھی کی۔ آخری دنوں میں ساری دنیا نے کہا کہ عراق پر پابندیاں ختم کر دی جائیں تو امریکہ اور اس کارروائی میں اس کے ساتھی برطانیہ نے یہ بات نہیں مانی اور اس کے بالکل الٹ رویہ اختیار کر لیا۔

دس برس بعد جب ان پابندیوں کے باعث عراق پر عذاب گزر چکا تھا۔1990 کے موسم گرما کے آخر میں عراق پر پابندیاں لگائی گئیں۔اس وقت پوری عرب دنیا میں عراق کا معیار زندگی سب سے بہتر تھا، وہاں ایک خوشحال اور ترقی کی راہ پر رواں دواں درمیانی طبقہ پیدا ہو چکا تھا اور سماجی بہبود کا بھی ایک جامع نظام بن چکا تھا۔جس کے ذریعے عام شہریوں کو معقول حد تک مادی تحفظ حاصل ہو گیا تھا۔معیشت دان جین دریز اور حارث گزدر نے 1992 میں لکھا۔

عراقی حکومت ایک طویل عرصے سے صحت، تعلیم، تقسیم خوراک، سماجی تحفظ اور دوسرے متعلقہ شعبوں میں کام کر رہی ہے اس کی قابل ذکر کامیابیاں یہ ہیں، کہ سارے شہریوں کو صحت کی مفت سہولت فراہم کر دی گئی ہے۔ ہر سطح پر تعلیم مفت کر دی گئی ہے، خوراک کے لیے بڑی امدادی رقم دی جاتی ہے اور بے سہارا خاندانوں کو نقد امداد دی جاتی ہے۔(۵۱)

اقوام متحدہ کی حقائق جو جماعت کے ایک افسر کے مطابق عراق پر مسلسل بمباری کر کے اسے ماقبل صنعتی دور تک پہنچا دیا گیا (۵۲) اور عراق غیر ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں شامل ہو گیا ہے اور معاشی اعتبار سے بہت پیچھے چلا گیا ہے۔اب زچہ بچہ کی اموات کی شرح کے حوالے سے یہ دنیا کے ممالک میں سرفہرست آ گیا ہے۔اسی طرح آبادی کے لحاظ سے ہسپتال میں بستروں کی تعداد بھی بڑی حد تک کم ہو گئی ہے۔عراق میں جسمانی اور ذہنی مریضوں کی تعداد میں بے انتہا اضافہ ہوا ہے اور پھر کئی بار ہیضہ اور ٹائیفائیڈ کی وبائیں بھی پھوٹی ہیں۔(۵۳) کئی ایک مبصرین نے لکھا کہ ”عراق میں ناقص خوراک نے صحت کے خطرناک مسائل پیدا کر دیے ہیں۔(۵۴) یونیسیف نے 1997 میں ایک رپورٹ جاری کی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ عراق میں پانچ سال کی عمر سے کم کوئی دس لاکھ بچے مستقلاً ناقص خوراک استعمال کر رہے ہیں یا کم خوراکی کا شکار ہیں۔ دو سال بعد اسی تنظیم کی رپورٹ کے مطابق پانچ سال سے کم عمر بچوں کی اموات 85-1984 میں ہزار کا پیچھے 56 تھیں جو 95-1994 میں بڑھ کر 131 ہو گئی ہیں۔ 2000 میں ہیومن رائٹس واچ نے رپورٹ دی کہ عراق میں سویلین ڈھانچہ اور سماجی خدمات خطرناک حد تک زوال پذیر ہو گئی ہیں۔(۵۵)

یہ شواہد ناقابل تردید ہیں، جنگ میں کم وبیش دو لاکھ عراقی مارے گئے تاہم ہلاکتوں کی

تعداداس سے کہیں زیادہ ہے عراقیوں کی اکثریت غربت کی اس سطح پر آن گری ہے کہ جس کا 1990 سے پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ امریکہ کی خارجہ پالیسی کے بے شمار ماہرین نے کبھی آزادانہ سوچ نہیں سوچی۔ وہ ہمیشہ امریکہ تھنک ٹینک کے خدمت گزار رہے ہیں اور ملک کے مفاد کو ہی سب سے برتر مفاد سمجھتے ہیں، ان ماہرین کا کہنا ہے کہ اقوام متحدہ کی طرف سے فراہم کردہ کوائف اس لیے کمزور ہیں کہ ان کے بارے میں عراقی رپورٹوں پر تکیہ کیا گیا اور ان میں سے ایک ماہر تو 1992 میں یہ کہہ کر مطمئن ہوگیا تھا کہ وہاں عراق میں ناقص خوراک یا کم خوراک، چھوٹے بچوں کی اموات اور طبی سہولتوں کی فراہمی کا مسئلہ ہے (۵۷) مگر قابل افسوس بات یہ ہے کہ انتہائی سخت پابندیوں کے باعث عراق پر جو گزر رہی ہے اس سے امریکی عوام کے دل پر کوئی بھی اثر نہیں ہوا۔ پریشانی صرف اتنی ہے کہ ان پابندیوں کے باعث کہیں امریکی مفادات تو مجروح نہیں ہو رہے۔ امریکی ذرائع ابلاغ نے بھی طویل المعیاد بندشوں اور ان کے نتائج اور بندشوں کی کمزور اخلاقی اثر انگیزی کا بھی خال خال ہی ذکر کیا ہے۔ امریکی ماہرین نے اپنے سیاستدانوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے یہ مان لیا ہے کہ عراق کے بچوں کے بطور یرغمال رکھنے کا ذمہ دار صدام حسین کو سمجھنا چاہیے۔ فروری 1998 میں پینٹا گان کے سامنے تقریر کرتے ہوئے صدر کلنٹن نے امریکہ اور دنیا کو بتایا کہ امریکہ عراق پر فوجی ضرب لگانے والا ہے اور اس موقع پر کلنٹن نے بار بار کہا کہ اگر صدام نے اپنے فرائض سے کوتاہی برتی تو پھر نتائج کا ذمہ دار وہ اور صرف وہی ہوگا۔ (۵۸)

سوال یہ ہے کہ یہ پابندیاں کیسے ایک اجتماعی حفاظتی اقدام بن گئیں اور پھر اس وقت ان کے نتائج کے حوالے سے ہمیں عالمی حکمرانی کے بارے میں کس قسم کے نتائج اخذ کرنے کی اجازت ہے؟ اس وقت تک امریکہ نے عراق پر لگائی گئی پابندیوں اور متعدد دوسرے مبینہ طور پر قانون شکن ملکوں ایران، سوڈان، افغانستان کے بارے میں کیے گئے اقدامات کے بارے میں یہ دکھانے کی بھرپور کوشش کی ہے کہ دراصل ساری کارروائی بین الاقوامی برادری کی مرضی اور ارادے کے ساتھ ہوئی ہے۔ تاہم تاریخ کے علاوہ پابندیوں کا زیادہ استعمال بھی ثابت کرتا ہے کہ گزشتہ پچاس سالوں میں امریکہ ہی ان کے بارے میں پیش پیش رہا ہے۔ 1966 میں رہوڈیشیا اور 1977 میں جنوبی افریقہ کے خلاف کیے گئے اقدامات سے قطع نظر 1990 سے پہلے تمام پابندیاں یک طرفہ طور پر زیادہ تر امریکہ نے ہی لگائی تھیں۔ ان پابندیوں کے جواز

کے لیے کثیر الملی تائید کا جو ہالہ بنایا جاتا ہے اس سے 1945 اور 1990 کے دوران کے حقائق نہیں چھپائے جا سکتے۔ اقوام متحدہ کی طرف سے سو سے زیادہ بار پابندیاں لگائی گئیں اور ان مواقع پر امریکہ نے کسی کی حمائت یا حمائت کے بغیر کم وبیش دو تہائی پابندیاں لگوائیں۔ (۵۹) روس کے ٹوٹنے کے بعد امریکہ کی راہ سے جب آخری رکاوٹ بھی دور ہو گئی تو خود اقوام متحدہ نے کہا کہ سلامتی کونسل کی طرف سے پابندیاں لگانے کی تعداد میں ڈرامائی طور پر اضافہ ہو گیا ہے۔ 31 جنوری 1988 کو سلامتی کونسل کی طرف سے صرف جنوبی افریقہ کے خلاف پابندیاں تھیں۔ پورے چار سال بعد جن ممالک پر پابندیاں لگائی گئیں ان کی تعداد چار ہو گئی اور دسمبر 1994 میں ان کی تعداد ایک دم بڑھ کر سات ہو گئی۔

بعض فاضل لوگ کہتے ہیں کہ پابندیوں کے ضمن میں کثیر الملی رضامندی کا خول ریا کاری سے زیادہ کچھ نہیں۔ لیکن ان کا خیال ہے کہ امریکہ کو ان پالیسیوں کے باعث اس لیے معتوب نہیں کیا جا سکتا کیونکہ پابندیاں تو سلامتی کونسل کی مہر سے لگائی جاتی ہیں۔ اس دلیل کی تنسیخ یوں ہو جاتی ہے کہ بدقسمتی سے سلامتی کونسل کے بارے میں کہا گیا ہے کہ سلامتی کونسل دنیا کو خوفزدہ کرنے کے اہل نہیں ہے نہ ہی وہ خود کو قانون بالذات سمجھ کر کارروائی کر سکتی ہے۔ (۶۶) شائد جنرل اسمبلی نے بھی ذرا تیکھے انداز میں کہا ہے کہ سلامتی کونسل نے یہ ہتھیار زیادہ تعداد میں استعمال کرنا شروع کر دیا ہے، اور یہ کہ پابندیوں کے نفاذ کے بعد نتائج کے اعتبار سے متعدد مشکلات پیدا ہوئیں، اسی طرح ان کے روبہ عمل لانے اور ان کے نتائج اور ان کے نادیدہ (غیر متوقع) اثرات کی مانیٹرنگ میں بھی مشکل پیدا ہوئی۔ جنرل اسمبلی نے پابندیوں کی قانونی بنیاد کا بھی ذکر کیا جو اقوام متحدہ کے منشور کی دفعہ 41 میں بیان کی گئی ہیں۔ یہ اقدام فوج کو استعمال کیے بغیر عالمی امن اور سلامتی کے قیام یا بحالی کے لیے مختص ہے اور اس کا اہم مقصد یہ ہے کہ جو فریق بین الاقوامی امن اور سلامتی کے لیے خطرہ بن گیا ہے اسے بغیر سزا دیئے یا خراج وصول کیے راہِ راست پر لانا ہے۔ (۶۱) تو پھر سوال یہ ہے کہ جب صدام حسین کو ناقابل اصلاح قرار دے دیا گیا تھا تو پھر عراق پر یہ پابندیاں کس سیاسی قیادت کی اصلاح کے لیے لگائی گئی تھیں (۶۲) برطانیہ نے سزا دینے کی بات کی، امریکہ پابندیاں لگانے کا قائل ہے۔ دراصل گزشتہ سو سال کے اینگلو سیکسن ورلڈ آرڈر میں اسے ہی گوشمالی کی سیاست قرار دے رکھا ہے۔

1991 میں امریکہ نے جس غلبے کے ساتھ نام نہاد عراقی ری پبلکن گارڈز کا خاتمہ کیا تھا، اس وقت صدام حسین سے ایسا معاہدہ کرنے کی سبیل نکل آئی تھی مگر صدام حسین کو پابندیوں کے خاتمے کے عوض کیمیاوی' جرثومی اور ایٹمی ہتھیاروں کی تباہی' میزائل بنانے کی سہولت کے خاتمہ' کویت کو بطور تاوان بہت ہی بڑی رقم (جس کی ادائیگی ممکن نہیں تھی) اور عراق کی آئندہ سیاسیات کے لیے قانون سازی کے انتظامات جیسی شرائط پیش کی گئیں جو کسی بھی آزاد ملک کے لیے بجا طور پر ناقابل قبول تھیں۔ جنوبی افریقہ کے خلاف پابندیوں میں اس ملک سے کاروبار کرنے والی کارپوریشنوں کا بائیکاٹ بڑے پیمانے پر ہوا مگر یہ واضح نہیں کہ جنوبی افریقہ پر لگائی گئی پابندیوں کے مقابلے میں عراق پر جو بھاری اور اندھا دھند پابندیاں لگائی گئیں، ان کا ویسا ہی اخلاقی اور قانونی جواز ہے۔ دوسرے جنوبی افریقہ کے خلاف جو پابندیاں لگائی گئی تھیں انہیں کالوں کی اکثریت کی حمائت حاصل تھی اور جن اقوام کو ان پابندیوں سے نقصان بھی ہو رہا تھا وہ بھی پابندیوں کے حق میں تھے۔ صدام حسین کو انتہائی نامقبولیت کے باوجود صدام حسین کے مخالف سیاسی عراقی لیڈروں (میں سے اکثر کو امریکہ مالی امداد دیتا ہے) میں سے کسی نے بھی ان پابندیوں کی حمائت نہیں کی۔ اگرچہ یہ پابندیاں سلامتی کونسل کے حکم کے مطابق لگائی جاتی ہیں مگر ہو سکتا ہے کہ ان کے نفاذ کی وجہ سے کچھ دوسرے بین الاقوامی معاہدوں اور قوانین کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ آسٹریا کے ایک ماہر قانون کے کہنے کے مطابق عراق پر لگائی پابندیوں سے معاشی، سماجی اور ثقافتی حقوق کے انٹرنیشنل کانونٹ کے سیکشن 1.2 کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ یہ سیکشن یوں ہے کسی قوم کو کسی بھی حالت میں اس کے ذرائع روزگار سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ (۶۳) 1991 میں انٹرنیشنل پراگرس آرگنائزیشن نے اقوام متحدہ کے کمشن برائے انسانی حقوق کے سامنے ایک مقدمہ پیش کیا جس میں یہ مضبوط مؤقف اختیار کیا گیا تھا کہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے ذریعے پابندیوں پر عمل درآمد کی پالیسی میں توسیع سے عراق کی پوری آبادی کے انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کی سنگین خلاف ورزی ہوئی ہے۔ عراقیوں کو سب سے پہلے بنیادی حق یعنی زندہ رہنے کے حق سے محروم کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ یہ پابندیاں انسانی حقوق کے عالمی اعلان کی شق 3، 22 اور 23 کی کھلی کھلی خلاف ورزی ہیں۔ یہ کارروائی اس قتل عام کے مترادف ہے جس کی تعریف نسل کشی کے جرم کی روک تھام اور سزا کے معاہدے میں کی گئی ہے۔ (۶۴) ان پابندیوں کے بارے میں

اعتراض کرنے کا یہ مقصد نہیں کہ ان لوگوں سے جھگڑا کیا جائے جو کہتے ہیں کہ پابندیوں کا بذات خود کوئی دفاع کیا ہی نہیں جا سکتا۔ مگر موجودہ حالات میں وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اقوام متحدہ نہ پوری نمائندہ تنظیم ہے نہ ہی اخلاقی تنظیم۔ اقوام متحدہ کے منشور کی دفعہ 2 بلند بانگ دعویٰ کرتی ہے کہ یہ تنظیم تمام ارکان کے مساوی حق کے اصول پر قائم ہے۔ مگر اقوام متحدہ کی حالیہ تاریخ میں اس کی ساری کارروائی سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اصول ہی بحوالہ لازم و ملزوم ملک کو "بڑا" قرار دینے کے اندر مسخ ہو گیا ہے۔ ہم اس دن کا سوچ نہیں سکتے جب قومیں مندرجہ ذیل امور کے حوالے سے امریکہ پر پابندیاں لگانے کے قابل ہو جائیں کہ امریکہ مہذب آرا کے خلاف مختلف صورتوں میں (دوغلے پن کا) مظاہرہ کرتا ہے۔ سرعام پھانسی دینے کا ریاکارانہ انداز، مجرمانہ حد تک صرفہ، آمریت کی سرپرستی اور اپنی افریقی امریکی (کالوں) کی آبادی کو ووٹ کے حق سے محروم کرنا۔ مسئلہ یہ ہے کہ دنیا کو ایک واقعی منصفانہ جگہ بنانے اور مخصوص نامزد معاشروں پر بین الاقوامی دباؤ ڈالنے سے لگتا ہے کہ پابندیوں کے ذریعہ مخصوص قوموں پر مزید سیاسی دباؤ ڈال کر تلخی بڑھانا اور قوموں میں عدم برابری میں اضافہ کرنا امریکہ کا مقصود بن گیا ہے۔ افغانستان پر اسے اور تباہ کر دینے والی پابندیوں کے لگائے جانے سے پہلے طالبان نے بامیان میں بدھ کے مجسمے تباہ کر دیئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پابندیوں کے تباہ کن اثرات کے باعث بعض اقوام کو اس قدر مشتعل کر دیا جاتا ہے کہ وہ اس قسم کی کارروائیوں پر اتر آتی ہیں۔

یہ پابندیاں اصلاً موت کا ایک بہت خوفناک رقص ہیں۔ یہ عراق کے خلاف اس لیے لگائی گئی ہیں کہ وہ وسیع تباہی کے ہتھیار تباہ کر دے۔ مگر یہ پابندیاں تو خود تباہی کا ایک بہت بڑا ہتھیار بن گئی ہیں حالانکہ اسی ہتھیار کی تباہی سے وہ ہمیں بچانا چاہتے ہیں۔ امریکی عالم جان کوئیگلے کے کہنے کے مطابق اگر امریکہ بدستور اس مفروضے پر کارفرما رہا کہ کثیر الملی معاملے اسی وقت تک بہتر ہیں جب تک کہ ان کے نتائج اپنے (امریکہ کے) کنٹرول میں رہیں (۶۵) چنانچہ اس قول کے حوالے سے قانون کی بین الاقوامی حکمرانی کے امکانات انتہائی ہولناک ہوں گے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے۔ علم کی باخبری کی سیاست جسے پابندیوں میں چھپایا گیا ہوتا ہے' کے حوالے سے دیکھا جائے تو اہم مسئلہ یہ سامنے آتا ہے کہ ان قوانین کو ایسے پیش کیا جاتا ہے کہ یہ متشددانہ نہیں ہیں اور گمراہ قوموں کو سزا دے کر راہِ راست پر لانے کا

ایسا طریقہ ہے جس پر کسی کو اعتراض نہیں یا بہت کم اعتراض ہے۔ جیسا کہ اقوام متحدہ میں امریکہ کے ایک سابق سفیر تھامس پکرنگ نے سلامتی کونسل کی بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا تھا ''پابندیاں، معقول واضح اور محدود ہیں۔ تشدد اور ظلم کی کارروائیوں کے جواب میں کثیر الملی، بے تشدد اور پرامن ہیں۔ (٦٦) درحقیقت یہ پابندیاں ایک نظر نہ آنے والی موت کا پھندہ ہیں اور ہمیں جان لینا چاہیے کہ حقیقتاً جدید تر جدیدیت میں یہ ہماری نسل کشی ہے۔ مگر یہ موت ہمیں مہربان مداخلت کے نام پر دی جارہی ہے۔ میں نے جنگ کو موت اور تشدد سے وابستہ کر رکھا ہے مگر بے تشدد پابندیاں اور انسانی حقوق بھی موت ہی ہیں۔ عدم تشدد طاقت کے استعمال سے کنارہ کش ہونے کا اصول نہیں ہے۔ یہ ہم سے مطالبہ کرتا ہے کہ امن کے قیام اور لوگوں کی بھلائی کے لیے مؤثر اقدامات کریں اور یہ فرض کر لینا فحش غلطی ہے کہ لوگوں کے زندگی کے حق سمیت ان کے حقوق سلب کرنے سے دراصل انسانی حقوق کی جے ہوتی ہے۔ ہمیں تو پابندیوں پر، خصوصاً اس وقت بڑے پیمانے پر لگنے والی پابندیوں پر غور کرنا چاہیے کیونکہ یہ حکمرانی کی ایک نئی ٹیکنیک ہے اور یہ جیتے جی (کسی کو) مارنے کی ترغیب ہے۔ اس سے پہلے ترقی کے نام پر بے شمار لوگوں نے اپنی جانوں کی قربانی دے دی۔ اب لازمی پابندیوں کے ذریعے مفلوج کیے گئے ملک کے لوگوں کو اس خیال سے بہلایا جارہا ہے کہ ان کے انسانی حقوق سے اگر اب انکار کیا گیا ہے تو محض اس لیے کہ انہیں وہ بالاتر انسانی حقوق دیئے جائیں گے جو مغرب میں رائج ہیں۔ مکاری کی کوئی حد نہیں ہوتی۔

معاشی مطلق العنانیت: ڈبلیو ٹی او کا زمانہ

چند سال پیشتر ایشیا کے اکثر معاشی شیروں کو ایک مالی بحران نے گھیر لیا تھا۔ چنانچہ بین الاقوامی مالیاتی فنڈ سرگرم ہوا۔ بڑی خبریں چھپیں اور بحران سے بچنے کے لیے ان ممالک نے بھی مشورے مانگے جن کی کرنسیوں کی قدر و قیمت ایک دم گر گئی تھی، بے روزگاری کی شرح بہت اونچی ہوگئی اور ملک سے روپیہ باہر جانا شروع ہوگیا تھا۔ یہ آئی ایم ایف امریکہ کے تحفظ کی علامت بھی ہے اور اس کی غیر معمولی قابلیت کا مظہر بھی۔ لیکن امریکہ کے لیے آئی ایم ایف اور عالمی بنک کی کوئی حیثیت نہیں کیونکہ امریکہ اپنی معیشت کی توانائی کو ڈون جونز اور نسڈک کی جدولوں اور قیمتوں کی فہرستوں سے ماپتا ہے۔ امریکہ میں تو سٹاک مارکیٹ کو ہی

معیشت سمجھنا ایک عادت بن گئی ہے۔ سٹاک ایکسچینج میں تبدیلیوں کو غور سے دیکھنا نہ صرف فیڈرل ریزرو کے چیئرمین ایلن گرینز پین کی بلکہ کروڑوں سٹاک ہولڈروں کی عادت بن گئی ہے ایلن گرینز پین کو بعض اوقات ''دنیا کا سب سے زیادہ طاقتور آدمی'' بھی کہا جاتا ہے۔

دنیا کی اکثر آبادی سٹاک مارکیٹ کی بنائی دنیا سے بالکل الگ منطقے میں رہتی ہے۔ سٹاک مارکیٹ سے زیادہ سروکار نہیں رکھتے انہیں تو خوراک، پانی، روزگار، مکان وغیرہ وغیرہ ایسے امور کی زیادہ فکر رہتی ہے مگر ان لوگوں کے ان مسائل کے لیے دنیا کے عظیم نو تعمیر معاشی نظام کے پاس کوئی وقت نہیں ان لوگوں کی زندگیوں پر عالمی بنک اور فنڈ کی طرف سے آنے والی مشاورت کا اثر ہوسکتا ہے۔ اب اس کے ساتھ ساتھ عالمی تجارتی تنظیم اور گات (جی آئی ٹی) کی طرف سے جاری ہونے والے احکام کا اثر ہوتا ہے۔ جیسے جیسے ایشیا اور افریقہ کے ملکوں نے آزادی حاصل کی تو عالمی بنک ان ملکوں میں ترقیاتی منصوبوں اور انفراسٹرکچر (ظاہری ڈھانچہ کو بنانے) کو بنانے اور ترقی دینے کی خاطر مالی امداد دینے آ گیا۔ عالمی بنک کی پالیسیوں کا مقصد تھا فراہمی (سپلائی) کا نظام زیادہ مؤثر بنایا جائے اور پیداواری نوعیت کی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ دوسری طرف بین الاقوامی مالیاتی فنڈ اس لیے قائم کیا گیا کہ جن ممالک کے غیر ملکی زرمبادلہ کے ذخائر کم ہیں انہیں قلیل المعیاد قرضے دیئے جائیں اور ان کے اندر بڑی معاشی اصلاحات کی جائیں۔ ان دونوں تنظیموں کے قیام کے لیے ہیری وائٹ نے منصوبہ تحریر کیا۔ اس نے لکھا۔

منصوبہ زیادہ تر اس لیے بنایا گیا ہے کہ غیر ملکی زرمبادلہ میں خلل نہ پڑے۔ مالی اور قرضوں کے نظام کو مضبوط کیا جائے اور غیر ملکی تجارت کی بحالی میں مدد ملے۔ جبکہ بنک سے مراد ہے کہ امریکہ اور اس کے ساتھیوں کو سرمایے کی فراہمی بڑھے کیونکہ تعمیر نو، مالی امداد اور معاشی بحالی کے لیے سرمائے کی ضرورت ہے۔ (۶۷)

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان اداروں کی الگ الگ صفات بھی مدھم ہوگئیں اور اب دونوں ایک جیسے ہی نظر آتے ہیں۔ وہ بین الاقوامی مالی نظام کے ری پبلیکنز اور ڈیمو کریٹس ہیں اور دونوں درحقیقت امریکہ ہی کے احاطہ اختیار میں ہیں۔ (۶۸) یہ بھی تو اقتدار اور طاقت کا ایک ڈھنگ ہے۔ ایک ہی چیز کو زیادہ حصوں میں تقسیم کر دینا اس لیے بھی کہ دیکھنے میں یہ لگے کہ طریق کار جمہوری، منصفانہ اور باقاعدہ ہے۔ لیکن اب کچھ عرصہ

سے لوگوں کو یوں لگتا ہے کہ معاشی دہشت گردی کے ان جڑواں بنیادوں والے بنک اور فنڈ کی حیثیت کم ہو گئی ہے اور عالمی تجارتی تنظیم (ڈبلیوٹی او) ان سے آگے نکل گئی ہے اور ڈبلیوٹی او کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ گاٹ کی جانشین ہے مگر گاٹ سے بھی بہت آگے چلی گئی ہے۔ یوراگوئے راؤنڈ کے مذاکرات (1994) کے اختتام پر ڈبلیوٹی او 1995 میں وجود میں آئی۔ اس کے ارکان کی تعداد چین اور تائیوان سمیت ستمبر میں ڈیڑھ سو ہو گئی تھی۔ ڈبلیوٹی او کے رکن ممالک پر شرط ہے کہ اس تنظیم نے جو جو معاہدے اور عہد کیے ہیں وہ ان سب کو مانتے ہیں جبکہ اس کے مقابلے میں گاٹ ارکان کو کچھ آزادیاں بھی دے رکھی تھیں مثلاً یہ کہ ارکان، گاٹ سے کیے گئے معاہدوں سے الگ بھی ہو سکتے تھے تاہم وہ دوسرے معاہدوں کے پابند رہتے تھے۔ ڈبلیوٹی او نے تو معاہدوں کا انبار لگا رکھا ہے ان میں زیادہ اہم گاٹ۔ جس میں عالمی تجارت کی راہنمائی کے بڑے بڑے اصول اور ضابطے بھی شامل ہیں اور متعلقہ نظریے بھی۔ مثلاً موسٹ فیورڈ نیشن (ترجیح یافتہ قومیں) اور قومی رویہ (نیشنل ٹریٹمنٹ) اس کے ذریعے حکومتوں، تنظیموں اور افراد کو مقامی طور پر بنائے گئے سامان یا بہتر ماحولیات میں تیار کردہ اشیا کو قانونی طور پر ترجیح دینے سے روک دیا گیا ہے۔ ٹریڈ ریلیٹڈ انٹلیکچوئل پراپرٹی رائٹس (ٹی آر آئی پی ایس) ٹریڈ ریلیٹیڈ انویسٹمنٹ میژرز (ٹی آر آئی ایم ایس) زراعت پر معاہدہ (اے او اے) اور ٹیکسٹائل اینڈ کلوذنگ (اے ٹی سی) پر معاہدہ۔ اس کے علاوہ ہر نوع کے معاشی تبادلے کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں معاہدے، زرعی اشیا کی تجارت، سامان (پیداوار) اور سروسز اور اشیائے ضروری اور صنعت ٹیکسیشن پالیسیوں، انشورنس، لائسینز سرمایہ داری، پٹینٹس اور کاپی رائٹس۔

ڈبلیوٹی او نے جس طرح سارے ہی پہلوؤں کو عالمی سطح کے اداراتی انتظامات میں سمیٹ لیا ہے اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ اس کا بنیادی کلیہ یہ ہے کہ انسانی معاشروں کا بہترین ربط وضبط اور ادغام آزاد تجارت سے حاصل ہوتا ہے اور سرحدوں سے بالاتر ہو کر سامان سروسز اور منڈی تک بے روک رسائی اس وقت ممکن ہے جب مقامی اور قومی حکومتیں اپنی خود مختاری اور فیصلہ ساز اختیارات ایسی تنظیم کو سونپ دیں جو معاشی سرگرمیوں کو بڑھانے کے لیے ضابطے اور قاعدے وضع کر کے انہیں لاگو بھی کر سکے۔ سرحدوں کی پابندی ختم ہو گی۔ ہاں افرادی قوت کو اس کی اجازت نہیں ہو گی۔ ڈبلیوٹی او اس ضمن میں کوئی اختیار نہیں لینا چاہتی کیونکہ افرادی قوت کا نکاس زیادہ تر یک طرفہ ہو گا یعنی ترقی پذیر

ممالک کے غیر مہارتی اور مہارت یافتہ کارکن ترقی یافتہ اور امیر مغرب کی چراگاہوں کی طرف رخ کرتے ہیں۔ چنانچہ ترک وطن کرنے والوں کو قبول کرنے کی ذمہ داری اس ملک کی ہوگی جو انہیں بلائے گا جس کے پاس اچھی اجرت اور معاوضے ہیں... مثلاً امریکہ میں گرین کارڈ (اس کے برابر کینیڈا اور آسٹریلیا کارڈ) اسی طرح انتہائی اعلیٰ درجہ کے پیشہ وروں اور دوسرے نقل مکانی کر کے آنے والوں سے معاملہ کرنے کی تمام تر ذمہ داری انہی ممالک کی ہوگی۔

ڈبلیو ٹی او کے اس انداز سے خیال آتا ہے کہ وہ اس معاشی نظریے کو شکل دے رہی ہے یا یہ اصول عام کرنا چاہتی ہے کہ آزاد یا کھلی معاشی سرگرمیاں جدید جمہوری زندگی کے فروغ اور مختلف ملکوں میں انسانی۔ معاشرتی اور ثقافتی حقوق کے حوالے سے خدشات کو دور کرنے کی بنیاد بنے گی۔ ان حقوق میں مزدور کی عظمت اور عزت نفس، صاف، صحت مند خوراک، صاف ہوا اور پانی، محفوظ اور کم خرچ مکان اور ثقافتی خودمختاری کے حقوق شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مقامی خودمختار حکومت سازی اور متعدد ایسے ہی دوسرے حقوق۔ یعنی ان حقوق کا حصول کسی بھی صورت میں منڈی کی سرگرمیوں پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ ڈبلیو ٹی او کے حمائتی اور وکیل کچھ نتائج ماننے کے لیے تیار نہیں۔ مثلاً اس وقت ڈبلیو ٹی او کے معاہدوں کے مطابق عالمی تجارت میں سب سے زیادہ فائدہ تو امیر ملکوں کو پہنچ رہا ہے اور ان کے ساتھ ساتھ فائدہ میں شریک ملٹی نیشنل یا ٹرانس نیشنل کمپنیاں ہیں جو معیشت پر حاوی ہیں۔ ڈبلیو ٹی او کے حامی اس کے الٹ یہ کہتے ہیں کہ تنظیم امیر اور غریب، چھوٹے اور بڑے اور ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک کو ایک قانون کے تحت برابری کی معیشت دے کر نادر مقابلے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بتایا جاتا ہے کہ ڈبلیو ٹی او کے تحت مختلف تنازعات کے حل کے لیے ایک نظام وضع کیا گیا ہے جس کے تحت تنازعہ پیدا ہوتے ہی فوراً اس کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے یعنی جن حالات میں غریب ملکوں نے مشکلات کا مقابلہ کیا ہے وہ حالات ختم کیے جا سکتے ہیں۔

تنازعہ فیصل کرنے کا طریقہ

ڈبلیو ٹی او بھی ایک طرح سے عالمی حکومت ہے جسے تجارت کے کئی شعبوں، سرمایہ کاری، انشورنس اور فنانس پر وسیع اختیارات حاصل ہیں۔ اس لیے قدرتی بات ہے کہ رکن ممالک کے درمیان تنازعات کے حل کے لیے اس کا بھی نظام یا طریقہ ہونا چاہیے۔ ایسے

تنازعات یوں پیدا ہوتے ہیں مثلاً ایک ملک کو شکائت ہے کہ اسے دوسرے ملکوں کی منڈی تک رسائی حاصل نہیں یا اس میں رکاوٹیں ہیں یا یہ کہ ایک یا زیادہ ملک کوئی ایسا طریق اختیار کرتے ہیں جس سے ایک اور ملک کی پیداوار اور سروسز کو نقصان پہنچ رہا ہے تو یہ تنازعہ تصفیہ طلب ہے۔ یورپی یونین کے خلاف کھیلوں کا معروف مقدمہ (مقدمہ ڈبلیو ٹی/ڈی ایس 31) امریکہ نے دائر کیا اور امریکہ میں قائم چکوتیا کارپوریشن (سابقہ یونائیٹڈ فروٹ (٦٩) کی طرف سے کہا کہ یورپی ممالک کی کیریبئن کے ممالک پر حکومت رہی ہے یعنی وہ نوآبادیات تھیں۔ اس حوالے سے یورپی ملکوں کو سپلائی رعائتی ہے۔ مدعا یہ تھا کہ یورپی ملک کیریبیئن ممالک کے چھوٹے مالکان سے کیلا خریدتے ہیں اور لاطینی امریکہ کے بڑے سپلائر سے کیلا نہیں خریدتے حالانکہ وہاں مزدوروں کو کم تنخواہ پر ملازم رکھا جاتا ہے۔ بہتر فارمنگ ٹیکنیک استعمال نہیں کی جاتی ہے اور پیداوار بھی غیر مناسب ماحول میں ہوتی ہے۔ ڈبلیو ٹی او نے فیصلہ امریکہ کے حق میں دے دیا۔(٧٠)

ایک دوسرے تنازعے میں امریکہ نے کارروائی کی صرف دھمکی دی تھی کہ متعلقہ فریق نے فوراً اپنا رویہ بہتر بنا لیا۔ اقوام متحدہ کی یونیسیف اور ہوو (ڈبلیو ایچ او) کی جاری کردہ ہدایات کے مطابق گوئٹے مالا نے گربر بیبی فوڈ پیکج کے اندراج کے حوالے سے مقدمہ کیا اس پر تحریر ایسی ہے جس سے یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ اس خوراک کا استعمال ماں کے دودھ کا نعم البدل ہے۔ گربر پروڈکٹس کمپنی کی طرف سے امریکہ کے محکمہ نے گوئٹے مالا کو ڈبلیو ٹی او میں معاہدہ Trips کے تحت لیے جانے کی دھمکی دی اور دلیل یہ دی کہ گربر کو Trips کے تحت پراپرٹی رائٹس حاصل ہیں۔ امریکہ نے مزید یہ دلیل دی کہ ڈبلیو ٹی او کے قواعد کے تحت آزاد تجارت کو جو استثنیٰ حاصل ہے اس کا اس مقدمہ پر اطلاق نہیں ہوتا۔ گوئٹے مالا نے امریکی دھمکی کے سامنے سپر ڈال دی نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کا قانون بھی تبدیل کر دیا گیا اور اس قسم کے لیبل کی اجازت دے دی گئی حالانکہ اس سے یونیسیف اور ہو کی ہدایات کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ ڈبلیو ٹی او کے تحت شکایات سامنے لانے یا محض مقدمہ دائر کرنے کی تجویز کے آتے ہی ایکس مختلف معاہدوں میں سے جو ڈبلیو ٹی او نے وضع کر رکھے ہیں کسی ایک کا حوالہ دے دیا جاتا ہے۔

ڈبلیو ٹی او کے حامیوں کا کہنا ہے کہ ڈبلیو ٹی او کی حیثیت اور اہمیت اور طاقت کی وجہ اس کا تنازعہ حل کرنے کا طریقہ ہے اور ساری قوموں کو اسی میں زیادہ کشش نظر آتی ہے۔

جو فریق چاہے کہ اس کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے وہ اپنا معاملہ ڈبلیو ٹی او کے پاس پیش کر سکتا ہے۔ گاٹ کے تحت فریقین میں مقدمات دفعہ 22 اور 23 کے تحت فیصل کیے جاتے تھے۔ موخر الذکر قانون کے تحت گاٹ کونسل میں معاملہ لایا جاتا پھر اس پر غور کرنے کے لیے ایک پینل بنایا جاتا۔ گاٹ کونسل پینل کی رپورٹ قبول کرنے کا فیصلہ کرتی لیکن متفقہ طور پر۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جس فریق کے خلاف فیصلہ آیا ہے اسے خود اپنے خلاف ووٹ دینا ہوگا لیکن ایسا شائد ہی کبھی ہوا ہو۔ (۷۲) مگر گاٹ کے تحت تنازعات کے حل کی یکسا روانی میں صرف یہی ایک قانون نہ تھا ایک فاضلانہ مطالعہ کے مطابق دوسرے غیر پسندیدہ، غیر مستند عوامل بھی شامل تھے۔ پینل کی تشکیل اور کارروائی کے انجام تک بہت ہی زیادہ وقت لگ جاتا۔ تنازعہ کے فریقین پینل کے کسی متفقہ فیصلے پر پہنچنے کے دوران رکاوٹیں ڈالنے کے بھی اہل تھے اور پھر فیصلہ پر عمل درآمد میں بھی مشکلات حائل تھیں۔ (۷۳) جو پارٹی بے گناہ ثابت ہوتی، وہ دوسرے قصور وار فریق کو مندرجہ ذیل سزائیں دلوا سکتی تھی: معاشی پابندیاں لگانے کی دھمکی، ٹیرف لاگو کرنے سے یا تجارتی فوائد واپس لینے سے مگر یہ بات توقع کے ہرگز خلاف نہیں کہ صرف امریکہ، یورپی یونین، جاپان، آسٹریلیا، کینیڈا اور چند ایک دوسرے ملک تھے جو یک طرفہ اقدامات کر سکے۔

ڈبلیو ٹی او کے حامیوں کا کہنا ہے کہ گاٹ کے مقابلے میں ڈبلیو ٹی او میں تنازعات کو طے کرنے کا بہت بہتر انتظام ہے۔ مقدمہ دائر کرنے کے بعد ساٹھ دن کے اندر پینل کی رپورٹ آ جاتی ہے۔ بشرطیکہ پینل میں مقدمہ کو مسترد کرنے پر مکمل اتفاق نہ ہو جائے۔ یہاں پھر سوال یہ ہے کہ ایسی صورت ناممکن ہے کیونکہ جو فریق بری کر دیا گیا ہے وہ اپنے ہی حق میں آنے والے فیصلے کو کیسے مسترد کر دے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ڈبلیو ٹی او کے طریق کار میں چھوٹے اور کمزور ملک کو بڑے اور طاقتور ملکوں کے مساوی رکھا گیا ہے۔ یہ غیر سیاسی سی بات ہے جس کی بنیاد اس مفروضے پر ہے کہ ایک بار تمام ملکوں کو قانونی برابری دے دی گئی ہے۔ اگر ایسا ہوا بھی ہے، جو خود سوالیہ مسئلہ ہے تو یہ معاملہ بھی "پکی" مساوات (اقوام متحدہ والی) کے مترادف ہے۔ ترقی پذیر ممالک کے مسائل کے ایک قابل احترام وکیل بھگیر اتھ لال داس نے کہا ہے کہ پینل کے سامنے جو مقدمات لائے جاتے ان کی نوعیت انتہائی ٹیکنیکل ہوتی ہے۔ بہت سے فریق ممالک کے پاس اتنے وسائل نہیں ہوتے کہ وہ ماہرین، وکلا اور محققین کی بڑی ٹیم کو پینل کے سامنے پیش کر سکیں جو قانون کی

باریکیوں کی دیکھ بھال کر سکیں۔ ترقی پذیر ممالک کو ڈبلیو ٹی او سے ایک قانونی ماہر کی خدمات حاصل کرنے کا حق حاصل ہے پھر بھی لال داس کے مطابق ترقی پذیر ملکوں کو اپنے مقدمات پیش کرنے کے لیے بڑا زیر بار ہونا پڑتا ہے جو ان کے بس کی بات نہیں۔ داس نے کہا ہے کہ ''جہاں تک بہت ہی غریب ترقی پذیر ملک کا تعلق ہے اس کے لیے پینل کے پاس مقدمہ دائر کرنے کے اخراجات ہی ناقابل برداشت ہیں۔ گاٹ میں تو اپیل کی اجازت نہ تھی مگر ڈبلیو ٹی او کے قواعد پینل کے فیصلے کے خلاف اپیلیٹ باڈی میں جانے کی اجازت ہے جس کا فیصلہ حتمی ہوتا ہے۔ اگر غلط فریق یہ فیصلہ رد کر دے تو اس کے خلاف ڈبلیو ٹی او پابندیاں لگا سکتی ہے۔ گاٹ کے تحت غریب ملکوں کو جو کمزوریاں اور راہیں مل جاتی تھیں وہ اب بند ہو گئی ہیں مگر امریکہ یا جاپان کے خلاف کون پابندیاں لگائے گا؟ اس نظام کے تحت پابندیوں کا جو تصور ہے وہ جوابی کارروائی یا بدلہ ہے۔ لیکن اگر پینل نکاراگو یا یا گوئٹے مالا کے مقدمہ میں فیصلہ امریکہ کے خلاف دے دے تو یہ ملک کیسے امریکہ کے خلاف جوابی کارروائی کریں گے؟ ڈبلیو ٹی او کے قواعد کے تحت غریب ملکوں کو علاج یا اصلاح کی جو صورتیں میسر ہیں ان کے بارے میں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے ایں دفتر بے معنی (۷۵)

اگر ڈبلیو ٹی او کے تنازع فیصل کرنے کا طریقہ کار بڑا منصفانہ ہے اور اس کے حامی یہی دعویٰ کرتے ہیں تو پھر یہ کیا حقیقت ہے کہ اکتوبر 1999 میں 117 مقدمات پینل کے سامنے لائے گئے، ان میں سے 50 امریکہ نے دائر کیے تھے۔ (۷۶) جبکہ بہت سی شکایات یورپی یونین، جاپان اور کینیڈا نے پیش کیں۔ اس سے واضح ہو گیا کہ ڈبلیو ٹی او کے نظام عدل کے گلے میں امیر ممالک کا پھندا ہے۔ یوں اس پر امیر ملکوں کا کنٹرول مکمل ہے۔ جبکہ ڈبلیو ٹی او کے ایک سابق ڈائریکٹر جنرل کا کہنا ہے کہ ڈبلیو ٹی او سے بڑی کامیابی اور حاصل اس کا نظام عدل ہے اور کھل کر کہا کہ ''اس نظام سے صرف ترقی پذیر ہی نہیں ترقی یافتہ ملک بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں' (۷۷) ڈی ایس او (ڈسپیوٹ سیٹلمنٹ انڈرسٹینڈنگ) کے ارکان پر لازم ہے کہ وہ اسی فریم ورک کے اندر اپنے اختلافات ختم کریں۔ دوسرے یہ کہ ارکان یک طرفہ طور پر اپنے ملکی قانون کے تحت کوئی کارروائی کرنے کے مجاز نہیں ہوں گے۔ گزشتہ چند سالوں میں امریکہ نے متعدد مواقع پر یو ایس ٹریڈ اینڈ کمپیٹیٹونس ایکٹ مجریہ 1988 (ترقی پذیر دنیا میں اسے بدشگونی کے طور پر سپر 301 کا نام

دیا گیا ہے) کے تحت ملکوں کے خلاف کارروائی کرنے کی دھمکی دی یہی نہیں یورپی یونین نے بڑی نیم دلی کے ساتھ امریکہ کے خلاف شکائت کی کہ ہیلمز برٹن لا کے تحت علاقے سے باہر بھی کارروائی ہوسکتی ہے۔ اس قانون کے تحت نجی فریق امریکی عدالتوں میں اپنے اس مال کو سمگلنگ کا مال قرار دیں جو کیوبا کی حکومت نے ضبط کرلیا تھا۔ اس پر امریکہ نے اعلان کیا کہ وہ ڈبلیو ٹی او کے پینل کے احاطہ اختیار کو نہیں مان سکتا اور ڈبلیو ٹی او کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ امریکی قومی سلامتی کے معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے۔ (۷۸)

بہت کم مبصرین نے پینلوں کی تشکیل کے معاملہ پر توجہ دی ہے۔ اس کے ارکان کو ان امور کے بارے میں نہ کوئی تربیت حاصل ہے نہ مہارت جس کے بارے میں وہ فیصلہ کرنے جارہے ہیں یعنی ماحولیات، پیٹنٹ، زراعت یا فنانس، این جی اوان مقدمات میں حصہ نہیں لے سکتیں۔ صرف حکومتوں کے نمائندے مقدمہ دائر کر سکتے ہیں اور کارروائی میں حصہ لے سکتے ہیں۔ ان نمائندوں کو متاثرہ صنعتوں کے ایجنٹوں (لابیئسٹس) کی حمائت حاصل ہوتی ہے۔ سرکاری نمائندے اپنا تحریری قانونی موقف دے سکتے ہیں مگر یہ ساری کارروائی انتہائی خفیہ ہوگی۔ (۷۹) بندہ بجا طور پر یہ توقع کرسکتا ہے اور ایسے اداروں سے یہی امید کی جاسکتی ہے کہ ڈبلیو ٹی او کے پینل شاذ ہی کوئی ایسا فیصلہ کرے جس سے ظاہر ہو کہ اسے ماحولیاتی اور معاشرتی مسائل کا پورا احساس ہے یا اس سے یہ بھی ظاہر ہو کہ غریب ملکوں کو یہ شک نہ رہے کہ ان کی کوئی شنوائی نہیں ہوگی۔ مگر مساوات کا یہ نقاب اس باقاعدہ غیر مساوی نظام کو نہیں چھپا سکتا جو ڈبلیو ٹی او کی تعمیر میں مضمر ہے۔ ہمیں طاقت کے اپنے طریق کار کو نہیں بھولنا چاہیے جب یہ دیکھا جائے کہ کوئی ادارہ فلاح عامہ کے حوالے سے غیر جانبداری سے کام کرنے لگا ہے تو وہاں طاقت اور اقتدار، زیادہ متحرک ہو جاتے ہیں تاکہ اس ادارے کو غیر جانبداری اور فلاح عامہ سے روکا جائے۔

باب 4

جدید علم اور اس کے زمرے

میں اور میری بیوی سان فرینڈو ویلی کی وڈ ، لینڈ بلز میں رہتے اور کام کرنے کے لیے کئی سالوں سے اپنی کار سے لاس اینجلز کی کیلی فورنیا یونیورسٹی میں آیا کرتے۔ اس ضمن میں لاس اینجلز کی بدنام زمانہ ''فری ویز کا پندرہ میل کا ٹکڑا بھی آتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس ٹکڑے کو نظر انداز کر کے سرفیس گلیوں کے ذریعے یہ سفر طے کر لیا جائے۔ آدھا سفر کٹنے کے بعد ۴۰۵ فری وے آتی ہے جو دو ریاستوں کے درمیان میں اور کسی بھی دوسری ریاست صوبے میں اس کا نمبر ۴۰۵۔ ا ہوگا۔ پرہجوم ٹریفک (رش) کے وقت اس فری وے ۴۰۵ پر فی گھنٹہ اوسط رفتار دس سے بارہ میل ہوتی ہے۔ تاہم پرانے ''رہائشی'' اور نئے آنے والوں نے نوٹ کیا کہ رش کے اس وقت میں ان فاصلوں یا دوری کا وہ مفہوم نہیں رہا جو پہلے زمانے میں ہوا کرتا تھا۔ یعنی انہیں یہ کم رفتار ناگوار نہیں گزرتی۔ ۴۰۵ تقریباً ہر گھنٹے کے بعد رکاوٹ کے باعث بند ہو جاتی ہے ماسوائے آدھی رات اور اس کے چند گھنٹوں بعد۔ اگر ہفتے یا اتوار کی صبح کو ۴۰۵ سے فری وے ۱۰ کے ذریعے معروف ساحلی تفریحی مقامات وینس اور سانٹا مونیکا جانا ہو تو اس پر رش کے وقت کے برابر یا اس سے بھی زیادہ وقت لگتا ہے۔ امریکہ کے شہروں میں رش کے اوقات عموماً صبح سات اور نو اور بعد دوپہر تین سے چھ بجے تک ہوتے ہیں تاہم وقت کے ساتھ ساتھ ان اوقات میں اضافہ بھی ہوتا گیا۔ لاس اینجلز میں یہ اوقات صبح چھ سے گیارہ بجے اور شام تین بجے سے سات بجے تک ہو گئے ہیں۔ چنانچہ گیارہ بجے سے لے کر تین بجے تک کا وقت زیادہ رش کا نہیں ہوتا۔ اس لیے

بہت سے لوگ ان اوقات میں فری ویز پر سفر کرتے ہیں لیکن نتیجہ یہ ہے کہ بظاہر ان فارغ اوقات میں بھی سفر پر رش اوقات سے زیادہ وقت صرف ہو جاتا ہے۔

سرفیس سٹریٹ سیپلو یدا بلیوارڈ ۴۰۵ کے متوازی چلتی ہے۔ لگتا ہے لاس اینجلز میں کسی شخص کو بھی معلوم نہیں کہ یہ سیپلو یدا کون تھا۔ کبھی کبھی مجھے غصہ آتا تھا کہ یہ شخص ژوان سیپلو یدا ان (فاتح) ہسپانوی آبادکاروں کا راہنما تھا جن کا مطالبہ تھا کہ ریڈ انڈینز کو غلام بنایا جائے (ا) جب میں نے کیلیفورنیا کی سرکاری لائبریری کو کھنگالا تو کھلا کہ میں غلطی پر تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آزاد اور غیر آزاد دنیا میں بہت سی عمارتوں اور مقامات کا نام بدمعاشوں کے ناموں پر رکھا گیا ہے۔ سیپلو یدا کے بارے میں مزے کی بات یہ ہے کہ جب ہم نے گھر سے کیلیفورنیا یونیورسٹی جانا شروع کیا اور اس گلی سے جانا شروع کیا تو تب ہم نے دیکھا کہ یہ راستہ .... نسبتاً ویران سا ہے۔ عموماً ۴۰۵ پر چلتے ہوئے جو سفر ایک گھنٹے میں طے ہوتا تھا وہی سفر اس سیپلو یدا سٹریٹ کے ذریعے تیس منٹ میں کٹ جاتا تھا۔ بہرطور یہ کوئی ڈھکی چھپی یا راز کی بات نہیں تھی۔ ۴۰۵ پر جب ٹریفک کے رش میں پھنسے لوگ آہستہ آہستہ چل رہے ہوتے تب وہاں کئی گلیوں سے سیپلو یدا والے راستے پر تیزی سے فراٹے بھرتی کاریں نظر آتیں اس کے باوجود ۴۰۵ پر سفر کرنے والوں کا دھیان سیپلو یدا کی طرف نہیں جاتا، ہم اس بات پر حیران بھی ہوتے تھے اس لیے کہ اس ثقافت کا تو نعرا یہ ہے کہ ''وقت پیسہ ہے'' اس کے باوجود ہزاروں لوگوں کو بھی خیال ہی نہیں آیا کہ اس طرح یعنی ۴۰۵ پر سفر کرنے سے ان کا وقت برباد ہو رہا ہے۔ تو کیا ہم اس سے یہ نتیجہ حاصل کر کے مطمئن ہو جائیں کہ ہر چند لاس اینجلز والوں کو دوسرے علاقوں اور دوسرے لوگوں کے نسبتاً فارغ الوقت طرز حیات سے نفرت ہے مگر یہاں انہوں نے تو نہ چاہتے ہوئے بھی وقت کے ضیاع کی گنجائش پیدا کر لی ہے؟

تاہم یہ راز بڑی آسانی کے ساتھ معلوم کیا جا سکتا ہے۔ جنوبی کیلیفورنیا کے رہنے والوں کی سب سے معروف شناخت ان کی کار سے ہوتی ہے اور دوسری ریاستوں کے مقابلے میں لاس اینجلز میں سمجھا جاتا ہے کہ یہ فرد کی گاڑی ہی اس کا گھر (کبھی کبھی صرف یہی) ہے۔ اور وہ نئے نئے بالغ ہونے والے کی طرح کسی اصلی گھر پر رہنا ہی نہیں چاہتا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ معاملہ ذرا زیادہ گمبھیر ہے۔ ہمیں یہاں درجوں اور خانوں یا زمروں

کے سامراج سے بھی واسطہ پڑتا ہے اور اس کی تعبیر کا آغاز اس خیال سے ہوتا ہے کہ کیلیفورنیا خصوصاً جنوبی کیلیفورنیا میں شاہراہوں (ہائی ویز) کو فری ویز کہا جاتا ہے۔ جنوبی کیلیفورنیا میں سڑکوں پر کوئی ٹیکس نہیں ہے یہی ان فری ویز کی خاصیت اور خوبی ہے۔ جیسے جیسے امریکیوں نے مغرب کی طرف بڑھنا شروع کیا کیلیفورنیا کو یونین میں مدغم کرلیا گیا اور اس ریاست کو امریکی خواب کی تعبیر کے لیے چن لیا گیا۔ یہاں سونے کی موجودگی کی وجہ سے قسمت کے دھنی متلاشیوں نے ہجوم کیا اور بہت سے ایسے لوگ بھی آئے جن پر دوسرے دروازے بند تھے۔ یہاں زمین بڑی وسیع مگر تاریخ بڑی مختصر (۲) تھی اس لیے امریکیوں پر اس کے دروازے لامحدود حد تک کھلے تھے۔ بہت دیر بعد خصوصاً دوسری جنگ عظیم کے دوران ملک میں سب ہائی ویز (شاہراہوں) کا نظام شروع ہوا تو لاس اینجلز کی سڑکوں (فری ویز) نے لوگوں کو ایک اور طرح محظوظ کیا۔ امریکہ کے مشرق میں تو سڑکوں پر ٹول ٹیکس یا راہ داری کا ٹیکس تھا مگر ان فری ویز پر کوئی ٹول ٹیکس نہیں تھا یعنی نہ روک نہ ٹوک۔ یوں اہل کیلیفورنیا نے ایک نیا مزہ پایا۔ فن تعمیر کے حوالے سے معروف ادیب رینز بنیھم نے انیجلز والوں کی خیالی خبث کو کمال خوبی سے صرف ایک لفظ میں بند کر دیا ہے۔ ''یوٹوپیاہ'۔ فری وے وہ ہے جہاں ہر انیجلز والے اپنی زیادہ تر زندگی گزارتے ہیں۔ فری وے وہ جگہ ہے جہاں لاس انیجلز والے ہر روز اپنے دو گھنٹے بڑے پرامن اور بڑے مزے سے گزارتے ہیں اور یہ بھی کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ پیرس اپنی میٹرو کیوجہ سے اتنا مشہور نہیں جتنا لاس انیجلز اپنی فری وے کی وجہ سے معروف ہے'' (۳)

1965 میں ایک اور جذبات نگار نے لکھا ''لاس انیجلز کی اصل خوبی اور نشانی ہے ہر دم حرکت لیکن اس مشاہدہ میں کچھ طنز بھی ہے۔ اس تحریر کے کوئی ایک ماہ بعد واٹ میں فساد پھوٹ پڑے اور ان فسادات کا مرکز وہ علاقے بن گئے جو فری وے سے دور اور اوجھل ہیں۔ بہت سے لوگوں کی نقل و حرکت رک گئی وہ گھروں میں قید ہو گئے۔ جو نقل و حرکت میں کبھی کوئی رکاوٹ محسوس نہیں کرتے تھے اب انتظار کرنے لگے کہ کب یہ آگ بجھتی ہے، آیئے دیکھتے ہیں کہ اس لکھنے والے نے کیا لکھا ''فری وے پر چلنے پھرنے' سفر کرنے کی آزادی نے زندگی میں خاص لطف پیدا کر دیا۔ انسان کو اس ماحول میں میسر دھوپ اور کشادگی کی لذت سے بھی آشنا کیا۔ اور اس طرح ایک بہت بڑے میٹرو پولیٹن علاقہ میں بے شمار فوائد (۴) اس کی دست رس میں آ گئے (۴)

تب ہم نے یہ سمجھا کہ یہ فری وے یا اس طرح کے فری وے کیسے ہیں جبکہ دوسری سڑکیں گلیاں سرفیس ہیں۔ فری ویز پر کوئی ٹیکس نہیں۔ یعنی ایسے خوفناک ٹیکس جن کی بنا پر نوآبادیات نے بغاوت کر دی تھی لیکن ایک ٹیکس روح اور عزم سفر (پاؤں) پر بھی ہوتا ہے۔ دوسری سڑکوں اور گلیوں میں تو آدمی کو رک رک کر چلنا پڑتا ہے لیکن فری وے پر پاؤں ایکسیلیٹر سے ہٹتا ہی نہیں۔ فری ویز آزادی کی دنیائیں ہیں... بہت زیادہ آزادی بلکہ تکلیف دہ حد تک انجلز والوں کا نام تو فرشتوں کے نام پر ہے۔ یہ خواب ہیں لیکن کبھی کبھی ان خوابوں کو یک دم بریک لگ جاتی ہے۔ لاس انجلز میں جو لوگ سرفیس (زمینی سطح پر) گلیوں میں سفر کرتے ہیں وہ سطح زمین پر مردود کیے گئے۔ انہوں نے آزادی، حرکت اور رفتار سے فیض حاصل نہیں کیا یوں یہ لوگ نوآبادیاتی غلام ہیں۔

بندے کا خیال ہے کہ لاس انجلز میں ہی یہ اصطلاح وضع کی گئی۔ ''زندگی تیز رفتاری (فاسٹ لین) میں ہے'' یعنی ایسی گلی میں جہاں انتہائی تیز رفتاری کا مظاہرہ کیا جاتا ہے مگر فاسٹ لین نام کی گلی کوئی نہیں ہے۔ تاہم 405 پر سفر کرنے والوں کا پکا خیال ہے کہ جس لفظ میں آزادی مجسم ہو گئی ہے اور جو ان کے خیال میں بس گیا روہ لفظ یہی فری ویز ہے چونکہ 405 فری وے ہے اس لیے یقیناً اس کی خوبی ہو گی کہ یہاں تیز چلا جا سکتا ہے، آسانی سے اس کے اوپر آیا جا سکتا ہے اور یہ انسانی روح کی آزادی کی خواہش کی بہترین نمائندہ ہے مگر حقیقت یہ نہیں۔ ان کا تجربہ ان سب صفات کے بالکل الٹ ہے۔ امریکہ کی شاہراہوں پر ٹریفک کی کیفیت کے بارے میں جتنی قومی رپورٹیں تیار کی گئی ہیں، وہ تصدیق کرتی ہیں کہ لاس انجلز کی سڑکوں پر سب سے زیادہ رش ہوتا ہے اور یہاں سب سے کم رفتار ٹریفک ہوتی ہے۔ انگریزوں میں موسم کو ضرب الامثال جیسی حیثیت حاصل ہو گئی اور زیادہ تر گفتگو موسم پر ہی ہوتی ہے اسی طرح لاس انجلز کی شاہراہوں پر ٹریفک کی صورت حال پر گفتگو ایک روائت بن گئی ہے۔ اس طرح فری ویز پر آزادی کی علامت بھی غتربود ہو گئی ہے۔ 405 پر قدم قدم چلنے والوں کے لیے سیپکو یڈ پر (خصوصاً پر بہار مناظر والے حصے، جن سے ہم گزرتے ہیں) سفر کرنے کا کھلا موقع موجود ہے مگر دوسرے معاملات کی طرح امریکیوں کا موقع سے فائدہ اٹھانے کا معاملہ بھی مجرد ہے اور وہ اسی سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور نہیں جانتے کہ کس طرح حالات ایسے پیدا کیے جائیں کہ ''مجرد'' کو ٹھوس حقیقت بنایا جا سکے۔

لاس انجلز کی فری ویز جدیدیت یعنی اس کے تخلیق کردہ علم اور اس کی شقوں یا زمروں یا خانوں کے بنیادی مسائل کی علامت یا عکاس ہیں۔ یہ علوم ترقیات' تاریخ، صرفہ، دہشت گردی اور قومی ریاست کے بارے میں بڑے بڑے موضوعات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض پر میں اسی باب میں بات کروں گا اور ان پر بھی جوان زمروں کی غیر تسلیم شدہ طاقت سے پیدا ہوتے اور جو استعماری حکم کی طرح ہم پر مسلط ہو گئے۔ اشیس نندی کا خیال ہے کہ اکیسویں صدی میں غلبہ یا طاقت دکھانے کے پرانے اور معروف اجتماعی یا منظم مفادات والے طریقے اختیار نہیں کیے جائیں گے۔ یعنی طبقاتی تعلق نوآبادیاتی نظام، فوجی صنعتی کامپلیکس وغیرہ وغیرہ صورتیں سامنے نہیں لائی جائیں گی۔ اب غلبہ زیادہ تر خانوں یا زمروں (علم کے) کے ذریعے حاصل کیا جائے گا'' (۵) ہوسکتا ہے کہ اس بیان کو بلا جواز سمجھا جائے کیونکہ کوئی یہ تصور نہیں کرسکتا کہ طبقاتی جبر ختم ہو جائے گا اور طبقاتی حکمرانیاں بے معنی ہو جائیں گی۔ بظاہر یہ انتہائی معمولی سی بات لگتی ہے جیسے آدمی اپنی کتاب 'کافی ٹیبل پر رکھ دے' اس کی جھلک پال فسل نے اپنے مزاحیہ جائزہ کے ذریعے ہمیں دکھائی ہے جس میں طبقاتی امتیازات بدرجہ اتم دکھائے گئے ہیں۔ قومی صنعتی کامپلیکس کو قابل ذکر دراز عمر ملی ہے مگر اب بات اختتام کو پہنچ رہی ہے جیسا کہ ہم پابندیوں پر پچھلے باب میں گفتگو کرتے ہوئے اشارہ دے چکے ہیں۔ مگر حکمرانی کی تو کئی اور شکلیں بھی ہیں۔ ہمیں نندی کے اہم اور مرکزی مشاہدہ اور مفہوم کی اہمیت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ خانوں کی تقسیم بتاتی ہے کہ کیا دوائیں اصلی ہیں یا جعلی۔ آیا معاشرے ترقی یافتہ ہیں یا پس ماندہ اور آمریت مطلق العنان ہے یا کلیت پسند۔ (مطلق العنانیت اور کلیت پسندی میں جو فرق ہے وہ ہمیں تو معلوم نہیں مگر ریگن کے زمانے میں امریکہ کی خارجہ پالیسی کی ذمہ دار انتظامیہ میں جین کرک پیٹرک اور اس کی ساتھیوں نے یہ فرق سمجھا اور قائم کیا تھا) اور یہ کہ انسانی زندگی کو طاقت سے ختم کرنا قتل کے زمرے یا خانے میں آتا ہے یا اس ضمانتی کا نقصان جس نے ضمانت دے رکھی ہو۔

جدید علوم کے اسی قسم کے زمرے تھے جس کے باعث اسی 1980 کی دہائی میں امریکہ میں سیاستدان قتل کی سالانہ تیس ہزار وارداتوں کو گلی کوچے کے جرائم کا نام دیتے رہے۔ اس کے مقابلے میں آئرلینڈ میں 70 (ستر) اموات کا سبب دہشت گردی بتاتے

رہے۔ جبکہ معاشرتی علم کا ماہر جب ذرا گہری نظر سے ان کا تجزیہ کرے تو یہی کہے گا کہ گلی کوچے کے جرائم اور دہشت گردی کی جڑیں عدم مساوات بے روزگاری کے علاوہ ان تغیر پذیر معاشروں میں ہو سکتی ہیں جہاں عالمگیریت اور مقامی معاشی تبدیلیوں کے باعث پرانی معاشرتی قدریں بڑی کمزور ہو گئی ہیں۔ خود سی آئی اے کا اندازہ ہے کہ 1969 سے 1980 تک عالمی دہشت گردوں کے ہاتھوں 3368 افراد قتل ہوئے لیکن صرف دو سالوں (66-1965) میں سہارتو کی مسلح افواج نے پانچ لاکھ سے زیادہ کمیونسٹ ہلاک کیے۔ پھر سہارتو کی اپنی فوجوں نے مشرقی تیمر میں اندازاً دو لاکھ افراد کو قتل کیا۔ لیکن چونکہ انڈونیشیا کمیونسٹ مخالف محاذ کا اہم حصہ تھا اس لیے امریکہ نے اسے کبھی دہشت گرد ملک قرار نہیں دیا۔ یا یوں سوچیں کہ امریکہ یہ کیوں کہتا ہے کہ وہ انسداد دہشت گردی کے ماہرین تیار کرتا ہے وہ یہ کیوں نہیں کہتا کہ وہ دہشت گرد پیدا کرتا ہے۔ حالانکہ امریکہ کی خارجہ پالیسی اور دفاعی انتظامیہ نے لاؤس اور کمبوڈیا میں غیر قانونی بمباری کی اور ستم ظریفی یہ کہ انسداد دہشت گردی کے ایک قانون کے تحت موت کے دستے (ڈیتھ سکواڈ) ایلسیلویڈور اور گوئٹے مالا میں قائم کروائے؟ ان امتیازی خوبیوں کے بھی کچھ نتائج نکلتے ہیں۔ میں نے گزشتہ باب میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ پہلے ملکوں پر دہشت گردی کا الزام لگایا جاتا ہے۔ پھر اپنی شتر مرغانہ صفت کی بنا پر دنیا بھر کے دیکھتے دیکھتے انہیں بدمعاش ملک کا نام دے دیا جاتا ہے۔ لفظ بدمعاش ریاست یا ملک کا استعمال امریکی سیاستدانوں کو حد درجہ مسحور کرتا ہے۔

ان زمروں کے بغیر پیشہ ورانہ معاشرتی علوم یا سائنس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے ذریعے ابلاغ اور آگاہی حاصل ہونی چاہیے مگر انہیں بڑے بے مثال طریقے سے دوسروں کو بے بس کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ تاہم کوئی زمرہ اس وقت تک بامعنی نہیں جب تک اس کا مفہوم آدھا اندر اور آدھا باہر نہ ہو۔ علم کے یہی زمرے ہیں جو ایک امریکی کو آزادی اور فردیت کا علمبردار بنا دیتے ہیں اور عرب کو دہشت اور جنون کا پتلا ثابت کرتے ہیں۔ ذرا غور کریں کہ اوکلا ہوماسٹی میں ہونے والے بم دھماکے کو کتنی تیزی سے اسلامی دہشت گردوں کے پیٹے میں ڈال دیا گیا تھا۔ پھر یہ علم چینی باشندے کو مشرق کے مکر کا نمونہ بنا دیتا ہے اور یہ ہندوستانی کو شہوت کا پتلا اور غیر ذمہ دار کثیر الاولاد گردانتا ہے۔ امریکہ کے اندر انڈین کو ایک ''مثالی اقلیت'' قرار دیا جاتا ہے۔ امریکہ میں ترک وطن

کر کے آنے والے کے بارے میں لکھی گئی روایتی تاریخ جو آج بھی رائج ہے، یہ کہتی ہے کہ جو لوگ اپنے ملک میں ناکام تھے وہ امریکہ میں آ کر کامیاب ہو گئے۔ تاریخ یہ نہیں بتاتی کہ ایک کامیابی امریکی بدصورت امریکی (اگلی امریکن) میں کیسے تبدیل ہو گیا۔ جو بے حد صرفہ کرتا ہے اور ایک خاص گروہ کا رکن ہے۔ جس نے اس زمین کے ختم ہو جانے والے وسائل کو مجرمانہ طریقے سے استعمال کیا۔ یہ ہے وہ کامیابی امریکی جس کی کامیابی ''اقلیت'' کو صاف کر دیتی ہے اور جو نہ ماحولیات کے بارے میں سوچ سکا اور نہ کثیر الا النوع ماحولیات میں کچھ کر سکا۔

ضروری ہے کہ علوم کے اس نظام نے جو جابرانہ کارروائیاں کی ہیں ان کو سنجیدگی سے دیکھا جائے اس لیے کہ صرف ترقی کے نام پر لاکھوں لوگوں کو مار دیا گیا، بے گھر کیا گیا، قلاش کر دیا گیا، ثقافتی طور پر مفلس بنا دیا گیا اور اب انہیں عجائب گھروں میں رکھنے کے اہل بنا دیا گیا۔ حالانکہ دنیا بھر میں پھیلیے یہ پس ماندہ سارے کے سارے لوگ تو اعلیٰ معیار زندگی یا اشیائے صرف تک بہت زیادہ رسائی حاصل کرنے کے خواہش مند نہیں تھے۔ انیسویں صدی لوگوں کو قابل دید (عجائب گھر کے حوالے سے) شے بنانے کی ثقافت کی صدی تھی۔ بیسویں صدی میں دنیا پر پھیلنے کی خواہش نے ان کو ان مقامات پر پہنچا دیا جہاں نوآبادیاتی ہاتھ بھی نہیں پہنچ پائے تھے اور پھر کارپوریٹ سیکٹر نے مختلف النوع رنگوں کی بقا اور فروغ کا کام شروع کیا اور لگتا ہے کہ اکیسویں صدی میں کثیر النوعی صورتوں کا فوسل (پتھر بنانے کا عمل) ریکارڈ تیار کرنے کی خواہش پوری ہو جائے گی۔ یعنی یہ سب کچھ صرف عجائب گھروں میں ہی دیکھنے کو ملے گا، جیسے ہی غیر ترقی یافتہ کو ترقی یافتہ بنانے کا عمل شروع ہوتا ہے ویسے ہی دراصل ان کے وجود کو منجمد اور ختم کرنے کا عمل بھی شروع ہو جاتا اور پھر وہ عجائب گھروں کے ہی قابل رہ جاتے ہیں۔

جدیدیت کے اور زمرے بھی ہیں مثلاً قومی ریاست اور ان کی بھی ایسی ہی افسوس ناک کہانی ہے۔ ہم قومی ریاست کے علاوہ کسی دوسری سیاسی شکل کو تصور میں لانے یا سوچنے کے قابل ہی نہیں رہے جیسے نسل انسانی کے خواب اور سرگرمیوں کی غائت الغایات ہی قومی ریاست ہے۔ کثیر الثقافتی اور شناخت کی سیاست کے ابھار کے باوجود قومی ریاست یہ سمجھنے اور تسلیم کرنے سے عاری ہے کہ کچھ عرصہ پہلے تک لوگ کیوں مختلف

شناختوں کے ساتھ بڑے آرام سے رہا کرتے تھے۔ ہندوستان میں اسی (۸۰) نوے (۹۰) کی دہائی کے شروع میں سکھوں کی علیحدگی پسندی کے حوالے سے ہونے والے فسادات یہ تاثر دے رہے تھے کہ ہندو اور سکھ ہمیشہ سے ایک دوسرے کے بدترین دشمن رہے ہیں۔ لیکن زیادہ دیر کی نہیں ایک آدھ نسل پہلے تک پنجاب کے کئی گھرانوں میں آدھے بچے سکھ اور آدھے ہندو کے طور پر پالے اور پڑھائے جاتے تھے (۸) ماضی میں یہ شناختیں کوئی اتنی سکہ بند نہ تھیں۔ بوسنیا اور روانڈا میں بھی یقیناً صورت حال بالکل ایسی ہی تھی۔ سراجیو جیسے وسیع المشرب شہر میں یہودیوں کی عبادت گاہیں کیتھولک اور آرتھوڈاکس چرچ اور مساجد شانہ بشانہ ایک ہی سڑک پر موجود تھیں۔ اب وہی سراجیو نسلی صفایا کی جدید صورت کا شکار ہو گیا ہے اور یہ صورت ہے مکمل طور پر نسلی پاکیزگی یا یکتائی کی اور ایسے ثقافتی طریق حکمرانی کی کہ جس میں مختلف النوع عناصر اور ماضی میں مختلف ثقافتوں کے اتحاد اور انضمام یا ساتھ ساتھ پھلنے پھولنے کی جو گنجائش تھی اسے ختم کر دیا جائے۔

جدیدیت کا سب سے بڑا مسئلہ اور فریضہ ہے شمار و قطار، زمرہ بندی تقسیم (کلاسیفیکیشن) اور ان کے درمیان سرحدوں کی ہمہ وقت نگرانی ہے۔ اسی صورت حال کو ملحوظ رکھیں تو پتہ چل جائے گا کہ یورپ کے ہر ملک میں خانہ بدوشوں کیے ساتھ ظالمانہ سلوک کیوں روا رکھا گیا۔ یہ لوگ ہر وقت حرکت اور نقل مکانی کی صورت میں رہتے تھے آج یہاں کل وہاں۔ چنانچہ شمار اور قطار اور تقسیم والی حدود کو نہیں مانتے تھے۔ اور ہر ملک کی افسر شاہی کے لیے مسئلہ بنے رہتے تھے۔ نازیوں نے خانہ بدوشوں کی جو نسل کشی کی اس کا ذکر عام ہوتا رہتا ہے لیکن 1945 سے لے کر 1989 تک ان پر پورے یورپ میں جو گزری اس کا ذکر کم ہی ہوتا ہے۔ اور پھر ادغام کی پالیسی بنائی گئی جس کی تکمیل یوں ہوئی کہ یہ خانہ بدوش بالکل غائب ہو گئے یعنی جو کچھ فاشسٹ خانہ بدوشوں سے کرنا چاہتے تھے وہ دوسروں نے کر دکھایا۔ مشرقی یورپ میں کمیونسٹ حکومتوں کے خاتمے کے بعد بھی خانہ بدوشوں کے خلاف امتیازی پالیسی پر عمل ہوتا رہا مگر خانہ بدوشوں کے باعث یورپی حکومتوں کو جو پریشانیاں لاحق تھیں وہ اب بھی سایہ فگن ہیں۔ خانہ بدوش پابندیوں کو نہیں مانتے تھے چنانچہ نجی اور سرکاری طور پر سرمایہ کاری کے حوالے سے اخلاقیات کار، نفع، کارخانے کا طریق اور زائد (پیداوار یا منافع) وہ ان سب سے لگا نہیں کھاتے تھے چنانچہ جدید قومی ریاست ان کی دشمن ہو گئی (۹) اسی طرح ماقبل جدید ہندوستان

میں ہیجڑوں کی موجودگی کوئی مسئلہ نہ تھی۔ علم البشریات کے ماہرین انہیں ''تیسری جنس'' (۱۰) کہتے ہیں۔ معاشرے نے ان کو زندگی گزارنے کی سہولتیں فراہم کر رکھی تھیں (۱۱) مگر جدید ہندوستان ان سے خوش نہیں اور انہیں کسی شمار میں نہیں لایا جاتا جو نہ مرد ہیں نہ عورت اور جو کچھ بھی نہیں ہیں ان کو معاشرے کا حصہ نہیں سمجھا جاتا۔ ہیجڑوں میں شامل ہیں۔ کھسی کیے گئے مرد، ماہی، منڈے زنانہ مرد، دوجنسی، جنس مخالف کا لباس زیب تن کرنے والے اور یہ وہ ہیں جو زمروں کی حد میں نہیں آتے۔ ان کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور ان بے چاروں کے بارے میں تو ابھی فیشنی قسم کی گفتگو بھی شروع نہیں ہوئی۔ کیا دنیا میں کہیں ایسی مردم شماری کا بھی سوچا جاسکتا ہے جس میں جنس کے خانے میں چار جنسی ڈبے (زمرے) ہوں، مذکر، مؤنث، دونوں نہیں، اور بیک وقت دونوں؟ (۱۲)

آج کے دورِ عالمگیریت میں مقبول عام ثقافت کے علمبردار پوری دنیا میں نظر آئیں گے، تجارتی جھگڑوں کا فیصلہ ڈبلیو ٹی او کے تحت ہوتا ہے اور تجارتی مارکیٹیں ایک دوسرے میں پیوست ہو چکی ہوں مگر ان سب سے زیادہ عالمگیریت جدید علوم اور ان کے زمروں یا خانوں میں رکھی گئی ہے۔ جدید علم جس طرح ہمارے خیالات میں پیوست کر دیا گیا ہے، اس نے دنیا کو سمجھنے سمجھانے کی ہماری اپنی صلاحیت پر بھی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے۔ ہمارے لیے انکار کی گنجائش بہت کم رہ گئی ہے۔ ہمارے تاریخوں اور ثقافتوں کی عظمت کو تار تار کر دیا گیا ہے۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو بھی ''بڑی پست سطح پر لایا گیا ہے۔ اور اس علم کے ذریعے دنیا بھر کے لوگوں کے مستقبل کے بارے میں سودا کر لیا گیا ہے۔ تو علم کی یہی صورت اکیسویں صدی میں ہمارا (بھوتوں کی طرح) پیچھا کرتی رہے گی۔ گزشتہ باب میں میں نے کہا تھا کہ اقوام متحدہ اور نیو ورلڈ آرڈر قسم کے عالمی ادارے قائم ہونے سے بھی حکمرانی کے مسئلے کو نہ آسان بنایا جاسکا ہے نہ امکانات روشن ہونے ہیں۔ کارل وان کلازی وٹیز کا مشہور مقولہ ہے ڈپلومیسی جنگ ہے، جنگی ہتھیاروں کے بغیر۔ ہوسکتا ہے کہ کسی کو یہ بیزاری پسند نہ آئے تاہم یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہمارے عہد میں ایسی ہی جنگ جاری ہے۔ مگر بے شمار مختلف صورتوں میں۔ پابندیوں کے نفاذ سے لے کر جبری ترقیاتی کاموں تک اور علوم کے حوالے سے تاریخ کا علم جسے عبودیت یعنی مقدس بت کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ جدید علم کی شاخیں خصوصاً معاشرتی سائنس تو دنیا بھر کی یونیورسٹیوں میں بجنسہٖ نقل در نقل

پڑھائی جا رہی ہیں اور اس باب کے آخر میں جدید علوم کے ڈھانچے کے بارے میں زیادہ تفصیل سے بحث کی جائے گی کہ علوم کو درسی سطح پر سیکھنے اور پڑھانے والے عالموں کی تمناؤں کی سیرابی نظریاتی اور سیاسی مفروضوں کے ذریعے کہاں تک ہوتی ہے۔

ترقی کا تشدد

اگر ہم بامان اور دوسروں کی تحریروں کے مطابق ہولوکاسٹ کا معاملہ سمجھ چکے ہیں کہ یہ معاشرتی انجینئرنگ کی ایک صورت ہے تو پھر ترقی کے نام پر لوگوں پر جو تشدد کیا گیا ہے وہ بھی دراصل اسی قتل عام (ہولوکاسٹ) ہی کی ایک کڑی ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں کوئی پانچ کروڑ چالیس لاکھ کے قریب فوجی اور غیر فوجی ہلاک ہوئے تھے۔ یہ بندے کو ہلا دینے والی تعداد ہے مگر ترقی کے نام پر جو انسانی جانیں تلف ہوئیں ان کی تعداد اس سے بھی بہت زیادہ ہے۔ روس نے پیداوار بڑھانے، زراعت کو اجتماعی شکل دینے اور تیز تر صنعتی ترقی کے لیے جبری مشقت رائج کی، یہ بھی تشدد کی ایک صورت تھی۔ اس کام میں لاکھوں جانیں گئیں یہ کوئی اعلیٰ قسم کے جنگی ہتھیاروں کے ذریعے ضائع نہیں ہوئیں بلکہ یہ لوگ بڑے سوچے سمجھے طریقے کی بھینٹ چڑھے اور موقف یہ کہ ترقی کی خاطر یہ قربانی تو لازماً دینا پڑتی ہے۔ ان کی جانیں ہمیشہ قربان یا ضائع کی گئیں مگر جس سرد مہری کے ساتھ بیسویں صدی میں یہ عمل دہرایا گیا ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ دوسری طرف خود ہم بھی اس زمانے کی تیز رفتار ترقی کے بارے میں اسی انداز میں سوچنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ میں چینی کمیونسٹ پارٹی کی تباہ کن معاشی پالیسیوں کا حوالہ دے چکا ہوں۔ سیاسی راہنماؤں اور کارندوں نے آگے کی طرف بڑی چھلانگ لگانے والے منصوبے میں اپنی رعایا کو حصہ لینے پر مجبور کیا اور اس حماقت کے باعث اڑھائی کروڑ سے تین کروڑ کے قریب باشندے بھوک سے مر گئے۔ مگر وہ اپنے معمول میں بھوک سے مرنے والوں کے ان طبقات کو ہولوکاسٹ کے خانے میں نہیں ڈالتے اور نہ ہی ان اموات نے ہمارے دل و دماغ پر ویسا زوردار اثر کیا ہے جیسا ہولوکاسٹ نے کر رکھا ہے۔ چینی تاریخ اور سیاست اور آبادی کے ماہرین کے علاوہ دنیا نے کبھی تاریخ کے اس پہلو پر تشویش کا اظہار نہیں کیا۔ فاقہ کشی سے ہونے والی اور جبری مشقت کے کیمپوں میں ہونے والی اموات کو تشدد کا شاخسانہ بتایا جاتا ہے۔ مگر کیا

یہ اموات جدیدیت کے ہتھیاروں مثلاً ترقی، قومی ریاست، افسر شاہی، فلاح کے کام پر تشدد ہی کے زمرے میں نہیں آتیں؟ معاشرتی انجینئرنگ کا شکار ہونے والے یقیناً یہ انتخاب نہیں کریں گے کہ وہ کس ڈھنگ سے مرنا چاہتے ہیں جبکہ اسی انداز میں بعض مرنے والوں کی یادگاریں قائم کر دی جاتی ہیں مگر ترقی کے نام پر مارے جانے والے بے نام و نشان ہو جاتے ہیں۔ انہیں جدیدیت کی قاتلانہ عادتوں کے سلسلے میں عوام کو باخبر رکھنے کے لیے قابل استعمال نہیں سمجھا جاتا۔

ترقی کا خیال اسی بات کی واضح مثال ہے کہ جدید نظام علوم نے انسانی معاشروں کی سالمیت اور یکتائی پر کیا کیا ضرب لگائی ہے۔ لفظ ترقی کو یوں کہیے کہ یہ اپنی قبریں کھودتا جاتا ہے مگر انہیں ساتھ ساتھ بے نشان بھی کرتا جاتا ہے۔ مثلاً والدین کو باور کرایا جاتا ہے کہ کوئی شے ان کے بچوں کی ترقی اور خوشحالی میں حائل نہیں ہونی چاہیے، جدید تر ثقافتوں میں ماہرین کی ایک فوج تیار کی جاتی ہے جو ایسے حالات پیدا کرنے کے دعویدار ہوتے ہیں جن میں بچوں کی بہترین ترقی ہو سکتی ہے۔ کوئی معقول آدمی اس طریق کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ "ماہرین" غیر ضروری یا فالتو ہیں۔ جس شے کو عام فہمی کہا جاتا ہے دراصل وہی ہمیں ترقی کے خانے میں ہولوکاسٹ، نسل کشی، قتل عام، تباہی اور محرومی کو ایک ساتھ نہیں رکھنے دیتی یعنی ہم معنی نہیں ہونے دیتی۔ ترقی کے خیال اور فلسفہ کی سیاسی آثار قدیمہ یا اثریات کی نمود کی راہ میں ایک رکاوٹ تو یہ ہے کہ قطع نظر اس کے کہ لینن نے یہ لفظ اپنی 1899 کی تحریروں میں روس میں سرمایہ داری کی ترقی (ارتقا) کے لیے استعمال کیا' اس کا مفہوم تھا کہ وسیع پیمانے پر صنعتیں (۱۳) قائم کریں اور ان کے لیے ایک مقامی مارکیٹ بھی بنائیں۔ جو حقیقتاً بیسویں صدی کا محاورہ اور عمل ہے۔ "نو آبادیاتی ترقی" کے مفہوم میں کہیں نو آبادیوں کی ترقی اور بہبود کا تصور شامل نہیں بلکہ اس کے برعکس اس کا مفہوم یہ تھا کہ ان کی دولت لوٹو یعنی ٹیکس بھی لو اور ان کے قدرتی وسائل بھی لوٹو۔ نو آبادیاتی ترقی دراصل نو آبادی کو پسماندہ رکھنے کا دوسرا نام تھا۔ ترقی کا صحیح معنوں میں مطلب بہبود یعنی وہ عمل جس سے فلاح میں کوئی مثبت اضافہ ہو، یہ تصور تو شروع ہی دوسری جنگ عظیم کے بعد ہوا۔

تاہم انیسویں صدی کے نصف سے مغرب کے اکثر معاشرتی مفکرین نے یہ بات

مان لی کہ ایک ترازو یا پیمانہ ہونا چاہیے جس کے ذریعے تہذیب کی ماہیت کو ناپا جائے۔ اس طرح کوئی تہذیب پیمانے پر پوری اترتی ہے یا اس کا پلڑا بڑا ہلکا ہوتا ہے۔ یہ دیکھنے کے لیے متعدد عوامل کو دیکھنا ضروری قرار پایا۔ ایک معیار یہ تھا کہ اس تہذیب میں عورتوں سے کیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ بہر طور تعجب کی بات نہیں کہ ہندوستانی تہذیب کو اس حوالے سے بہت ہی کم تر درجہ دیا گیا کیونکہ برطانوی سیاحوں، منتظمین اور اعلیٰ حکمرانوں نے (ستی) بیوہ سوزی، نومولود دختر کشی، بری ذات کا ہندو طبقوں میں عورتوں کی دوسری شادی کی ممانعت اور عورتوں کی تقریباً مکمل ناخواندگی اور بچی کی پیدائش کی پذیرائی نہ کرنے سے جو نتائج اخذ کیے اس حوالے سے عورت کے معاملے میں ہندوستانی تہذیب کو بہت نچلا درجہ دیا گیا۔ ہندوستانی معاشرہ کے مصلحین نے تہذیبوں کی اس قسم کی درجہ بندی کو فوراً مان لیا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے فیصلوں کے بارے میں نوآبادیاتی علوم نے جو معیار مقرر کیے تھے وہ سب کے سب اذکار رفتہ تھے۔ دراصل حقیقت یہ تھی کہ برطانیہ ہندوستان اور دوسری بہت سی نوآبادیوں پر حکمران تھا، یہی کچھ یورپ کے دوسرے ممالک اور ان کی نوآبادیوں کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یورپ ترازو کے ایک اونچے پلڑے میں تھا جبکہ نوآبادیاں نچلی سطح کے پلڑے میں۔ اس بات کا حکمرانوں کو پورا پورا احساس تھا اور پھر جب کبھی یہ بات سامنے آتی کہ حاکموں اور رعایا کی تہذیبوں میں یہ مشترک عناصر بھی ہیں اور اس طرح دونوں کی تہذیبی سرحدیں دھندلانے لگتیں تو نوآبادیاتی انتظامیہ پھر مقامی تہذیب میں کوئی ایسا پہلو ڈھونڈ نکالتی جس کا کوئی بھی مماثل یورپی تہذیب میں نہیں ہوتا تھا۔ ہندوستان میں اگر ایک انگریز یہ کہتا کہ برطانیہ میں عورت کو زیادہ عزت نہیں دی جاتی اور اس کی تعلیم تک بھی رسائی نہیں ہے تو اسے بتایا جاتا کہ برطانوی معاشرہ میں ستی کی ظالمانہ رسم نہیں ہے۔ اس طرح فجی یا بورینو میں آدم خوری کی مثالوں سے یہ تاثر دیا جاتا کہ یورپی لوگ بربریت کی اس انتہائی سطح پر کبھی نہیں اتر سکتے۔ اس معیار کے مطابق آدم خوری انسانی جان کی قربانی اور سروں کا شکار کسی تہذیب کے کمترین ہونے کی علامتیں قرار پاتی ہیں۔ سٹیفن گرین بلاٹ نے اس طریق کو ''علمی بندش'' کہا ہے۔ اس حوالے سے نوآبادیاتی طرز کے ان جائزوں پر نکتہ چینی کی گئی (۱۵) کیونکہ آدم خوری کی عملی یا تجربی حقیقت، یا اس کی کمی کو کوئی زیادہ اہمیت نہیں دی گئی (۱۶)

اسی قسم کے جائزوں کا ایک ترازو اب بھی موجود ہے جو ترقی کے فلسفہ کے حوالے سے بڑا مقبول بھی ہے۔ اس فلسفہ یا خیال کی ابتدا اس مفروضے سے ہوتی ہے کہ بعض قومیں یا ملک ترقی یافتہ ہیں بعض ترقی پذیر ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو پسماندہ رہنے پر مصر ہیں۔ جسے مشرقی کی کاہل الوجودی یا ایک تاریک براعظم کی شقاوت کا ثبوت سمجھا جاتا ہے۔ اکثر ان اصطلاحات کو دوسری اصطلاحات کے متبادل بنا کر دیا جاتا ہے لیکن الفاظ کے سارے مجموعے کے اپنے معنی اور معنی در معنی ہوتے ہیں۔ چنانچہ عموماً درجہ بندی یوں ہوتی ہے۔ ایک دنیائے اول ہے ایک تیسری دنیا ہے اور ایک کم نمایاں دوسری دنیا ہے جس میں سابق مشرقی یورپ کے ممالک شامل ہیں۔ دکھانا یہ مقصود ہے کہ دوسری دنیا کے سیکڑ کو تو محدود کر دیا گیا ہے اور اصل فریق پہلی دنیا اور تیسری دنیا ہیں۔ ایک جگہ ترقی یافتہ ملکوں کو حالیہ صنعتی معاشرہ (پہلے ہی یہ پرانا بوسیدہ مفہوم ہو چکا ہے) کہا جاتا ہے یا ایسی اقوام جو پکے اور لچک والے سرمایہ داری دور میں داخل ہو چکی ہیں، جہاں اطلاعات کا انقلاب آ گیا ہے اور سائبر بیس جمہوریت رائج ہے۔ جبکہ براعظم افریقہ اور برصغیر ہندوستان کے ممالک کو اگر ''پسماندہ'' نہیں کہا جاتا تو صنعت کی طرف رواں ملک کہا جاتا ہے۔ افریقہ میں صحارا کے ممالک کو بعض اوقات ''ناکام ملک'' کہا جاتا ہے۔ ہمیں یہ بھی علم ہے کہ جو ناکام قرار دیے جا رہے ہیں ان کا درمان یا علاج کہاں پوشیدہ ہے۔ دوسرے سرے پر ترقی کی لغات کے ماہرین ''بے انتہا ترقی یافتہ'' یا ضرورت سے زائد ترقی یافتہ کے الفاظ ان ممالک کے بارے میں استعمال کرنے سے ہچکچاتے ہیں جو ترقی یافتہ ہیں اور بدنام بھی۔ دراصل یہ لفظ ترقی ان ملکوں کے لیے ہے جہاں بیس فیصد سے زائد آبادی موٹاپے (فربہی) کا شکار ہے۔ ان میں سے بعض اصطلاحات دغابازی اور فریب کاری کی تاریخ سے پیوستہ ہیں۔ لچک دار سرمایہ داری کارپوریٹ معیشت کے طریقوں کا مختصر نام ہے۔ کارپوریٹ کے طریقوں یا تدبیروں کے ذریعے افرادی قوت گھٹانے جز وقتی مزدوروں کی تعداد بڑھانے، مستقل ملازمین کی تعداد گھٹانے اور لیبر یونینوں کو آختہ کرنے کا کام لیا گیا ہے۔

دوسری جنگ کے فوراً بعد دنیا کے کم ترقی والے علاقوں کو دعوت دی گئی کہ وہ زیادہ ترقی یافتہ ممالک کو اپنے ہاں ترقیاتی کام کرنے کے لیے بلائیں۔ اس وقت کسی نے مہاتما گاندھی کے مشاہدات پر دھیان نہیں دیا۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگر ایک چھوٹے سے

جزیرے کے لوگ اپنی ضرورتوں اور انا کی تسلی کے لیے دنیا کے غالب وسائل حاصل کر لے تو اس کے کیسے خوفناک نتائج ہوں گے ایسے ہی جیسے ہندوستان انگلستان کی نقالی پر نکل کھڑا ہو۔ اقوام متحدہ کے سماجی اور معاشی امور کے شعبے نے 1951 میں ایک دستاویز تیار کی تھی جس میں خوراک کی کمی، بیماری کے پھیلاؤ، بھوک، کم خوراکی اور پسماندہ ممالک کی پسماندگی اور معاشی زندگی کے جمود کو توڑنے کے لیے منصوبہ بنایا گیا تھا، مجموعی طور پر مدعا ان کی غریبی ختم کرنا ہے۔ اس رپورٹ میں کہا گیا تھا۔

> ''اس بات میں وزن ہے کہ بعض تکلیف دہ فیصلوں کے بغیر معاشی ترقی تیزی سے نہیں ہو سکتی۔ پرانے نظام فکر یا فلسفوں کو ترک کرنا پڑے گا، پرانے سماجی اداروں کو توڑنا ہو گا، ذات، عقیدہ اور نسل کے بندھنوں سے چھٹکارا پانا ہو گا اور ان بہت سے لوگوں کی اچھی زندگی کی توقعات ختم ہوں گی جو ترقی کی رفتار سے قدم ملا کر نہیں چل سکیں گے۔ بہت ہی کم قومیں معاشی ترقی کی پوری قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہیں'' (۱۷)

اس ''قیمت'' کی فہرست میں غالباً یہ کام شامل ہیں۔ انسانوں کے غیر پیداواری رشتوں کا خاتمہ، قومی وسائل کا بے مہابا استعمال، مذہبی اقدار اور روحانی احساسات کو ترک کرنا، روٹی روزگار کے روایتی طریقوں کا خاتمہ، آبائی زمینوں اور علاقوں سے بے دخلی، اخلاقی معیشت کی اہمیت کو کم کرنا۔ لوگوں کو کہا گیا کہ وہ پوری طمانیت سے ان معاملات کے بارے میں سوچیں۔ چنانچہ اس صورتِ حال کے بارے میں اقوام متحدہ کے ایک معروف افسر کا تاثر یہ ہے۔

> ''میرا اب بھی یہ خیال ہے کہ بہبود اور ترقی کا انحصار اس بات پر ہے کہ کس ممکن حد تک سائنسی تحقیق میں ترقی کی جاتی ہے اور کہاں تک اس کو لاگو کیا جاتا ہے۔ ایک ملک کی ترقی کا اولاً انحصار اس کے مادی حالات پر ہے اول علم اور دوسرے اس کے تمام قدرتی وسائل کا استعمال'' (۱۸)

1950 کی دہائی میں ترقی کے تصور نے ایک یقینی صورت حاصل کر لی، ایک طرف

اس کی رسائی عالمگیر اور دوسری طرف اس میں اتنا زور آ چکا تھا کہ یہ انسانی رشتوں کی بھی کلی طور پر چھان پھٹک کر سکتا تھا۔ تو یہ تھا بلاشبہ مستقبل کا واحد راستہ اور جو اس کو غلط نسخہ سمجھتے تھے اور ترقی کے اس تصور کو رد کرتے تھے، انہیں احمق، فریبی، سوختہ لاشیں اور تاریخ کے دھتکارے ہوئے بندے قرار دیا گیا۔ لیکن ترقی کے نام پر جو تشدد کیا گیا، اسے کبھی تشدد نہیں مانا گیا صرف اس لیے نہیں کہ ذرائع ابلاغ کے لیے اس معاملہ میں خبریت ہی کم تھی اور سنسنی خیزی بھی نہیں تھی۔ چین میں صرف ایک منصوبے (تین زیرکوہ ندیوں والا) کے مکمل ہونے تک بارہ لاکھ افراد بے دخل ہو چکے ہوں گے۔ (۱۹) کہا جاتا ہے کہ آبی بجلی کا یہ دنیا میں سب سے بڑا منصوبہ ہے۔ ہندوستان میں 1949 سے اب تک بڑے ڈیموں کی تعمیر کے باعث ایک کروڑ بیس لاکھ سے لے کر تین کروڑ تیس لاکھ تک لوگ بے گھر کیے جا چکے ہیں۔ ان بے گھر ہونے والوں کو ان کی زمینوں اور مکانوں کے بہت ہی حقیر اور ناکافی معاوضہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ملا۔ ان کو اپنے علاقوں میں جو ذریعہ روزگار میسر تھا وہ بھی نہ ملا۔ متاثرین میں زیادہ تر مختلف قبائل اور نیچی ذات سے تعلق رکھنے والا شامل ہیں جنہیں قومی مفادات کے نام پر مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے دعووں اور امتیازی حقوق سے بھی دستبردار ہو جائیں۔ اس بات کو بھی کوئی اہمیت نہیں دی گئی کہ ان قبائلی لوگوں کی اپنی دھرتی سے اس قدر شدید وابستگی ہے کہ اس کا بدلہ بڑی سے بڑی رقم بھی نہیں ہوسکتا۔ وہ اسی دھرتی کے حوالے سے اپنے پرکھوں کو یاد رکھتے اور اپنے ورثے کو اگلی نسلوں تک منتقل کرتے تھے۔ اسی سے ان کی زرخیزی اور اموات (پیدائش اور موت) بھی وابستہ تھی اور انہی سے ان کی ضمنیات کا وجود تھا۔ یہی دھرتی ان کو سکھاتی تھی کہ کس کا احترام کرنا ہے، چنانچہ جو بات دوسرے لوگوں کی نظر میں ویران اور بنجر نظر آتی تھی وہی ان کی نظر میں زرخیزی اور کثیر الاولادی کا سبب تھی۔ باہر والے جس بات کو ان کی جہالت پر معمول کرتے تھے وہ ان کے لیے دانش کا اور علم و حکمت کا خزانہ تھی۔ عالمی کمشن برائے ڈیمز نے حال ہی میں اپنی جامع رپورٹ شائع کی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ چار کروڑ سے لے کر آٹھ کروڑ تک باشندوں کو ڈیموں کی تعمیر کے باعث بے دخل کیا گیا ہے۔ اسی طرح قومی مفاد کے نام پر بنائے گئے قومی پارکوں، صنعتوں کے قیام یا حکومت اور فوج کی ضرورتوں کے تحت لاتعداد لوگوں کو بے گھر کیا گیا ہے۔ مگر پالیسی بنانے والوں کو اور ٹیکنالوجی کے (۲۰) دلدادگان کو کیا خبر کہ

اس طرح بے روزگاری بڑھی، مایوسی پھیلی، پرکھوں کی زمین سے محرومی ملی، زبردستی نقل مکانی کرنا پڑی اور مذہبی عقیدوں سے تعلق ٹوٹنے کے کیا کیا معنی اور اثرات ہوتے ہیں۔ اس سطح پر ترقیاتی تشدد کا مطلب ہے نسل کشی۔ یعنی ایک خاص گروپ کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اس میں زیادہ تر غریب اور پسماندہ لوگ ہوتے ہیں اور اکثر اوقات ان کا تعلق اقلیت سے ہوتا ہے یا یہ بہت قدیمی باشندے ہوتے ہیں جنہیں ان کے گھروں سے نکال دیا جاتا ہے۔ یعنی ایک تو وہ پہلے ہی اقلیت یا پسماندہ ہوتے ہیں اور بڑی اکثریت کا حصہ نہیں ہوتے یا کم کم ہوتے ہیں اس پر ان کو ان کے مخصوص علاقوں سے بھی نکلنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ مگر اس سارے عمل کو تشدد نہیں سمجھا جاتا۔ نسل کشی کرنے والوں کو تو اب زیادہ سے زیادہ تعداد میں عدالتوں کے سامنے لایا جا رہا ہے مگر بڑے بڑے ترقیاتی کام کرنے والوں کو اگر ان کی خدمات کی بنا پر انعامات سے نہیں نوازا جاتا تو انہیں حکومتوں اور بین الاقوامی تنظیموں کی طرف سے بڑے پرکشش مالی معاوضے دیئے جاتے ہیں۔

ترقی کے خیال یا فلسفہ کا مطلب تو یہ ہے کہ یہ آج کی حقیقت کو تبدیل کر دے۔ معاشرے جس جس مرحلے پر ہیں ان میں معاشرتی تبدیلی لائے اور سیاسی ارتقا سے ہمکنار کرے۔ (اس مرحلے پر رائے شماری والی جمہوریت کا سودا بیچا جا رہا ہے) لیکن اس ترقی کا ایک بہت ہی بھیانک پہلو یہ بھی ہے کہ یہ ترقی زمان و مکان کے بارے میں ہمارے تصورات کو بھی غلام بنا رہی ہے۔ ترقی پذیر ممالک کا آج دراصل دیروز (گزرے کل) سے قطعی مختلف نہیں تھی بعض اوقات یہ باقی ترقی یافتہ دنیا کے بھی ایک دور افتادہ اور دھند میں لپٹے ماضی سے مختلف نہیں اور اسی میں ترقی پذیر ممالک کا بھی ایک بڑا حصہ ہے۔ جو اس کے بعض اداروں اور اعمال میں یورپ کے ماضی کے عکس کی صورت میں نظر آتا ہے۔ یہ یورپی ماضی یا تو غائب ہو چکا ہے یا اس کے بہت ہی دھندلے نقوش باقی ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں جو ''بربریت'' ہے وہ دراصل ترقی یافتہ دنیا کے لیے ایک چتاونی ہے اس کے اپنے ماضی کی جسے وہ ایک عرصہ سے چھوڑ چکا ہے۔ اس ماضی پر عیسائیت، عقل پرستی اور مغربی سائنس کے بہت بڑے احسانات ہیں۔ ترقی پذیر ممالک کا مستقبل نہیں ان کا کوئی مستقبل نہیں اس لیے کہ ان کے مستقبل کا پتہ تو یورپ اور امریکہ کو ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ترقی یافتہ دنیا تو پہلے ہی اس مستقبل میں رہتی ہے جو ترقی پذیر دنیا سے ابھی بہت ہی

دور ہے۔ چونکہ ترقی پذیر دنیا کا تو مستقبل تقریباً وہی ہے جو اس وقت ترقی یافتہ دنیا کا حال ہے اس لیے قبائل اور کسانوں کا مستقبل وہی ہے جو انہیں زندگی کے بڑے محدود تصور والے منصوبہ سازوں نے دینا ہے یعنی انہیں ان منصوبہ سازوں کے اشاروں پر زندگی گزارنی ہے تو اس عمل میں ان پر چھوٹی سے لے کر بڑی سطح تک جبر ہوتا رہے گا۔ ترقی پذیر ممالک صرف اس مقام پر پہنچ سکتے ہیں جہاں سے ترقی یافتہ دنیا نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا اور یہاں پہنچ کر انہیں پتہ چلتا ہے کہ جس دنیا کی تقلید کی انہوں نے خواہش کی تھی وہ تو کوئی پسندیدہ دنیا نہیں ہے۔ جن بڑے بڑے ترقیاتی منصوبوں اور صنعتوں کے سلسلے میں انہوں نے جو جو کام کیے تھے ان کے بعض پہلو اب ضیاع اور زیاں بن گئے ہیں ماحولیاتی لحاظ سے نقصان دہ ہیں اور معاشرتی لحاظ سے ناپسندیدہ۔ اس کی ایک مثال ڈیم ہیں۔

زمینی اور جغرافیائی سیاست میں بھی ترقی پذیر دنیا کو کوئی زیادہ خودمختاری حاصل نہیں ہے۔ خوش بختی کا قطبی ستارہ تو مغرب کے افق پر چمکتا ہے اس لیے مشرق کو ہر صورت میں مشرقی روایات (پسماندگی) میں ہی رہنا چاہیے۔ اسے بھول جانا چاہیے اور بات بجا بھی ہے کہ اپنی سرحدوں کو مغرب پر بند نہیں کرنا، قومی سرحدیں بڑی ٹھوس ہوتی ہیں لیکن ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک میں سرحدیں مقدس نہیں ہوتیں چنانچہ یہاں ایک کشادہ معاشرہ کا قائم کرنے کے لیے دانائی کے تقاضے کے مطابق ملٹی نیشنل کارپوریشنوں، اور متعدد شاہانہ (سامراجی) تنظیموں، عالمی بنک، اقوام متحدہ، بین الاقوامی مالیاتی فنڈ اور کل ملی پاپ کلچر کی آمد و رفت کے لیے دروازے کھلے رکھنے ہوں گے۔ یہ رواداری لازمی ہے ان میں سے کسی ایک کی مخالفت کا مطلب ہے اس ملک کی مکمل طور پر مذمت۔ گویا جو ملک ایسا کرے گا وہ غیر ترقی یافتہ مرحلہ کی آخری سیڑھی سے بھی نیچے قرار دیا جائے گا۔ اس پر پسماندہ اور متعصب ہونے کے الزام آئیں گے اور پھر اسے یہ خطرہ بھی لاحق کر دیا جائے گا کہ وہ نپی تلی تہذیب کے دائرے سے بھی خارج ہو جائے۔ یورپ کا ضرر رساں کوڑ کباڑ قبول کرنے سے انکار کرنے کو بھی آزاد تجارت کی خلاف ورزی سمجھا جاتا ہے۔ مغربی طاقتوں نے اپنی پرانی نوآبادیوں کو پہلے بنجر علاقے (۲۱) قرار دیا، پھر ان بنجر علاقوں اور ان کے لوگوں سے چھٹکارہ حاصل کیا اور اب انہوں نے یہ دریافت کیا ہے کہ یہ علاقے ان کے کوڑ کباڑ (لغوی یا علامتی معنوں میں) (۲۲) کو ٹھکانے لگانے کے لیے بہت ہی مناسب ہیں۔ عالمی بنک

کے چیف اکانومسٹ لارنس سمرز نے ایک یادداشت لکھی ہے جس کسی نے بھی یہ یادداشت پڑھی وہ کبھی یہ بات آسانی سے فراموش نہیں کر پائے گا کہ افریقہ میں زیریں صحارا کے علاقے کو عالمگیر معیشت میں ایک شرط پر ضم کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے قدرتی وسائل ترقی یافتہ ممالک کو لے جانے کی اجازت دے اور اس کے بدلے ایسبیٹاس' لیڈز' گیسولین، ایٹمی فضلہ اور دوسرا زہریلا سامان اپنے علاقے میں پھینکنے دے۔" مجھے ہمیشہ یہ خیال رہا کہ افریقہ کے بہت سے ممالک میں آبادی اور ماحولیاتی آلودگی بہت کم ہے غالباً لاس اینجلز اور میکسیکو کے مقابلے میں ماحولیاتی اعتبار سے اس کی آب و ہوا بہت مختلف ہے اور زیادہ آلودہ نہیں ہے" جب سمرز نے "فضائی آلودگی اور فضلے کی عالمی تجارت بہبود میں اضافہ نامی مضمون لکھا تو ہمیں اندازہ ہوا ہے کہ اسے کس کی بہبود میں اضافہ مطلوب تھا (۲۳) سمرز نے کیسی خلاقی کے ساتھ ناکام براعظموں کے لیے ترقی کا ایک نسخہ تجویز کیا جس کے عوض اسے کلنٹن کے زمانے میں خزانہ کی وزارت مل گئی اور اب اسے ہارورڈ یونیورسٹی کا صدر بھی بنا دیا گیا ہے۔ بڑے دکھ کے ساتھ یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ غیر مغربی دنیا کو وہی کچھ بنایا جائز ہے جو اہل مغرب نے اس کے لیے سوچ رکھا ہے۔ خود کار تباہی کی پیش گوئی۔

تاریخ کی کمزور یادداشت

تاریخ، علم کا ایک معروف شعبہ ہے۔ علم کے زمرے کے حوالے سے ہم اسے کم ہی اہمیت دیتے ہیں۔ علم البشریات کے معروف امریکی ماہر مارشل ساہلنز کا کہنا ہے کہ لفظ کلچر (ثقافت) یا اس کا کوئی متبادل لفظ تو ہر شخص کی زبان پر ہے تبت اور ہوائی والے اجبوے، کواکتل اسکیمو قازق، منگول، قدیم آسٹریلوی، بالی والے، کشمیری اور نیوزی لینڈ کے ماوری ان سب کو معلوم ہو گیا ہے کہ ان کا ایک کلچر ہے۔" اگر ساہلینز لفظ ثقافت یا کلچر کی جگہ تاریخ لکھ دیتا تو یہ کوئی ایسا غلط نہ ہوتا مگر شائد وہ بنظر غور پیشگی اندازہ لگا چکا تھا کہ جدیدیت کے بعد کے دور میں علم کی کن کن صورتوں کا ہماری سوچ پر غلبہ ہو چکا ہے۔ آج کسی قوم یا گروہ کو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی کوئی تاریخ نہیں ہے مگر حال میں ہی بعض ماہرین کی طرف سے اقلیتوں کی تاریخ کی مختلف صورتوں میں گہری دلچسپی نے ایک ایسے علم کی اہمیت حاصل کر لی ہے جسے نظریاتی اعتبار سے کم ہی متحرک کیا گیا ہے۔ بہت سے لوگوں کو اندازہ ہوا

ہے کہ پچھلے زمانوں کے مورخ، معاشرے کے پسماندہ طبقوں کی زندگی کے تجربات کے بارے میں کم ہی دلچسپی لیتے تھے اور انہوں نے زیادہ تر سفید فام آدمی کے کارناموں کو ہموار انداز میں بیان کر دیا ہے یعنی اس میں اقلیتوں کی تاریخ کے پیوند نہیں لگائے گئے۔ چنانچہ اس ناانصافی اور زیادتی کا توڑ کرنے کا اقلیتی سرگرم کارکنوں اور علما نے تہیہ کر لیا ہے اور اب ہمارے سامنے شناخت پر مبنی تاریخ کے علم کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ خصوصاً امریکہ میں۔

حقیقت یہ ہے کہ جو سوال بہت زیادہ دلچسپ تھے انہیں کم اہم کر دیا گیا اور یہ اس لیے ہوا کہ اپنی شناخت پر مبنی تاریخ نے سوچا کہ انہوں نے تاریخ کے مطالعہ میں سیاست کو شامل کر دیا ہے، انہوں نے تاریخ اور اس کے اخراج کے بارے میں بہت اہم سوال اٹھائے اور یہ بھی کہ یہ کس کس طرح کس کس کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس طرح انہوں نے ایک بار پھر تاریخ سے ہی علم کی سیاسیات کو اخذ کر لیا ہے۔ ذاتی شناخت کو انتہائی بڑا مگر غیر دلچسپ موضوع بنا دیا گیا ہے اور اس کو بہت ہی ذاتی سطح پر انتہائی جذباتی انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تاریخی طریقوں کے بارے میں تنقید نے تاریخ کی تعلیمی انداز سے بھرپور چھان پھٹک کو قبولنے سے انکار کر دیا ہے۔ اس نے ان اداروں کو بھی سننے سے انکار کر دیا ہے جن کا انداز غیر تاریخی اور پیش گویانہ یا صنمیاتی ہے۔ مغرب میں تاریخ کے پیشہ ورانہ مطالعہ کا آغاز اٹھارہویں صدی عیسوی میں ہوا مگر درمیانے طبقے میں تاریخ کے بارے میں دلچسپی اس بھی پہلے سے شروع ہو چکی تھی۔ انیسویں صدی میں تاریخ ایک باقاعدہ علمی شعبہ بننے لگی۔ بیسویں صدی کے شروع میں یہ شعبہ بلندی پر پہنچ گیا اور اب یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں کہ یہ تاریخ ہی ہمارے عہد کا آفاقی بیان بننے والی ہے اور تاریخ میں دوسرے تمام اسی نوع کے شعبوں کے مقابلے میں زیادہ کشش موجود ہے۔ تاریخ نے یہ بلند مرتبہ کیسے حاصل کر لیا یہ کہانی اس گھڑی بیان نہیں کی جا سکتی۔ تاریخ کو کافی حد تک رسائی اور جدید علم تک پہنچ کا وسیلہ بنانے میں دو عظیم جنگوں کے بعد مندرجہ ذیل عوامل نے اہم کردار ادا کیا: فوجی تاریخ کی بلند مقامی، قوم پرستی میں کشش' تاریخ میں قوم کی حیثیت اور اہمیت، تاریخ کے بارے میں عظیم قائدین کا نظریہ، تاریخ سے سبق لینے کا نظریہ' ذاتی اور اجتماعی شناخت کو سرکاری سطح پر خاص مقام دلوانا اور اپنی شہریت کے شعوری حصول اور آگاہی کے لیے تاریخ سے لازمی واقفیت وغیرہ وغیرہ۔

بہرطور تاریخ کے بارے میں بھی تنازعات ہیں۔ خصوصاً ان ممالک کی تاریخ کے بارے میں بہت زیادہ جن کی تاریخ کو بڑا مستند اور جامع سمجھا جاتا ہے۔ وہاں لوگ اب بھی اس بات پر جھگڑا کرتے ہیں کہ نمائشوں، تاریخ کی نصابی کتابوں، یادگار تقریبات یا ذرائع ابلاغ میں جو کچھ پیش کیا جاتا ہے وہ غلط یا متنازع ہے۔ تاریخ میں ماضی کے بارے میں ہمیشہ متخالف موقف پیش کیے جاتے رہے ہیں اور علم تاریخ میں تاریخ نویسی اور مضبوط موقف کے انتخاب کا طریقہ دونوں روائتوں کو ہی مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ تاہم حالیہ رجحان تنوع اور کثیر الثقافت اور شناخت پر مبنی تاریخ کی طرف ہے اس میں مزید سنجیدگی اور تقویت مابعد سٹرکچر ازم اور مابعد نوآبادیاتی نظریہ سے آئی ہے۔ اس طرح ماضی کے بارے میں زیادہ متنوع قسم کے پس منظر بھی ابھرے ہیں اور تاریخ کے علمانے ہمیں اور بہت سے معاملات پر بھی توجہ دلائی ہے۔ تاریخ کون کہتا ہے؟ کس لہجے اور کس مقتدرہ کے حوالے سے؟ کیا شے تاریخ بناتی ہے یا تاریخ ہے کیا؟ لوگ کب تاریخ کا موضوع بنتے ہیں؟ دنیا جہاں میں تاریخ کی نصابی کتابوں پر طویل بحث شروع ہے کہ ماضی کی نوعیت کیا ہے اور تب نمائندگی کی سیاست یعنی حکمران کون تھے؟ جاپان میں تاریخ کی نصابی کتابوں کے بارے میں مباحثوں میں یہ بات زیادہ نمایاں ہوئی کہ ان کتابوں میں جاپان کی طرف سے جنگ کے دوران کیے جانے والے مظالم کا اعتراف کیا جائے۔ یہ معاملہ نہ صرف عدالتوں تک پہنچ گیا ہے بلکہ سرحدیں پار کر کے ان ہمسایہ ممالک میں بھی پہنچا ہے جن کو افسوس ہے کہ جاپان دورانِ جنگ کے اپنے رویے پر اب بھی ندامت کا اظہار کرنے کے لیے تیار نہیں۔ (۲۵) امریکہ میں نیشنل ہسٹری سٹینڈرڈ پر نظر ثانی کی رپورٹ 1996 میں جاری کی گئی جس کے بعد بعض متنازعہ امور سامنے آئے ہیں۔ امریکہ میں ندامت پسندی کا لفظ خاص معنی رکھتا ہے۔ امریکہ میں سیاسی منظر میں مؤثر طبقے ہیں انتہا پسند دائیں بازو سے لے کر اعتدال پسند دائیں بازو اور کبھی معمولی سے مؤثر لبرل ہوتے ہیں... چنانچہ ان طبقوں کا کہنا ہے کہ نئی معیار بندی میں امریکہ کے بانی بابوں (آبائے قوم)، امریکی آزادی کے منفرد کردار اور سفید فام کے رول کو بہت گھٹا دیا گیا ہے۔ اس کے مقابلے میں کثیر الثقافتی نکتہ نظر والوں کو اہمیت دی گئی ہے۔ ان مؤخر الذکر عالموں کا دعویٰ ہے کہ یہ نئے معیار بھی دراصل یعنی تھوڑے ارتدادی نوعیت کے ہیں۔ (۲۶) دریں اثنا ہندوستان میں بے

شمار اہم اداروں میں سرکاری مداخلت شروع ہو گئی ہے ان اداروں میں نیشنل کونسل فار ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ بھی شامل ہے اس کا کام ہے سکولوں کے لیے نصابی کتابوں کی تیاری۔ دوسرا ادارا ہے انڈین کونسل فار ہسٹاریکل ریسرچ جو تاریخ کے بارے میں تحقیق کرواتا ہے اور تاریخ کی کتابوں میں بلاشبہ ہندو قوم پرستوں کے خیالات کا غلبہ ہے۔ (۲۷) یہاں اس قسم کے تنازعے ہیں اور دنیا بھر میں بھی اس قسم کے جھگڑے چل رہے ہیں۔

میری ہرگز یہ کوشش نہیں کہ میں یہ کہوں کہ تاریخ غیر متنازع شعبہ ہے۔ یہ بات بہر طور عیاں ہے کہ لوگ جن جذبات واحساسات کے تحت تاریخ پڑھتے اور اس کی تعبیر کرتے ہیں وہ اہم بھی ہیں اور ان کا یہ اثر بھی ہوگا کہ اس طرح تاریخ ایک زیادہ نمائندہ، حساس، متحدہ یا متفقہ اور جمہوری شعبہ بن جائے گی۔ کیونکہ جو بھی اختلاف یا تنازعات ہیں وہ خاندانی نوعیت کے ہیں۔ ان کا زیادہ تر مقصد یہ ہے کہ کس طرح تاریخ کو زیادہ معتبر بنایا جائے۔ یعنی جن ذرائع اور وسائل کو ماضی میں نظر انداز کر دیا گیا انہیں زیر توجہ لایا جائے ان میں عورتوں اور کارکن طبقات کی لکھی ڈائریاں، سینہ بہ سینہ تاریخ اور نوادر ممنوع تاریخیں بھی شامل ہیں۔ پھر سوال کہ اسے اخلاقی اعتبار سے کیسے قابل قبول بنایا جائے جس میں کچھ پردہ نشین قسم کے عناصر بھی ہیں، اس خیال کو قبول کروایا جائے یا کہ مغرب کی تاریخ میں سامراجیت اور نسل پرستی رچی بسی ہے اور پھر ایک سچی اور مخلصانہ کوشش کے ذریعے روائتی تاریخ میں موجود خلاؤں کو پر کیا جائے۔ ابتدائی مرحلہ پر شعبہ تاریخ میں نئے عناصر اور زاویے شامل کرنے پر تھوڑی سی بڑ بڑ ہوئی تھی مگر جس آسانی کے ساتھ اس نے اپنے ڈھانچے میں اقلیتوں کے ماضی کو بھی شامل کر لیا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ موہوم یا خیالی کثیر الوجودیت پیدا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے اور ماضی کو سمجھنے کے دوسرے طریقوں کو ختم بھی کر سکتی ہے اور پھر ممکنہ منکروں یعنی اختلاف کرنے والوں کے لیے بھی اس میں طلسمی کشش موجود ہے۔ اب جبکہ عورتوں، مظلوم اقلیتوں، غلام بنائے گئے لوگوں، کارکن طبقوں اور مختلف قسم کے اچھوت لوگوں نے دیکھ لیا ہے کہ تاریخ کے دروازے ان پر کھلے ہیں تو تاریخی تحریروں کے بارے میں آخری اعتراضات بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ اب یہ بات عمومی سطح پر قبول کر لی گئی ہے کہ موجود تاریخی مواد میں تاریخ دانوں یا سوسائٹی کی

طرف سے مزاحمت کے بغیر بھی اتنی تحریف کی جا سکتی ہے کہ اس میں اقلیتوں اور مظلوم طبقوں کی تاریخ کو بھی شامل کر لیا جائے چنانچہ اب تاریخ کے سابق معترضین کے لیے بھی علم الوجود یا علمی نظریاتی مسائل باقی نہیں رہے۔ کثیر الثقافتی رجحان اور اقلیتی تاریخ کی شمولیت کے ساتھ ساتھ تاریخ نے باہمی شعبہ جاتی ادغام اور تاریخ عالم سے روابط قائم کیے ہیں اور اس طرح یہ پرانے ڈھانچوں اور انداز سے کچھ آزاد ہو گئی ہے ورنہ ماضی میں وہ انہی خانوں میں بٹی ہوئی تھی یعنی اشرافیہ کی تاریخ، سفید فاموں کی تاریخ، یورپی طاقتوں کی طرف سے وحشی اور درندہ صفت لوگوں کو مہذب بنانے کی تاریخ اور ان کے اور دوسرے حقائق کے پرستاروں کی تاریخ اثبات۔

تاریخ کا میدان وسیع ہو گیا ہے گویا ہمارے ارد گرد تاریخ کا پھندہ زیادہ کسا گیا ہے۔ اب اقلیتوں اور عالمی تاریخ کا کام یہ ہو گیا ہے کہ وہ ان مختلف علاقوں اور طبقوں میں باہمی گفت و شنید عام کرے۔ خصوصاً غالب اور مغلوب فریقوں کے درمیان مکالمہ کا اہتمام کرے۔ مگر میری التجا ہے کہ اس وقت دنیا کے اندر باہمی تعلقات انتہائی نامنصفانہ ہیں، شمال معیشت اور علم دونوں شعبوں میں غالب ہے اور اس مکالمے سے کثیر الوجودیت مزید نقصان اٹھائے گی اور ایک ہی رنگ کے غلبے کا رجحان بڑھے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ حساس ثقافتی نظریہ پرست کہیں گے کہ دوغلا پن سے رہائی کے لیے یہ مکالمہ ابتدائی طور پر بہت خوش آئند ثابت ہو گا (دوسرے معاملات کی طرح فرض کیا جاتا ہے کہ اس طرح ہمیں کچھ کشادگی ملے گی، اچھے خیالات کو خوراک ملے گی اور یہ کہ دوغلا پن مغرب کا مسئلہ ہے۔ باقی دنیا کے بڑے حصے میں زمینی حقائق ایسے تھے کہ بروقت اختلاط ہوتا رہتا ہے اس اصطلاح ''اختلاط'' کی طرف ثقافتی نظریہ سازوں نے دوغلا پن کے مقابلے میں ذرہ بھر بھی توجہ نہیں دی وہ دوغلا پن پر ہی نظر نچھاور کرتے رہے۔ اختلاط دراصل وصفی طور پر میں یا انا سے خالی ہے جبکہ دوغلا پن ایک موقف ہے۔ اپنی کارکردگی کو اچھالنے کی مابعد جدیدیت کی ایک شکل (۲۸)) تدریسی ہتھیار یا وسیلہ اور شعبہ مطالعہ کے طور پر تاریخ عالم پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں۔ بلکہ اسے لائق تحسین سمجھا جاتا ہے۔ امریکی طالب علموں میں بدنام زمانہ صوبائیت پائی جاتی ہے، جو خود اپنی تاریخ بھی کم ہی جانتے ہیں بھلا وہ سرحدوں کے باہر یعنی امریکہ سے باہر کی تاریخ کے بارے میں کیا جانتے ہوں گے چنانچہ یہ عامیانہ سا

مفروضہ ہے کہ ان پر عالمی تاریخ کا اثر جو بھی پڑے گا وہ اور تو کچھ ہو سکتا ہے مگر اچھا نہیں ہوگا۔ عالمی تاریخ پڑھانے والے اس کی بعض کمزوریوں کا خود بھی اعتراف کرتے ہیں۔ تاریخ عالم میں مہارت حاصل کرنا مشکل ہے۔ اس لیے کم از کم دو کاموں یعنی لسانیات اور وقائع نگاری میں مہارت بڑی ہی مشکل ہے۔ یہ دونوں کام ان لوگوں کو لازماً کرنا ہوتے ہیں جو تاریخ لکھتے یا تاریخ پڑھاتے ہیں اور اس میں خطرہ یہ ہوتا ہے کہ معاملہ کو بیکار عمومیت کی نذر نہ کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ اس بات پر بھی بڑا اختلاف ہے کہ کیا واقعی تاریخ عالم اتنی ہی حقیقی اور سچی ہے جتنا اس کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے یا دراصل یہ تاریخ صرف یورپ کی ہے اور اسے لشتم پشتم دنیا کی تاریخ بنا دیا گیا ہے۔ لیکن اس وقت تاریخ عالم پر سب سے بڑا بنیادی اعتراض بھی ہے جسے کبھی لٹریچر میں شامل نہیں کیا گیا اور وہ یہ کہ اس تاریخ عالم میں ایک بڑا خطرہ پوشیدہ ہے کہ اس طرح ناہمواری اور ناانصافیوں کی خلیج اور گہری اور وسیع ہو جائے گی۔ مزید یہ کہ اس میں زیادہ تر عام (دنیا) کے نام پر یورپ جلوہ گر ہے، جو لوگ اپنی آواز بلند نہ کر سکتے تھے یا اپنی آواز پہنچا نہیں سکتے تھے وہ ایسے ترجمانوں کے بس میں آ گئے ہیں جو سراسر اجنبی ہیں اور پھر جنہوں نے تاریخ کی زبان کو ہی رد کر دیا۔ ان کو یہ تاریخ سیاسی طور پر مزید کمزور یا ناتواں بناتی ہے۔ اس وقت تاریخ علم پر گماں ہوتا ہے کہ وہ ایسے معاملات میں پاک صاف ہے بلکہ کچھ زم خو بھی ہے مگر جو تجربہ ترقی، سلامتی کونسل اور نافذ کی جانے والی پابندیوں سے ہوا ہے اسی سے بندے کو خبردار ہو جانا چاہیے۔

بلاشبہ تاریخ عہد جدید کی علامت ہے، پھر یہ کہ ہندوستان اور افریقہ سمیت سبھی کی تاریخ مغرب کے حوالے سے لکھی گئی ہے اور اس مغرب میں صرف یورپ ہی شامل نہیں ہے وہ مغرب بھی شامل ہے جو اصلاً مغرب نہیں بلکہ غیر مغرب نے بنگلور میں کمپیوٹر (سافٹ ویر) کی انجینئرنگ کی صنعت اور ہندوستانی ایٹم بم بنانے والے تاریخ جانتے ہیں: یہ بے تاریخ لوگوں میں تاریخی ذہن رکھنے والے لوگ ہیں اور تو اور تقابلی مطالعوں کے بھی کوئی معنی نہیں بنتے اور ان کی شکل زیادہ تر یوں ہوتی ہے ہندوستان اور یورپ تا چین اور یورپ اور ان میں مرکزی نکتہ ہمیشہ یورپ ہوتا ہے۔ دوسرا نکتہ فیصل یہ ہے کہ مورخ کی قومیت کیا ہے اور دوسرے لائق توجہ کون سے شعبے ہیں۔ بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے کہ مورخ اس تقابلی طریق سے آگے نکلنے کی جسارت کرتا ہو تو پھر تعبیرات ان علمی زمروں کے ذریعے کرتا ہے جو مغرب سے لیے گئے

ہیں اور ان زمروں میں شامل ہیں قومی ریاست، ترقی، سیکولر زمانہ، خود مختار فرد، اور خود مختار تاریخ بھی۔ لیکن تاریخ کے بارے میں ہر جگہ ایک جیسا طرز احساس غالب نہیں تھا۔ بارہا یہ بھی بتانے کی کوشش کی گئی کہ ہندوستانیوں کے ہاں تاریخ کی جڑیں فکر وخیال میں گہری سطح پر پیوست ہیں مگر خود ہندوستان کا معاملہ یہ ہے کہ اس نے تاریخی افکار اور تاریخی علم کی ترتیب و تخلیق کو بری طرح نظر انداز کیا۔ (۳۰) ہندوستان میں تاریخ کا موضوع کچھ عرصہ پہلے ہی نمایاں ہوا ہے مگر اس کا زیادہ تعلق اس طرز فکر سے ہے جس نے ہندوستانی اشرافیہ کو قومی ریاست کا مہلک حد تک گرویدہ بنا رکھا ہے۔ ہندوستان میں بابری مسجد کا مسئلہ پیدا ہوا۔ یہ مسجد سولھویں صدی میں تعمیر کی گئی' شمالی ہند کے شہر ایودھیا کی اس جگہ کے بارے میں عسکریت پسند ہندو مذہبی راہنماؤں نے دعویٰ کیا کہ یہاں پر رام پیدا ہوئے تھے اور یہاں ایک ہندو مندر تھا۔ اس مسئلہ کے حوالے سے مؤرخین کو اہمیت حاصل ہوئی اور ان سے کہا گیا کہ وہ تاریخی حقائق کے بارے میں اپنی تحقیق سامنے لائیں۔ (۳۱) مؤرخوں نے بڑی سنجیدگی کا مظاہرہ کیا مگر یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ان مؤرخین میں سے کم نے ہی لوگوں سے یہ سوال کرنے کے بارے میں سوچا کہ کیا کسی ایک مؤقف کی تاریخی تصدیق ہو جانے کے بعد لوگ واقعی اسے قبول کر لیں گے؟ کیا اہل ہند اس ضمن میں تاریخ کی زبان اور محاورہ میں بات کریں گے۔ عجب بات ہے کہ بنیاد پرستی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ صنمیات اور قصے کہانی کی زیادہ دلدادہ ہے جبکہ عموماً بنیاد پرستی اور سیکولرازم میں ایک بات مشترک ہے کہ دونوں کو تاریخی طریق کا شوق اور صنمیات سے نفرت ہے۔ بنیاد پرستوں کی تاریخ یقیناً بہت بری تاریخ ہے مگر یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ تاریخ صنمیات کی دنیا ہے۔

تاریخ اپنے اس دعوے کے ساتھ ہماری توجہ طلب کرتی ہے کہ ماضی کی یادوں کو زندہ رکھنے کے لیے اور اس زمانے کے انسانی تجربے سے ربط رکھنے میں وہ بہترین وسیلہ ہے تاہم تاریخ کے بارے میں جو بھی نظریات ہیں ان کا تنقیدی تجزیہ کرنے کے لیے ایک تفسیر یا توضیح کی ضرورت ہے جو ہمیں یہ شعور دے گی کہ یادگیری کی بعض صورتیں فراموشی ہی کی کچھ صورتیں ہوتی ہیں۔ مثلاً اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انسانیت کے خلاف جنگ کے دوران جو ظلم ہوتا ہے عوامی سطح پر اس کو یاد رکھنے میں جاپان کے مقابلے میں جرمن لوگ سب سے آگے ہیں۔ متعدد مبصرین نے یہ بھی کہا ہے کہ جاپان والے اسی بنا پر اپنے ماضی کو پوری طرح یاد نہیں رکھ سکتے۔ تاہم اس بات پر یقین کرنے کا کوئی ٹھوس جواز نہیں کہ جو قومیں تاریخی فکر ونظر کی طرف مائل ہوتی ہیں وہ زمانہ حال بہتر طور پر گزارنے کی زیادہ اہل ہوتی

ہیں یا ان کا مستقبل کا تصور زیادہ واضح اور ٹھوس ہوتا ہے یا یہ کہ ان کے اعمال بڑے نیک ہوتے ہیں۔ عوام وخواص میں یہ خیال بڑا گہرا اور عام ہے اور ان کو تاریخ سے سبق لینے کے قصے عام سنائے جاتے ہیں اگر اس حوالے سے تاریخ ہمارے اخلاقی عمل وفکر میں راہنما ہوتی، تو پھر ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ جن اقوام میں تاریخ کا شعور اور آگاہی زیادہ ہوتی وہ عالم انسانیت کے لیے اخلاقی مثالیں بھی قائم کرتی جاتیں۔

لیکن ہم اپنے زور دار دلائل کی بنا پر اب بھی کہتے ہیں: ہندوستان کے معاملہ کو سامنے رکھتے ہوئے یہ ممکن ہے کہ ہم تاریخ کو جاننے کے علم کی حیثیت سے فلسفہ اور تاریخ کی بنیاد پر مبنی دلیل کے ذریعے اس علم کو ہی مسترد کر دیں۔ جیسا میں کہہ چکا ہو کہ اہل ہند کو تاریخی علم پیش کرنے میں کبھی کوئی زیادہ دلچسپی نہیں رہی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ برطانیہ کی ہمنوائی میں ہم بھی کہیں کہ عدم دلچسپی کا سبب یہ ہے کہ ہندوستانیوں میں تنقید وتجزیہ کی صلاحیتوں کی کمی ہے۔ ہندوسانیوں نے تو ریاضیات، علم النجوم، جمالیات، لسانیات' قانون' فلسفیانہ تنازعات، مابعد الطبیعات اور علم الادویات پر ڈھیروں لٹریچر لکھا ہے۔ ہندوستانیوں کا غیر تاریخی مزاج، ہندوستانی تہذیب کا ایک بہت ہی مسحور کن اور دیرپا پہلو ہے اور اکثر ہندوستانی گاندھی کی اس بات سے اتفاق کریں گے کہ ''میرے نزدیک مہابھارت تاریخی ریکارڈ نہیں ہے مگر یہ بڑی ناقص تاریخ ہے'' اور جب وہ یہ کہتے ہیں کہ ''میں اس موقولے میں یقین رکھتا ہوں کہ وہ قوم بڑی خوش ہوتی ہے جس کی کوئی تاریخ نہیں ہوتی'' (۳۲) یہی سن کر ہر مکتبہ فکر کے قوم پرست اور جدیدیت پسند چاہتے تھے کہ گاندھی قتل ہو جائے۔ ہندوستان کی تاریخ دان یا تاریخ سے باخبر اشرافیہ نے گاندھی کو دفن (فراموش) کر دیا ہے۔ (فراموش) کیونکہ تاریخ، غیر تاریخی زبان یا عہد کو بیان کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی اس طرح تو صرف قدامت، پسماندگی اور صنمیات ہی باقی رہ جاتی ہیں۔

جدید علم کا شعبہ جاتی ڈھانچہ

میری دلیل یہ ہے کہ اکیسویں صدی میں بہت بڑی جنگیں علم کی صورتوں پر لڑی جائیں گی جس کے نتیجے میں جدید علم کا ایک ایسا شعبہ جاتی ڈھانچہ پیدا ہوگا جس میں سیاسی اعتبار سے نسلی جغرافیہ کو زیادہ اہمیت حاصل ہوگی۔ درسی سطح پر یہ شعبے اپنی معروف تعریف پر

بخوبی پورے اترتے ہیں۔ معاشرے کے سرپھرے یا ضدی عناصر کو زیر دام لانے کا کام کرتے ہیں اور اس طرح عدم مساوات کا جواز فراہم کرتے ہیں۔ جس کی نئی صورتیں ڈھالتے ہیں اور اختلافی آواز کو دباتے ہیں۔ ہم سب کو معلوم ہے کہ ڈاکٹر اور کیمسٹ مختلف ادویات کے فروغ کے لیے دو ساز کمپنیوں سے کمشن وصول کرتے ہیں، بے شمار ماہرین سگریٹ ساز اداروں کے لیے کام کرتے ہیں اور انہوں نے شہادت دی ہے کہ تمباکو نوشی اور کینسر میں کوئی مشترک یا باہمی تعلق نہیں پایا گیا۔ اس طرح امریکہ کی فیڈرل ڈرگ ایڈمنسٹریشن کے مقررہ معیار پر بھی سودا بازی ہو رہی ہے بلکہ اس تنظیم کو دنیا کی بہت ہی اعلیٰ اور شہرت یافتہ ادارہ شمار کیا جاتا تھا (۳۳) کارپوریٹ سیکٹر نے کس طرح تحقیق کا کام اپنی مرضی سے کروایا اس کی یہ چند ایک بہت ہی بڑی اور عوامی سطح پر جانی پہچانی مثالیں ہیں۔ بعض حالیہ جائزوں سے اندازہ ہوا ہے کہ کارپوریٹ سیکٹر اور سائنس دانوں اور عالم فاضل لوگوں میں اس قسم کا کاروبار تو بہت وسیع سطح پر ہو رہا ہے۔ (۳۴) باقی ان کے علاوہ دفاع اور انٹرنیشنل سیکورٹی کے شعبوں سے ان کے تعلقات تو عرصہ دراز کی بات ہے۔ (۳۵)

مختلف شعبوں کے علم کا مسئلہ تو بہت گمبھیر ہے۔ درسی شعبوں نے دنیا کو اس طرح قابو کر رکھا ہے کہ موجودہ جدید علم کے ڈھانچے سے ہٹ کر کوئی بھی دانش درانہ، معاشرتی، ثقافتی یا معاشی کام کرنے کا مطلب ہے ممنوع حدود کی خلاف ورزی یا مراجعت۔ یعنی اسے قدامت پسندی، رجعت پرستی اور مقامیت کے القابات دیئے جائیں گے۔ جس کا حاصل کچھ بھی نہیں۔ بہر طور بندے کو یہ سوچنا چاہیے کہ معاشیات کی سائنس اور معیشت دانوں کو ہمارے عہد کے پنڈتوں (سیانوں) کا بلند مقام کیوں دے دیا گیا۔ ان کا ہر لفظ جب سامراجی مالی اداروں عالمی بنک اور عالمی مالیاتی ادارہ کی غلام گردشوں سے ہو کر نکلتا ہے، اور ایسا قانون کیوں بن جاتا ہے جو ترقی پذیر ملکوں کی تذلیل کرتا ہے۔ ہر چند یہ عالم لوگ قوموں کی قومی روایات سے واقف ہیں۔ مثلاً ان کے نزدیک اینگلو امریکی فلسفے کی امتیازی خاصیت یہ ہے کہ اس کا ایک تجزیاتی پہلو بھی ہے جبکہ سٹرکچرل ازم کے زیادہ چاہنے والے فرانس میں پائے جاتے ہیں لیکن انہیں جاپانیوں کی فزکس یا اسلامی معاشیات کی بات بالکل ہی سمجھ میں نہیں آتی۔ (۳۶) جاپانی فزکس کا مطلب صرف جاپان سے وابستہ ہے

اس کا امریکہ میں فزکس کے کلچر سے کوئی واسطہ نہیں (۳۷) مگر رائج اصول کے مطابق یہ کہنے کی گنجائش نہیں کہ ہوسکتا ہے فزکس کی ایک سے زیادہ قسمیں ہوں۔

ہر چند عالمگیریت پر زبردست لٹریچر تیار کیا گیا ہے مگر اس میں اشارتاً بھی یہ ذکر نہیں کہ رسمی علمی فریم ورک اپنی نوعیت میں سب سے زیادہ عالمگیر ہے کیونکہ اس نے دنیا کے کونے کونے میں بہت سے تجربہ شدہ اور آزمودہ نسخے دیئے ہیں۔ یہ نسخے ہیں ترقی، ٹیکنالوجی کی ترقی، کامیاب انتظام اور جمہوریت کے بارے میں۔ سماجی علوم کے بارے میں تاریخی طور پر یورپ اور امریکہ میں کچھ اختلاف چلے آتے ہیں مثلاً فرانسیسی یونیورسٹیوں (۳۸) میں سوشل سائنس کی الگ فیکلٹی نہیں ہوتی۔ مگر سماجی علوم تو ہر جگہ ایک ہی جیسے ہیں اور یہ بھی یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ سبھی جگہ ان پر عمل ایک ہی طرح ہوتا ہے۔ نائیجیریا، زمبابوے، بنگلہ دیش، فرانس اور چلی کے معیشت دان امریکہ اور برطانیہ کے معیشت دانوں سے بخوبی آگاہ ہیں۔

چند سال پیشتر جب کینٹکی فرائیڈ چکن (کے ایف سی) نے ہندوستان میں اپنا پہلا ریستوران کھولنا چاہا تو کشادگی اور نو سامراجیت کے مخالفوں نے اس کی ڈٹ کر مخالفت کی اور دہلی میں جو مظاہرہ ہوا اس کی پریس میں وسیع اشاعت ہوئی تھی۔ اس طرح زرعی کاروبار سے متعلق مونسینٹو نے جب حیاتیاتی اعتبار سے تبدیل شدہ اشیائے خورد ونوش کو متعارف کرانا چاہا، خصوصاً وہ بیج جو ایک فصل دینے کے بعد خود ہی ختم ہو جاتا ہے تو اس کی شدید مخالفت ہوئی اور اب بھی زور وشور سے مخالفت ہو رہی ہے۔ مخالفانہ کارروائیوں کو بھی پریس میں نمایاں جگہ دی گئی۔ (۳۹) آزاد تجارت کے معاہدوں کے خلاف سیئٹل، کیوبک سٹی اور ڈیووس میں جو زبردست مظاہرے ہوئے وہ تو لوگوں کو اب تک یاد ہیں مگر یہ بھی یاد رکھنے والی بات ہے کہ امریکی طرز کے انتظامی امور کے سکولوں کو ساری دنیا میں پذیرائی مل رہی ہے اور امریکی کی ایم بی اے کی ڈگری عالمگیریت کی انتہائی اہم کڑی ہے اور دنیا کے بہت بڑے حصے میں ایک نسل سے زیادہ تک امریکی ماہر معاشیات پال سمیوئیل سن کی نصابی کتابوں کا رواج رہا۔ (۴۰) یہ وہ معاشی لکھاری ہے جس نے 1986 میں کہا تھا "میں غلطی نہیں کرتا، غلط کہلوانا ناپسند کرتا ہوں۔" جب امریکہ اور برطانیہ کے انداز کی سماجی سائنس کی کتابیں پسماندہ دنیا پر چھا جاتی ہیں تو کوئی احتجاج نہیں کرتا۔ غیر یورپی اور غیر

امریکی دنیا میں جو معاشی ماہرین، سماجی منصوبہ ساز سماجیات کے ماہرین اور سیاست دان ترقی اور افلاس کے جن حوالوں سے کام کرتے ہیں، انہیں مغربی ماہرین نے کئی نسلوں سے مقدس حد تک محترم بنا رکھا ہے۔ اور تو اور کوکا کولا یا ڈزنی کے مقابلے میں بھی مغربی علم کا ڈھانچہ درسی شکل میں ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ ہر سیاح جہاں دنیا کے کسی بھی حصے میں جاتا ہے تو وہاں نائک شوز، بینیٹیڈ، لیوی کی جینز اور (1990 میں شکاگو کی بلز ٹی شرٹ) دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ مگر عالمگیریت پر اظہار خیال کرنے والے کسی بھی فرد نے اس بات پر تبصرہ نہیں کیا کہ ماڈلنگ کہاں تک پہنچ گئی اور سوشل سائنس کی ریاضیاتی صورتوں کا پھیلاؤ کہاں تک ہو گیا ہے۔

سماجی علوم کے ارتقا کی داستان تب سے شروع ہوئی ہے جب جغرافیہ تاریخ، سماجیات اور علم البشریات وغیرہ کو الگ الگ درسی شعبوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس داستان پر امریکہ کا سایہ بڑا گہرا ہے کیونکہ برٹن بلیڈسٹین کے الفاظ میں ''امریکہ کے پاس ایسی روایات کم ہیں جو مستند ذریعہ بنتی ہیں'' چنانچہ وہ خاص طور پر یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ان کے ہاں سائنس یا علم کی کمی نہیں ہے۔ مقتدرہ کی روائت سے محرومی یا روائت کی مقتدرہ سے محرومی کے باعث ان پر رحمتوں کا نزول بھی کم ہوتا ہے۔ اس لیے توقع کی جاسکتی ہے کہ ان کے پاس فالتو قسم کے سائنس دان یا اہل علم ہیں۔ اس لیے امریکہ کو ماہرین پیدا کرنے پڑتے تھے۔ علوم کو جب پیشہ ورانہ صورت دے دی گئی تو پھر ان کو یونیورسٹی میں لانا بھی لازم تھا۔ پروفیسر کا شعبہ بنانے کے لیے معیار بھی وضع کرنا ضروری تھا۔ پھر نصاب کا تعین، تحقیقی مجالس کا قیام، مخصوص قسم کے رسالوں کی اشاعت، مقالوں کی اشاعت اور پھر ان سب کو الگ الگ صورت دینا لازم تھا۔ یعنی ایک مضمون کو دوسرے مضامین سے ملانا یا متعدد دوسرے شعبوں اور ضمنی شعبوں سے وابستگی کا اظہار ضروری تھا۔ ان شعبوں کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی اور جدید علوم کا بلند آہنگ ذکر قرونِ وسطیٰ کی جہالت اور بے خبری کے ڈیم توڑنے لگا جس سے اس خیال کو تقویت ملی کہ ان علوم میں سے کسی ایک سے بھی وابستہ عالم فاضل شخص سچ کی تلاش کی قسم کھائے ہوئے ہے اور راہ میں جو جھوٹ فریب نظر آتا ہے اسے مسترد کرتا جاتا ہے۔ دلیل کے طور پر مثال دی جاسکتی ہے کہ ہم عصر سماجی ماہرین، ارتقا میں یقین رکھنے والے بائیولوجسٹوں اور مؤرخوں نے اصلاح نسل کے دعویداروں کے

دعووں اور نسلی طور پر وسیع کیے گئے علم کے ان نتائج کو مسترد کر دیا ہے جنہیں ان کے پیش رو انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے ابتدائی حصوں میں قبول کرنے پر مائل تھے۔ تاہم اب عموماً اس بات کی طرف دھیان نہیں دیا جاتا کہ انیسویں صدی کی نسلی اصلاح کے اسباق بیسویں صدی کے ترقی کے اسباق میں ڈھل گئے ہیں اور پیچھے زیر بحث لائے گئے ترقی کے مضمون کی طرح کہ اس کا بھی ارتقائی ڈھانچہ اسی طرح بنایا گیا ہے۔ لوگوں اور قوموں کو زمروں اور خانوں میں تقسیم کیا گیا ہے مثلاً پسماندہ، ترقی پذیر اور ترقی یافتہ، لیکن چونکہ کوئی بھی گروہ اپنے آپ کو پسماندہ یا ترقی پذیر خانے میں نہیں رکھنا چاہتا، اس لیے زمروں کے اثر' پھیلاؤ اور قبولیت کے نتائج بڑے پرفریب ہیں۔ چنانچہ جب کوئی ان معاملات پر غور کرنا شروع کر دے تو ان علوم کی مزید ترقی اور اعتبار' ایک دوسرے سے علیحدگی کی واضح لکیر اور ان کا یہ دعویٰ کہ وہ انسان کے بارے میں ماہرین کے وضع کردہ علم کے مختلف شعبوں کی نمائندگی کرتے ہیں اور پھر ان کے ساتھ ساتھ ان کے بارے میں روائتی قسم کے مگر بڑے ہی خوش کن مفروضے یہ سب پریوں کے قصے نظر آنے لگتے ہیں۔

سماجی علوم میں متعلقہ نظریاتی کمزوریوں اور علم کے ڈھانچے میں سیاسی قدامت پسندی کی بہتر تفہیم کے لیے مختلف شعبوں میں جو جو زمرے بنائے گئے ہیں اور جنہیں بڑ امقدس بنا دیا گیا ہے ان کو سمجھنا ضروری ہے۔ قلت یا کمی افلاس اور خواندگی اس قسم کے تین، زمرے یا خانے ہیں ان دنوں افلاس کے بارے میں جو گفتگو وغیرہ چل رہی ہے اس کا محور ماہر معاشیات کا یہ مفروضہ ہے کہ افلاس کی ایک لکیر ہے جو کوئی اس لکیر کے نیچے ہے وہ مفلس ہے۔ اس تصور کی زیادہ واضح صورت تاریخ کی یادداشت سے کھرچ کر الگ کردی گئی ہے۔ تاریخی طور پر دیکھا جائے تو بہت سے لوگوں نے خود افلاس کا انتخاب کیا اور جدیدیت والوں کا یہ محض خیال ہے کی غریب لوگ ہمیشہ ایک مسئلہ بنے رہے ہیں۔ (۴۲) اور اگر بالفرض وہ ایک مسئلہ تھے بھی تو یہ واضح نہیں ہوتا کہ اس مسئلے کو نظر انداز کیوں کیا گیا: ''حالانکہ آزادی کا بہت طویل القامت مجسمہ (سٹیچو آف لبرٹی) یہ ایما لیزارس کے یہ مصرعے درج ہیں'' اپنے غریب اپنے بے گھر اور بے سہارا لوگ مجھے دے دو'' لیکن اب امریکہ نے ایسے ناپسندیدہ غریب لوگوں کے امریکہ میں آنے پر دیوار کھڑی کر لی ہے۔ افلاس کیا ہے؟ اس کے بارے میں بڑی مختلف آرا اور روایات بنی ہیں۔ فارسی زبان

میں ان لوگوں کے لیے تیس سے زائد لفظ ہیں جنہیں غریب سمجھا جاتا ہے جبکہ مختلف نوعیت کے غریبوں کے بیان حال کے لیے اطالوی زبان میں چالیس لفظ ہیں (۴۳) حضرت عیسیٰ کا قول ہے: ''ایک اونٹ آسانی سے سوئی کی سوراخ میں سے گزر سکتا ہے مگر اس کے مقابلے میں ایک امیر آدمی جنت میں داخل نہیں ہو سکتا۔'' (انجیل متی 24-19) تو آج کے سماجی منصوبہ سازوں، معیشت دانوں اور ترقی کے ماہرین کو حضرت عیسیٰ کا یہ قول ایک مذاق نظر آتا ہوگا جو باعث خفت بھی ہے کیونکہ ان کی مہارت کا مقصود تو صرف یہ ہے کہ غریبوں کو کس طرح صارفین کی صنعت میں شامل کیا جائے یعنی اپنے مال کے گاہک بننے کے قابل بنایا جائے اس امید کے ساتھ کہ کوئی تو امیر بن جائے گا۔ یعنی ناگوار حد تک صرفہ کرنے والے طبقے کے رکن۔

جس غریب کا ذکر سماجی علوم کرتے ہیں وہ بھی دراصل جدیدیت ہی کا تراشا ہوا ایک پیکر ہے۔ اس کی تعمیر میں دوسرا عنصر ہے وہ خلا یا فاصلہ جو مہمیز لگائی گئی ضرورتوں اور ان کو پورا کرنے کے لیے وسائل کی کمی کی صورت میں پایا جاتا ہے۔ اس کا عکس دنیا بھر کی قیمتوں کی فہرستوں میں نظر آتا ہے۔ خواہشات میں اضافہ سماجی علم نے کیا۔ اسی علم نے یہ بھی بتایا کہ صارفین کے طبقے میں اسی وقت اضافہ ہوتا ہے جب لوگوں کو افلاس کے فرش سے اوپر اٹھایا جاتا ہے مگر یہ علم یہ دیکھنے اور ریکارڈ کرنے کے لیے تیار نہیں کہ صارفین یا صرفے میں اضافہ کے باعث صرف معاشی اعتبار سے ہی نہیں سیاسی اعتبار سے بھی مکالمہ سنگین ہوتا جاتا ہے اور مفلسی بڑھتی جاتی ہے۔ معاشی ماہرین، سیاستدانوں، تاجروں اور پالیسی سازی کے ماہرین کا مسئلہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک غریب وہ ہیں جو بہت ہی معمولی صارفین ہیں ان کے لیے جو کم خرچ سے سرکاری گھر بنائے جاتے ہیں اور وہ جو ایک آدھ وقت کی روٹی کھاتے ہیں جس سے بہت ہی کم منافع کمایا جا سکتا ہے یا بالکل کوئی منافع نہیں ہوتا۔ جو صرف (خرچ) نہیں کرتے اور دراصل وہ خود صرف ہو جاتے ہیں۔ جدید معاشی گزر بسر یا وجود قائم رکھنے کا یہی خوفناک قانون ہے۔ جب تک غالب معاشی عمل منافع بخش رہتا ہے غریبوں سے کہا جاتا ہے کہ وہ اس معاشی عمل میں اپنا حصہ ڈالیں یا کام کریں کیونکہ وہ اس وقت کچھ دینے کی پوزیشن میں ہوتے ہیں مگر اب جبکہ ان کی بقا میں پیداوار کی جگہ صرفے نے لے لی ہے تو غریبوں کے بارے میں یہی خیال کیا جاتا ہے کہ وہ معاشرے پر بوجھ بن گئے ہیں اور معاشرے کے وسائل

چٹ کر رہے ہیں۔ یہ ایک طرح سے محسوس کیا جانے والی چتاوَنی ہے صارفین کے طبقے کے لیے کہ اگر اسے بھی کام سے کوئی رغبت نہیں رہتی تو اس کا حال بھی ویسا ہی ہوسکتا ہے۔ اس ''ناسور'' کو خلق خدا کی نظروں سے غائب کرنے کا قابل قبول راستہ ایک ہی ہے کہ غریب کو امن وامان کا مسئلہ بنا دیا جائے۔ اس طرح سے سماجی علم کی سمجھ میں تھوریو کی یہ بات کبھی نہیں آئے گی کہ ''آدمی کی امارت کا اندازہ اس سے لگایا جاتا ہے کہ اس کے پاس وہ کتنی اشیا ہوں، جن کا وہ متحمل ہوسکتا ہے۔'' اسی قسم کے مشاہدات کو یا تو تصوف کے کھاتے میں ڈال دیا گیا ہے۔ یا اسے ان لوگوں سے منسوب کر دیا گیا ہے جو نیو ایج فلسفوں کے ماننے والے ہیں یا اسے سادگی پسندی کے حوالے سے ذاتی نجات خانے میں ڈال دیا گیا ہے۔ سماجی علوم کے عالموں کے نکتہ نظر سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ غریبی ایک معاشی مسئلہ ہے اور مسئلہ آمدنی کے محدود وسائل کا استحقاق سے کم حاصل کی بنا پر پیدا ہوتا ہے اور آمدنی کی کمی کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ غریب لوگ ست الوجود ہوتے ہیں اور کام کی اخلاقیات کے بھی مخالف ہوتے ہیں۔

اسی طرح سماجی سائنسدانوں کا خیال ہے کہ کسی معاشرے یا قومی ریاست کی ترقی جانچنے کے لیے بہترین اور غیر متنازعہ پیمانہ اس کی خواندگی کی شرح ہے۔ انسانی ترقی کے انڈکس (ایچ ڈی آئی) کا ایک اہم بنیادی پتھر یہی خواندگی ہے۔ پہلے کئی ملکوں کی ترقی کا اندازہ کل ملکی/ قومی پیدوار سے کیا جاتا تھا، تاہم یہ طریقہ (خواندگی والا) ان پیمانوں سے بہتر ہے اگرچہ خواندگی کا تصور بھی 1883 میں سامنے آیا اور تعجب کی بات نہیں کہ یہ تصور امریکہ میں پیدا ہوا ہو جو ترقیاتی تصورات کے بارے میں سوچ بچار کرنے والے ملکوں کی صف اول میں شامل تھا۔ بعض اوقات یہ تصورات علم کے جابرانہ زمروں کی بجائے کسی قوم کے دوسروں کے مقابلے میں ترقیاتی درجے اور ارتقا کو ماپنے کے کام میں لائے جاتے ہیں۔ خواندگی کا تعلق دراصل ان الفاظ اور اصطلاحات کے مجموعے سے ہے جن کے ذریعے ماپنے، ترتیب دینے' قدر و قیمت متعین کرنے، حکمرانی کے انداز دیکھنے یا مردود قرار دینے کا کام لیا جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر ملکوں کی خواندگی کی شرح ماپنے کا کیا مطلب ہے۔ اس پیمانے کے ذریعے ہی بعض ملکوں کو دوسروں پر فوقیت دی جاتی ہے اور بعض کی خواندگی کی شرح کم ہونے پر گوشمالی کی جاتی ہے۔ خواندگی کا سیاسی مفہوم یہ ہے کہ غیر

خواندہ... یا میں یوں کہوں کہ دنیا میں ان کی جگہ ہی نہیں ہونی چاہیے۔ ان کی طاقت تک اور سماجی اداروں تک کوئی رسائی نہیں کیونکہ انہی اداروں کے ذریعے ہی دنیا کی توجہ اپنے مسائل پر کرائی جاسکتی ہے۔ غیر خواندہ لوگوں پر صرف ترس کھایا جاسکتا ہے وہ اندھیروں، خلفشار اور افلاس کی یادگار ہیں ان مصائب سے صرف خواندہ لوگ بچائے جاسکے۔ خواندگی بلاشبہ معاشرے کا دروازہ اس پر کھولتی ہے جو اس میں داخل ہونا چاہتا ہے مگر یہ کچھ راستے بند بھی کر دیتی ہے یعنی روایتی طور پر رزق کمانے اور دوسروں سے عزت واحترام حاصل کرنے کے راستے۔ ہیومن ڈیویلپمنٹ انڈکس (خط ترقی انسان) کے موجد مرحوم محبوب الحق نے (ایچ ڈی آئی) کے تین اہم اجزا بتائے تھے۔ ''طوالت، علم اور آمدنی مگر انڈیکس میں صرف خواندگی (۴۴) کے پیمانہ کو سب کچھ سمجھا جاتا ہے۔ مگر خواندگی کو اتنی آسانی سے علم کا متبادل سمجھا جاسکتا تو پھر تاریخ انسانی کا بہت بڑا حصہ اور کروڑوں کی محنت جن کی اکثریت ناخواندہ تھی اور جو اس سرزمین پر آباد تھے، سب کو ضیاع یا زیاں ہی سمجھا جانا چاہیے۔

انہوں نے جو شعبے بنائے ہیں اور ان کے جو زمرے اور خانے بنائے ہیں دراصل انہی نے ہمیں ناکام بنایا ہے۔ ہر چند بدقسمتی سے ہر مرحلے پر اس کو رد کیا گیا مگر یہ معقول مفروضہ ہے کہ کسی علم کے نظام کی موضوع وار ترتیب اس لیے دی گئی تاکہ ہم دنیا کو بہتر طور پر جان سکیں، دنیا کے شور وشر سے محفوظ ہو کر کسی مسئلے پر یکسوئی سے سوچ کر اس کا حل نکال سکیں۔ میں نے جس بڑی ناکامی کا ذکر کیا ہے اس کو سمجھنے کے لیے ایک ابتدائی طریقہ یہ ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ انسانی مصائب کم کرنے میں ان علوم کا کتنا حصہ ہے اور پھر ان شعبوں کے کامیابی اور ناکامی کے اپنے تجویز کردہ معیاروں کے مطابق یہ دیکھا جائے کہ عملاً ان کی کامیابی کتنی ہوئی اور فائدے کتنے ہوئے۔ اس کے جواب میں ہوسکتا ہے کوئی یہ کہے کہ انیسویں صدی کے آخر سے لے کر اب تک پیداوار، عالمی تجارت، قومی آمدنی اور انفرادی دولت میں اضافہ معاشی نظریات کے ساتھ ساتھ مادی کیفیات مثلاً قدرتی وسائل کے استعمال اور سائنس اور ٹیکنالوجی میں اضافہ کا بھی مرہون منت ہے۔ چلو یوں سہی تو پھر جنوب اور شمال کی قوموں میں جو اتنی عدم مساوات پیدا ہوئی ہے اور زیادہ دولت کا چند ہاتھوں میں ارتکاز ہوا ہے اور غریبوں کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہوا تو کیا یہ سب کچھ معاشی نظریے کی بدولت ہوا ہے؟ ان مسائل پر غور کرنے کے لیے جو بڑی بڑی کوششیں اور

تحقیقات ہوئی ہیں ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے کوئی بھی یہ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہے کہ انہوں نے غربت اور محرومی کے مسئلے کو حل کرنے میں کوئی کامیابی حاصل کی ہے۔اس کے برعکس اگر وہ یہ تجویز کرنے کی جرأت کریں کہ معاشی معاملات کا کچھ تعلق عدم مساوات کے خاتمے، ضیاع کو کم کرنے، پیداوار اور اضافہ کے بارے میں قائم نظریات کی پرکھ کرنے اور ضرورت سے زیادہ ترقی یافتہ ممالک میں معیار زندگی (لائف سٹائل) کو خاصی حد تک کم کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ اخلاقی طور پر ان اقدام کا کیا جانا ضروری ہے تو ایسی صورت میں اکثر معاشی ماہرین یہی کہیں گے کہ اس طرح سے بے روزگاری بڑھے گی۔ بندے کو شبہ ہوتا ہے کہ معاشی ماہرین کا قبیلہ دراصل معاشرتی مسائل کو مزید سنگین بنا رہا ہے اور ناانصافی اور عدم مساوات کی نئی صورت پیدا کر رہا ہے۔

اسی قسم کے دلائل دوسرے علوم کے بارے میں بھی دیئے جاسکتے ہیں۔اس ضمن میں ایک مثال علم البشریات (انتھروپالوجی) کی ہے۔ یہ علم سامراجی عہد یعنی غلبے کے زمانے میں وضع ہوا اور اس کی وجہ جواز یہ تھی کہ ان لوگوں کی مختلف النوع رسم و رواج اور زندگی کا مطالعہ کیا جائے جن کے درمیان مغربی معیاروں کے مطابق ذہنی، سماجی، ثقافتی اور سیاسی تاریخوں کے حوالے سے کچھ بھی مشترک نہیں یا بہت ہی کم اشتراک پایا جاتا ہے۔اس طرح مغربی عالم انسانیت کی کثیر النوع صورتوں کی ایک جامع تصویر بنا سکیں گے یا آج کے کم ترقی یافتہ لوگوں کے موجودہ طرز زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے وہ خود اپنے ماضی کی تفہیم کر سکیں گے۔ یہ سچ ہے کہ اس ساری صورت حال کو بڑی معتبر شکل دی گئی۔ چنانچہ مارشل سالینز نے ثقافت اور اس کی وجوہات کے حوالے سے سوال اٹھایا۔"مارکس نے تاریخ اور ثقافت کی مادی تعبیر کا جو نظریہ قائم کیا تھا اسے بجنسہٖ قبائل معاشروں کو سمجھنے سمجھانے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے" (۴۵) اس تحریر کے وجود میں آنے تک (1976) ساہلینز وہ لفظ استعمال نہیں کر سکا ہوگا جو اس کے پیشروؤں نے استعمال کیے جیسے قدیمی، وحشی، یعنی ان الفاظ کے ذریعے اس نے بدنامی نہیں کمائی ہوگی مگر آدمی کو بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان جوڑہ جوڑہ لفظوں میں کیسی خاندانی مشابہت پائی جاتی ہے۔قبائلی، وحشی، قدیمی یا ابتدائی، غیر ترقی یافتہ... اور علم البشریات (قدیمیوں کا مطالعہ) اصلاح نسل (نسلی حسب نسب اور حکمرانی)، معاشیات (ترقی یافتہ یا صاحب ثروت طبقے کا مطالعہ اور جائزہ) ساہلینز کا ایک

پسندیدہ موقولہ یا ضرب المثل تھی مغرب کی نظر میں پیسے کی وہی اہمیت ہے جو باقی لوگوں کی آپس کی رشتہ داری کی ہے (۴۶) تاریخ (ان کا مطالعہ جنہیں وقت کا وافر شعور ہے) وغیرہ وغیرہ۔

اس میں شک وشبہ والی گنجائش کم ہی ہے کہ جن معاشروں پر علم البشریات والوں کی نظر ہوگئی یا انیسویں صدی میں یا اس سے پہلے عالم فاضل قسم کے افسروں کے ماتحت آئے ان میں عمودی یعنی شدید زوال آیا اور اکثر وہ ناپید ہوگئے۔ علم البشریات کے بارے میں آج بھی کچھ دانشور یہ کہتے ہیں کہ یہ دراصل یورپ کے علم کی نادر مثال ہے مگر ان معاشروں کی اس سے بڑھ کر اور کوئی بد قسمتی ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ وہ حلیم العلم علم البشریات کا نشانہ بن گئے۔ اگر علم البشریات خود کو نوآبادیاتی ماضی سے علیحدہ نہ کرتا، اس کے اندر خود فکری اور دروں بینی نہ ہوتی اور اگر یہ ان لوگوں کے ساتھ ہمدرد نہ ہوتا جن کا وہ مطالعہ کرتا ہے تو یہ کبھی بھی ایک علیحدہ علم کے طور پر وجود نہیں پا سکتا تھا۔ پیٹرک ٹیرنی نے علم البشریات کے امریکی ماہرین نپولین شیگنان اور جینیٹسٹ جیمز نیل نے یہ الزامات لگائے ہیں کہ انہوں نے امریکہ کے ژانو بامی انڈین قبیلے میں، سائینٹفیک ترقی کے نام پر خسرے (کاکڑا لاکڑا) کے جراثیم پھیلائے ہیں جن کی روک کے لیے ان کے جسم میں کوئی بھی انسدادی صورت موجود نہ تھی اور پھر ان کو متشددانہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور کیا تاکہ باقی دنیا کو دکھایا جا سکے کہ وہ اسی قدر وحشی ہیں جس قدر ان کو علم البشریات نے دکھایا ہے۔ یہ کوئی ایسی غیر اہم یا انہونی بات نہیں ہے نہ ہی کم اہم ہے۔ (۴۷) تاہم ان الزامات میں کس قدر صداقت ہے اس سے ہٹ کر بھی بات ایک حد تک صحیح ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم البشریات کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسان کی سماجی اور ثقافتی بوقلمونی میں کمی آئی۔ ایسا نسل کشی، زبان کی موت اور معیار زندگی میں زیادہ یک صورتی پیدا کرنے کی وجہ سے ہوا۔ یہ محض اتفاق نہیں بلکہ علم البشریات کے فروغ کے ساتھ ساتھ ہوا۔ امریکہ کے قدیم باشندوں کے ساتھ کام کرنے والے علم البشریات کے کئی امریکی ماہرین امریکی پالیسیوں پر صاد کہتے ہیں۔ ان پالیسیوں کے تحت جن کو پرانے باشندوں کے طرز زندگی اور ثقافت کا انچارج بنایا گیا انہوں نے ہی ان باشندوں کے زوال اور خاتمے کا سامان کر دیا۔ (۴۹)

علم البشریات والوں نے یہ رویہ اختیار کر لیا ہے کہ انہوں نے اپنے موضوع پر ابھی

بہت کچھ سیکھنا ہے۔ انہیں تو پتہ ہی نہیں کہ یہ علم بڑا وسیع ہے۔ اب وہ مانتے ہیں کہ مقابلے اور جھگڑے سے ان کے علم کو کچھ حاصل نہیں ہوگا ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ شاید اس طرح کچھ لوگوں کو مالی فائدہ ہوا ہوا۔ اب لوگوں کو مہذب بنانے کی باتیں بھی مقابلتاً کم ہوتی ہیں یا یہ کہ ماہرین بشریات کا مشن لوگوں کو مہذب بنانا ہے۔ اب بشریات کے ماہرین جن لوگوں کے بارے میں کام کر رہے ہوتے ہیں ان کے پاس عاجزی کے ساتھ جاتے ہیں۔ اب اس پیشے میں کچھ راہنما اصول بھی بن گئے ہیں کہ کس طرح زیر موضوع لوگوں سے سلوک روا رکھنا ہے اور کن کن اخلاقی اصولوں کی پاسداری کرنی ہے لیکن ایسی صفات والا بشری عالم کم ہی ملے گا۔ اسی طرح معاشی میدان میں بھی ایسے ''مرتد'' بہت ہی کم ملیں گے ... جو عالم اپنی تحقیقات کر کے واپس آیا ہو اور اس کا واضح طور پر تاثر پکا ہو گیا ہو کہ ''بشری لحاظ سے تو ہمیں خود اپنے بارے میں تحقیق کرنی چاہیے'' یہ تبصرہ فیلکس پیڈل کا ہے جس نے اڑیسہ (ہندوستان) کے ایک قبیلہ کونڈ کے بارے میں تحقیق کی تھی۔ یہ تحقیق بڑی معرکتہ الارا ہے۔ کونڈ قبیلہ اب بھی انسانی قربانی کی رسم ادا کرتا ہے۔ کونڈ قبیلہ انگریز مشنریوں، افسروں اور بشریات کے ماہرین کی نظر میں آیا۔ سبھی انہیں وحشی سمجھتے اور ان کی کوشش تھی کہ یہ انسانی قربانی کی رسم چھوڑ دیں۔ لیکن پیڈل کا کہنا ہے کہ جس طرح انگریز انتظامیہ اور مغربی عالموں نے اس قبیلے کے ساتھ سلوک کیا وہ بہت ہی برا اور ناگوار تھا۔ انگریزوں نے آدم قربانی کی یہ رسم ختم کرنے کے لیے اتنے لوگ مار دیئے جتنے کہ قربانی کے ذریعے مارے نہیں گئے ہوں گے۔ انگریزوں نے دوسروں کو درس عبرت دینے کے لیے کونڈ قبیلے کا بہت ہی برا حال کیا۔ ان کے سرداروں کو سر عام پھانسی دی، ان کے دیہات کو جلا دیا اور ان کی عورتوں کی عصمت دری بھی کروائی۔ مختصراً یہ کہ خود انگریزوں کا کونڈ سے سلوک بربریت سے کم نہ تھا۔ پیڈل کے تبصرے سے پہلے ایک برطانوی افسر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس پر الزام تھا کہ اس نے پلیگ کے مرض میں مبتلا کونڈوں کا علاج کیا۔ پیڈل نے اس افسر کے حوالے سے کہا کہ برطانوی حکومت بیک وقت سختی اور نرمی سے کام لیتی تھی مگر اس نے انسانی قربانی سے بھی زیادہ مکروہ طریقے سے کونڈوں کی جان لی۔ (۵۰)

ہو سکتا ہے کہ عیسائی پدرسری سوچ کے نمائندہ انگریزوں کو یہ بات اچھی نہ لگی ہو کہ کونڈوں کی بڑی دیوی دھرتی ماتا ہے اور یہ کہ انسانی شکل میں بھی وہ عورت ہی ہے۔ شائد

ان کے بارے میں انگریزوں کی تشویش کی ایک وجہ یہی ہو۔ کونڈوں کا دنیاوی نکتہ نظر یہ تھا کہ دھرتی دیوی ہر سال ایک انسان کی قربانی مانگتی ہے اور اگر یہ قربانی نہ دی جائے تو پھر فصلوں کا بھی نقصان ہونے اور انسانی جانوں کو ضرر پہنچنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ پیڈل نے بڑا ہی مؤثر بیان لکھا ہے کہ ہر قربانی کے بعد مجلس عزا برپا ہوتی تھی، پیڈل کا کہنا ہے کہ کونڈوں کی انسانی قربانی کو اس حوالے سے دیکھا جائے کہ دراصل اس طرح وہ انسانی زندگی کے بھرپور اثبات کا اہتمام کرتے تھے۔ ان کے مقابلے میں انگریزوں نے انسانی زندگی کی ذرا پرواہ نہیں کی...... انہوں نے دیہات جلا دیئے، زمین کو جلا کر خاک کر دیا اور انہوں نے ثابت کیا کہ انہیں ماحولیات کا بھی کوئی لحاظ اور شعور نہیں۔ اگر پیڈل کے بیان کو مزید آگے بڑھایا جائے اور انسانی قربانی کے وسیع معنی پر غور کریں تو یہ سوال کرنا بالکل بجا ہوگا کہ پھر امریکہ میں پھانسی کی سزا بھی تو انسانی قربانی کی ایک جدید ترین صورت ہے۔ پھانسی کی سزا کے ساتھ بھی تو رسوم وابستہ ہیں، درست کہ یہ صرف ایک فرد کا معاملہ ہوتا ہے۔ اس میں مجرم کی خواہش کے مطابق آخری کھانا اور اس کی مرضی کے مطابق پھانسی دینے کا طریقہ اختیار کرنا ہوتا ہے۔ ہمیں کونڈ قبیلے میں قربان ہونے والے انسانوں کے بارے میں تو کچھ معلوم نہیں مگر امریکہ میں جن کو پھانسی کی سزا ملی ہے ان کی اکثریت غریب تھی، کالے نسبتاً بہت ہی زیادہ تھے، نسبتاً کم تعلیم یافتہ، کچھ ذہنی طور پر کھسکے ہوئے یا غیر متوازن، اور اکثر (جیسا کہ ٹیکساس میں ہوتا ہے) ان کو قانونی مشورے بھی کم معیار کے دیئے جاتے ہیں گویا اصل انسانی قربانی امریکہ میں دی جاتی ہے۔ اب پتہ چلتا ہے کہ یہ علمی شعبہ کیوں ناکام ہوا اور اس نے ہمیں ناکام بنایا کسی امریکی ماہر علم البشریات نے امریکہ میں پھانسی کی سزا کا معاملہ کونڈوں کی انسانی قربانی کے حوالے سے نہیں دیکھا نہ حوالہ دیا ہے۔ کونڈوں کی انسانی قربانی سے کم از کم ان کے عقائد اور ضرورتوں کی تسلی ہوتی تھی اور وہ ایک مقدس تقریب میں شریک ہوتے تھے جبکہ امریکی سیاستدان پھانسی کی سزا کے اس لیے حامی ہیں کہ ہر مجرم کو بڑی سے بڑی سزا دی جانی چاہیے۔ یہی نہیں بلکہ امریکہ میں تو پھانسی چڑھنے والوں کا ماتم بھی نہیں کیا جاتا، مجرم کے رشتہ دار بھی لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے مطمئن ہو جاتے ہیں اور ایک احمقانہ لفظ ''ختم'' کے بعد یہ موضوع ہی ختم ہو جاتا ہے۔ علم البشریات والوں کو چاہیے کہ اس نئے موضوع پر توجہ دیں۔

باب5

ماحولیات، معیشت، مساوات

حال ہی میں ہانگ کانگ میں ایک کتاب چھپی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ پورے ایشیا میں ترقی کے باعث ماحول پر اندوہناک اثر پڑا ہے، ماحولیات کی بڑی افسوس ناک تصویر کھینچی گئی ہے۔ جنوبی کوریا کے چار بڑے دریا تین کروڑ لوگوں کی ضرورتیں پوری کرتے تھے ان میں سے دو دریاؤں کا پانی صنعتی فضلے اور سیوریج کی وجہ سے پینے کے قابل نہیں رہا۔ چین میں دو بڑے ڈیم ہینکیو شمنٹن 1975 میں ٹوٹ گئے تھے۔ چھیاسی ہزار سے زائد انسان مارے گئے یا غالباً دو لاکھ تیس کروڑ لیکن حکومت نے پورے دس برس تک ان حقائق کو چھپائے رکھا۔ دنیا میں ایسڈ ملی سب سے تباہ کن بارش چین میں ہوئی تھی جس سے فصلوں، جنگلوں اور عمارتوں کو اندازاً دو ارب آٹھ سو کروڑ ڈالر کا نقصان ہوا تھا۔ سری لنکا میں1956 میں جنگلوں کی شرح 44 فیصد تھی جبکہ1994 میں وہ کم ہو کر 20 فی صد رہ گئی ہے۔ ملیشیا میں1966 میں جنگلوں کی شرح ستر فیصد تھی جبکہ1984 (ا) میں صرف 40 فی صد رہ گئی تھی۔ ہندوستان کو آزاد ہوئے پچاس سال ہو گئے اس وقت یہاں پر گھنے جنگلوں کی شرح 20 فیصد سے گھٹ کر 11 فیصد رہ گئی ہے۔ تاریخ ماحولیات کے معروف ماہرین مادھیو گیڈگل اور رام چند گوہا نے کہا کہ ہم نے آزادی کے ان پچاس سالوں میں اتنا ''کچھ حاصل'' کیا ہے جتنا غلامی (نوآبادیاتی زمانے) کے سو سالوں میں نہیں حاصل کر سکے تھے۔ (۲) یہ ٹھیک ہے کہ اس عرصہ میں آبادی بھی تین گنا ہو گئی ہے مگر یہ احساس شدید ہے کہ آبادی میں اس قدر اضافہ کے باوجود زمین کو بنجر کرنے کا یہ عمل اتنا تیز نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ہر جگہ کے اعداد و شمار یہی بتاتے ہیں کہ پانی، زمین، فضائی

ماحولیات، تیزی سے جنگلوں کا صفایا، درختوں کا کٹاؤ اور جنگلی حیات کا سرعت سے خاتمہ ہو رہا ہے۔اس رزمیہ کا دامن ایشیا سے آگے تک پھیلا ہوا ہے۔تاہم اس کی اہم تفصیل رچیل کارسن کی کتاب ''خاموش بہار'' کلب آف روم کی رپورٹوں، سالنامہ یا سالانہ حالت دنیا، سیرا کلب کی مطبوعات، گرین پیس اور ہزاروں این جی اوز کی رپورٹوں سے دستیاب ہے۔ یہ تنظیمیں بھی زمین کی بدنصیبی کے باعث صورتِ حال کے بچاؤ کے لیے مصروف ہیں۔

یہی داستان دوسری صورتوں میں بھی بیان ہو سکتی ہے، قصے، کہانی، ٹوٹکے، شعر اور ماحولیاتی مبصرین کی زبان میں۔تاہم کبھی کبھی ان سارے حقائق کو الگ الگ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ میری بیوی 1980 کی دہائی کے وسط میں ہندوستان سے امریکہ آئی تھی۔تب وہ پرندوں کی بڑی شیدائی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ گنجان آباد شہر دہلی میں بڑے پرندے ہوا کرتے تھے بجلی کی تاریں اور درختوں کی شاخیں ان سے بھری ڈولتی جھومتی رہتی تھیں، مگر شہر میں توسیع، ترقی اور درختوں کے کٹنے کے باعث پرندے شہر چھوڑ گئے ہیں، ہم دونوں میاں بیوی 1980 کی دہائی کے شروع میں الگ الگ پہاڑی مقام منالی گئے تھے۔یہ شہر درمیانی طبقہ کے نازل ہونے سے پہلے ہپیوں اور کالج کے طلبا کا پسندیدہ سٹیشن تھا۔ہم دونوں کو وہ سفر یاد ہیں پھر ہم 1995 میں وہاں گئے۔سڑکیں اور گلیاں اور ڈھلوانیں پولی تھین کے لفافوں سے اٹی پڑی تھیں، ٹریفک جام کی طرح ان لفافوں کو بھی ہندوستان کی ترقی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ ٹریفک جام کے بارے میں دہلی میں میرے ہمسایے نے بڑے فخر سے بتایا کہ ٹریفک کا رکنا یا آہستہ آہستہ حرکت کرنا، اور یہ آہستگی نیویارک سے بھی زیادہ ہے، علامت ہے ترقی کی، وافر دولت، تیزی سے سفر یا حرکت، جدید طرز زندگی کی تیز روی اور دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کی طرح ہندوستانی لوگوں کے مصروف ہونے کا علامتی مظہر ہے۔ ست الوجود جدید باشندہ اب ماضی کا حصہ بن چکا ہے۔سبزی بیچنے والے جو گھر گھر جا کر سبزی بیچا کرتے تھے، اب مٹر، گاجریں اور پیاز پلاسٹک کے لفافوں میں بیچتے ہیں۔کبھی یہی لوگ سبزی ترازو میں تولتے تھے پھر خریدار کے بڑے ڈول میں الٹ دیا کرتے تھے۔رس سے بھرے گلاب جامن مٹی کے چھوٹے چھوٹے برتنوں میں فروخت ہوتے تھے۔اب وہ بھی پلاسٹک کے لفافوں میں بکتے ہیں اور اس ترقی کے باعث ہوا یہ کہ ان چیزوں کا مزا ہی خراب ہو گیا ہے۔ مزہ ہی خراب نہیں پورا جمالیاتی تجربہ بھی ویران ہو گیا ہے۔ اگر اس بارے میں کوئی بات کی جائے تو جواب

آئے گا ماضی کے دھندلکوں میں پھنسے لوگ عہد جدید کی سہولتوں اور انتظامات کے بارے میں ناشکرے ہیں۔

ضیاء الدین سردار نے ملیشیا کے بارے میں اسی قسم کی بات لکھی ہے کہ آج وہ لوگ دریاؤں کی آلودگی کو دیکھ رہے ہیں جنہوں نے کبھی بچپن میں انھی دریاؤں میں تیراکی کی اور نہایا کرتے تھے۔ (۳) سبھی ترقی پذیر ممالک میں پانی کی یہی کہانی ہے۔ دنیا بھر میں دریاؤں کی یہی بدحالی ایک حقیقت ہے مگر جو نقصان ہوا ہے اس کی تلافی ماحول اور معاشرے کے ماہرین کی زبان اور الفاظ سے تو نہیں ہوسکتی۔ ہوا تو یہ ہے کہ تجربے کی جو رنگا رنگی تھی وہ ختم ہوگئی ہے۔ ایک خیال ہے جو آلودگی کی مختلف صورتیں نباتات کی کثیر الوجودیت یا تنوع اور آلودہ پانی کی فراہمی کے قصوں میں گم ہوگیا، ہر کسی کو مغربی طرز کا غسل خانہ بنانے پر مجبور کر دیا گیا ہے اور غسل خانوں کے بارے میں ہمارے سارے تصورات ایک ہی صورت میں ڈھل گئے ہیں۔ یہ بات کہ ہاتھی اور انسان بیک وقت دریا میں نہایا کرتے تھے ہمارے ذہنوں سے جلدی ہی اتر جائے گی۔ مگر ایک پیچیدگی اور ہے کہ عملی حقائق کا بھی خاص سماجی پس منظر ہوتا ہے۔ دریائے گنگا (انگریزوں نے اسے گینجز بنا دیا) بعض مقامات مثلاً بنارس خطرناک حد تک آلودہ ہوگیا۔ اس میں شہر کا سارا گندا پانی ڈال دیا جاتا ہے۔ انسانوں اور جانوروں کا بول براز، گلے سڑے مردے اسی میں ہوتے ہیں۔ مگر کٹر مذہبی لوگوں اور ان لوگوں کے لیے جنہیں مستند سائنٹیفک زبان متاثر نہیں کرتی، یہ دریا اب بھی مکمل پاکیزگی ہے۔ ماحولیاتی آلودگی کا ذکر تو ان دنوں تشویش ناک حد تک ہو رہا ہے مگر اس ذکر افکار میں اس بات کی کم ہی گنجائش ہے کہ بعض ثقافتوں میں دریاؤں سے ایک تقدس وابستہ ہوتا ہے۔ دریاؤں کو متبرک سمجھا جاتا ہے۔ احترام کا یہ صیغہ تو بے شک کم نہیں ہوتا ہے مگر دریاؤں میں آلودگی کا اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یعنی آلودگی اور پاکیزگی دونوں ایک ہی جگہ ساتھ رہ سکتی ہیں۔

ماحولیاتی آلودگی کے قصے میں کئی ایک کردار ہیں، تجربے کے تنوع میں کمی، وسائل کی قلت، اکیسویں صدی کے نئے تنازعے، قوموں کے درمیان اور قوموں کے اندر بڑھتی ہوئی معاشی اور ثقافتی ناہمواری، ان سب کو دریا کی علامت کے حوالے سے بڑے حساس انداز میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ پانی اپنی مختلف صورتوں میں غور و فکر اور خیال آرائی کا ذریعہ بنتا

جاتا ہے کیونکہ پانی پر زندگی کا انحصار ہے، یہ زراعت کا سرچشمہ ہے۔ کھلاڑیوں کے لیے میدان میں اس کی ضرورت ہے، بعض اوقات ملکوں اور قوموں کے درمیان حد بندی کا کام دیتا ہے۔ اس کے کنارے بعض متبرک مقامات موجود ہیں اور پھر سامان لانے لے جانے کے لیے آبی گزرگاہوں کا ہی نہیں خیالات اور افکار کا بھی پانی سے تعلق ہے (۵) پانی کی حیثیت صرف اتنی ہی نہیں کہ یہ وہاں پر موجود ہے، کرہ ارض کا ایک بڑا حصہ اس سے بھرا ہوا ہے اور ہر شخص کے پیٹ کے ایک حصے میں پانی موجودہ۔ لیکن یہ احساس بڑھتا جا رہا ہے کہ پانی وہاں نہیں جہاں اسے ہونا چاہیے اور جہاں اس کی موجودگی کی توقع کی جاسکتی ہے۔ مثلاً تیسری دنیا کے لوگوں اور ان کے گروہوں کے ہاں اور کبھی کبھی تو پہلی دنیا کے بعض لوگوں کے پاس بھی پانی نہیں ہے۔ چین کے پاس تازہ پانی کی صرف سات فی صد مقدار ہے جبکہ اس کی آبادی دنیا کی اکیس فی صد ہے۔ مگر صرف چین کو ہی یہ مسئلہ درپیش نہیں ہے بلکہ دنیا کی کوئی ایک ارب آبادی کو پینے کا صاف پانی میسر نہیں ہے۔ (۶) ہارپرز کے تازہ شمارے میں جیکولس لیزلی نے لکھا ہے۔ ایک مشکل حقیقت: ہمیں تازہ پانی کی قلت کا مسئلہ درپیش ہے۔ (۷) بلاشبہ دنیا میں تازہ پانی کی مقدار بہت ہی کم ہے یعنی زمین پر موجود پانی کا صرف اعشاریہ پانچ فیصد جبکہ گزشتہ بیس برس میں اس کا استعمال دوگنا ہوگیا ہے، پانی کم ہوگیا ہے اور دنیا کی آبادی بڑھ گئی ہے۔ (۸)

پانی کے مسئلے پر کئی ملکوں میں تنازعے کھڑے ہو گئے ہیں اور جیسے پانی کے حصول اور قلیل فراہمی آب کے تحفظ اور حصول کے لیے ملک جدوجہد کر رہے ہیں اس سے لگتا ہے کہ پانی کے لیے بھی اسی قسم کی کشمکش اور جھگڑے ہوں گے جیسے جھگڑے تیل پر ہو رہے ہیں، عالمی بنک کے نائب صدر نے چند سال پیشتر متنبہ کیا تھا کہ ”اگلی صدی میں جنگیں پانی کے مسئلے پر ہوں گی۔“ (۹) لیکن دوسری طرف کسی کو بھی اس خطرناک صورت حال کا احساس نہیں۔ رسالہ فوربز نے لکھا ہے اکیسویں صدی میں پانی کو وہی اہمیت حاصل ہوگی جو بیسویں صدی میں تیل کو حاصل تھی اور نیشنل انٹیلیجنس کونسل نے بھی سی آئی اے کو ایک رپورٹ پیش کرتے ہوئے پیشگوئی کی ہے کہ پانی کے باعث امریکہ کی سلامتی پر روز افزوں اثرات پڑیں گے۔ (۱۰) جن ایجنسیوں اور تنظیموں کو عالمگیر حکمرانی کا کام سونپا گیا ہے وہ بھی پانی کے مسئلے کا جائزہ لے رہی ہیں۔ پانی کی تجارتی درجہ بندی، تجارت اور نج

کاری تیزی سے ناگوار حقیقت کا روپ اختیار کرتی جا رہی ہیں۔ بولیویا کی حکومت نے عالمی بنک اور بین الاقوامی مالیتی فنڈ کے دباؤ پر 1999 میں شہر کوچا بمبا میں پانی کی نج کاری کر دی اور بہت بڑی کمپنی بنجٹل کارپوریشن کی شاخ ادگن ڈل ٹوناری کو پانی کی سپلائی کا کلی ٹھیکہ دے دیا۔ اس کے بعد کچھ گاہکوں کے پانی کے بل تین گنا ہو گئے، اور جن گھروں میں پانی کی فراہمی کا پرانا طریقہ تھا یعنی ان کے اندر کنوئیں تھے ان کو بھی کمپنی ٹوناری کو رائلٹی (ٹیکس) دینا پڑ رہا ہے۔ بولیویا کی حکومت نے بیجٹل کی مقامی کمپنی (ٹوناری) کو جب سے پانی کا ٹھیکہ دیا ہے، کوچابیا شہر کی گلیوں میں مزاحمت اور فسادات شروع ہو گئے تب حکومت نے مجبوراً اپریل 2000 میں یہ ٹھیکہ منسوخ کر دیا مگر اسے بیچٹل کی طرف سے قانونی کارروائی کرنے کی دھمکی دی گئی ہے کہ کمپنی کو سرمایہ کاری اور منافع کے حوالے سے جو نقصان ہوا ہے اس کی تلافی کی جائے۔ (۱۱)

موجودہ سیاسی اور معاشی انتظام کے حوالے سے پانی بھی دوسری اجناس کی طرح ایک تجارتی جنس ہے جو آزاد تجارت کے قانون کے تحت آتی ہے۔ پانی کی تجارت کو جنس قرار دینے والوں کو انسانی جذبات و احساسات کی کوئی فکر نہیں۔ مگر انہیں غور کرنا چاہیے کہ جس طرح ستارے مسافروں کی نخلستانوں کی طرف راہ نمائی کرتے ہیں اسی طرح ایک نادیدہ ہاتھ بھی یہ اہتمام کرے گا کہ پانی وہاں پہنچائے جہاں اسے پہنچنا چاہیے۔ ان لوگوں کو اس کی پرواہ نہیں کہ صاف پانی حاصل کرنا انسان کا بنیادی حق ہے جس پر کوئی سمجھوتہ ہو ہی نہیں سکتا۔ تاہم انہیں یہ بات سمجھ میں نہیں آ سکتی اور ان کا خیال ہے کہ ہر چند حقوق جدید سیاسی افکار کا ورثہ ہیں مگر جب پانی کو ایک تحفے کی شکل دے دی جائے تو پھر حقوق کی زبان بھی بے بس ہو جاتی ہے۔ آزاد تجارت میں تحفہ کا کوئی تصور موجود ہی نہیں۔ ان کی نظر میں تحفہ تو غیر معاشی سرگرمی کے عہد کی ایک شے ہے لیکن تحفہ اس وقت تحفہ نہیں رہتا جب وہ کسی دوسری شے کا متبادل (معاشی) بن جائے جب یہ تحفہ اس حوالے سے دیا یا لیا جائے کہ اس کے عوض کچھ اور حاصل ہو گا یا یہ تحفہ معاشی سودے کا حصہ بن جائے تو اس طرح پانی کی حیثیت بدل جاتی ہے وہ معاشی تبادلہ اور ثقافتی سرمایہ میں ایک شناخت (سکہ) بن جاتا ہے، ہم زمین پر انمٹ لکیر پر پہنچ جاتے ہیں جو مالک یا قابض اور غیر ملک یا غیر قابض کو تقسیم کرتی ہے۔

بوتلوں میں بند منرل واٹر کے باعث ہمارے عہد میں پانی کی کہانی کا یہ پہلو بھی سامنے آ گیا۔ ایک ملک کی مثال لیتے ہیں۔ جنوبی کوریا میں 1995 میں منرل واٹر کی فروخت سے گیارہ کروڑ ستر لاکھ ڈالر کی آمدنی ہوئی۔ دنیا بھر میں بوتلوں میں بند پانی کی مارکیٹ ایک دم آسمان سے باتیں کرنے لگی۔ بعض یورپی ملکوں میں اس سے دو ارب ڈالر سے بھی زیادہ آمدنی ہوئی۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ جنوبی کوریا کے شہروں میں بہت کم لوگ براہِ راست نل کا پانی (ٹیپ واٹر) استعمال کرتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ منرل واٹر استعمال کرتے ہیں یا ٹیپ کے پانی کو گھروں میں صاف کر کے استعمال میں لاتے ہیں (۱۲) منرل واٹر کا نسل انسانی کے اعتبار سے استعمال کا اندازہ لگانے والا ماہر ابھی پیدا نہیں ہوا، اس کی اشد ضرورت ہے۔ عالمگیریت اور اوپر کی طرف سفر (معاشی) کے رجحان کی بڑی خوبصورتی سے پیائش اسی بوتلوں والے پانی کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ کوئی پچیس برس پہلے تک ہندوستان میں بوتل کا پانی خال خال ملتا تھا۔ یہ پانی یا تو ثروت مند مغربی ملکوں کے سفارت خانے میں یا بڑے بڑے سیاحتی مراکز میں دو کانوں سے میسر تھا۔ پندرہ سال پیشتر تک بوتل پانی کہیں کہیں ملتا تھا اور ایک لیٹر کی بوتل کے لیے ایک سرکاری دفتر کے کلرک کو آدھے دن کی تنخواہ صرف کرنا پڑتی تھی۔ اوپر والے ثروت مند طبقے کو تو اس کی فکر نہ تھی مگر پیشہ ور درمیانہ طبقہ بھی مجبور ہو گیا کہ مہنگے بوتل پانی کا کوئی متبادل سستا حل نکالے اور پینے کا صاف پانی حاصل کرے۔ اس کا ایک حل پر براہمنی نسخہ کے مطابق بھی نکالا گیا یعنی دنیا کی آسائشوں میں سے ضروری آسائش کم خرچ پر نکالی جائے اور معتبر بنایا جائے۔ اگرچہ یہ بات کوئی زیادہ واضح نہیں کہ دہلی کی میونسپل کارپوریشن اور دوسرے بڑے شہروں کی میونسپل کارپوریشنوں کی طرف سے فراہم کیے جانے والے پانی کا معیار گزشتہ چند سالوں میں کم ہو گیا ہے مگر پانی کی سپلائی بہت ہی کم ہو گئی ہے اور نلکے اکثر خشک رہتے ہیں۔ پھر ہوا یوں کہ اچھے وقتوں میں میونسپل اداروں نے ان میں ایک گھنٹہ صبح اور ایک گھنٹہ شام کو پانی فراہم کرنا شروع کر دیا۔ آبادی اور پانی کی بڑھتی ضرورت میں بھی اضافہ ہوا تو پھر کچھ لوگوں نے غیر قانونی طور پر موٹریں لگا لیں اور موٹریں باہر بڑے پائپ سے لگائی گئیں (تاکہ میٹر پر پانی ریکارڈ نہ ہو) اور یوں کافی مقدار میں پانی ذخیرہ کرنا شروع کر دیا، جن لوگوں نے قانون کا احترام کیا انہوں نے محسوس کیا کہ موٹریں لگانے والے نہ صرف بہت سا پانی کھینچ

لیتے ہیں بلکہ ان کی وجہ سے ان کے حصے کا پانی بھی ان تک نہیں پہنچ رہا۔ کچھ اور لوگوں نے جیٹ پمپ لگا لیے جن کے ذریعے زمین سے پانی نکالا جاتا۔ بیس برس پہلے پمپ لگانے کے لیے صرف بیس تیس فٹ تک بورنگ کرنی پڑتی تھی مگر وقت کے ساتھ ساتھ پانی کی سطح بہت ہی کم ہو گئی اور 1990 کی دہائی کے وسط تک پانی تک پہنچنے کے لیے پچاس فٹ یا اس سے بھی نیچے تک بورنگ کرنا پڑتی۔

اگرچہ بورنگ اور پمپ والا معرکہ سر کر کے پانی تو حاصل کر لیا جاتا مگر یہ پانی پینے کے قابل نہیں چنانچہ اب اس پانی کو صاف کرنے کے لیے ایک سسٹم چالو کرنا پڑا۔ مہنگے بوتل پانی کے مقابلے میں یہ بہت سستا نسخہ تھا۔ 1990 کی دہائی کے شروع میں یوریکا فوربز نام کی کمپنی نے ایکوا گارڈ کے نام سے فلٹر بنانے شروع کیے چنانچہ ہندوستان کے پیشہ ور درمیانے طبقے نے یہ فلٹر عام استعمال کیا۔ میرے ایک دوست نے بتایا کہ اسی دہائی کا آخر میں ہندوستان کے بڑے عہدیداروں صدر اور وزیراعظم کے علاوہ اکثر سیاستدانوں (ان میں سے بہت سے تو فریبی اور ریکارڈ ہولڈر بھی ہیں) نے اپنے گھروں میں صاف پانی کے لیے ایکوا گارڈ فلٹر لگا لیے ہیں۔ یعنی واضح ہوا کہ ایکوا گارڈ نہ صرف استعمال میں آ گیا ہے بلکہ صاف پانی کے حصول کے لیے یہ بہت ہی قابل اعتبار سسٹم ہے اور ملک کے دو سب سے بڑے عہدیداروں کے بھی زیر استعمال ہے۔ اس کے بعد ہسپتالوں اور ریستورانوں میں بھی ایکوا گارڈ نصب ہونے لگے۔ اور پھر بڑے بڑے ریستورانوں کی طرف سے یہ بھی مشتہر کیا گیا کہ نہ صرف وہ ایکوا گارڈ فلٹر پانی پینے کے لیے فراہم کرتے ہیں بلکہ ان کے کھانے بھی اسی صاف پانی سے تیار ہوتے ہیں۔ یہ بات اس ملک میں کوئی معمولی بات نہ تھی جس میں پانی کے جرثوموں کی وجہ سے بہت سی بیماریاں پیدا ہونے کی شکائت عام تھی اور جہاں اب بھی ہیضہ کی وجہ سے سیاحوں کی تعداد ان ملکوں کے مقابلے میں بہت کم ہے جہاں ہندوستان کے مقابلے میں سیاحوں کی کشش کے مقامات بہت کم ہیں۔ دریں اثنا 1990 کی دہائی کے وسط میں تجارت کھلی یا آزاد ہوئی تو ملٹی نیشنل کمپنیوں نے دھاوہ بول دیا۔ تنخواہوں میں ایک دم غیر معمولی اضافے ہوئے اور بوتل کے پانی کی قیمت تیزی سے گرنے لگی۔ اٹلی کی کمپنی بسلیری نے بوتل کے پانی کو مقبول کیا اور اس کا جزک نام بھی بسلیری پڑ گیا اور اسے درمیانے طبقے کے گھروں میں راہ مل گئی۔ زیادہ ثروت مند طبقے میں

اس کی پانچ لیٹر کی بوتل کو بڑی پذیرائی ملی جوان گھرانوں کے لیے بڑی مناسب بھی تھی۔

اگر ہندوستان کے درمیانے طبقے کے گھروں میں پانی کی کہانی کے ان حصوں کو صرف ہماری گھریلو قسم کی تاریخ کا حصہ سمجھا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پانی کے بارے میں محققین نے اس داستان کو صرف سیاسی تناظر میں رکھ کر دیکھا ہے وہ خود بھی ''اصلی'' بڑے شہروں میں پانی کی ایسی داستانوں سے آزاد نہیں ہو سکے۔ پھر یہ بات بڑی غیر معمولی سمجھی گئی کہ کس طرح اڑھائی سو میل دور اوونز وادی سے پانی کا رخ لاس اینجلز کی طرف موڑ دیا گیا اور بقول لاس اینجلز ٹائم پورا دریا ہی شہر میں لایا گیا، اس کام پر بہت طویل طویل مضامین لکھے گئے۔ (۱۳)جن میں اسے ایک بڑا کارنامہ قرار دیا گیا۔ سچ یہ ہے کہ اس تفصیل میں وہ تمام عناصر موجود ہیں کہ ہائی وڈ والے اس پر قلم بنانے کے لیے متوجہ ہو جائیں۔ یعنی سیاسی سازش، رشوت، مجرمانہ سرگرمی، خواہش اور تمنا اور لالچ، اربوں ڈلا اور ایک بہت ہی بڑے شہر کا مستقبل، یہ سب عناصر اس منصوبے کا حصہ ہیں (۱۴) بات ہالی وڈ تک پہنچنے کا مطلب ہے کہ یہ معاملات اور واقعات تحقیقات اور تفتیشی صحافت کا موضوع بن جائیں۔ اس کے مقابلے میں ایک ہندوستانی بڑے شہر مثلاً دہلی میں پانی کی مشکلات کا مسئلہ مستقبل میں مزید تشویش کا باعث بنے گا کیونکہ آبنوشی کی فراہمی ناقص ہی رہے گی اور اس پر جو کچھ بھی لکھا جائے گا، (صحافیوں کی زبان میں) وہ ایک ناکام سی تحریر ہو گی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ علم البشریات یا سماجیات کے کسی ماہر نے ہندوستانی گھروں میں پانی کی فراہمی کی اس داستان پر توجہ نہیں دی ان کے لیے ذات پات، ہندو رسم و رواج اور فرقہ وارانہ فسادات زیادہ قابل توجہ ہیں۔ بہر طور یہ قصہ پورے ملک کا ہے اور ایک سا ہے، ہندوستانی گھروں، دیہات وغیرہ میں لوگوں نے پانی کے بارے میں اپنے بڑے رزمیے یا جنگ نامے تیار کیے ہیں جن میں جیٹ پمپس، پانی کے ٹرکوں، واٹر ٹینک، گھر گھر گھومتا پانی کا مٹکا، پانی کے نل جو خشک ہو گئے، پانی کا پائپ اپنے گھر کی چھت سے دوسرے گھروں کی چھت پر جاتے ہوئے اور ہمسایوں میں ہر روز کی تو تکار سبھی شامل ہیں۔

(۱۵)

میں نے ماحولیات کی دریافت سے بات شروع کی تھی اور جس طرح پانی گھوم گھام کے گزرتا ہے، میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ پانی کے حوالے سے کس قدر عدم مساوات ہے،

اور پانی ہمارا ثقافتی اور معاشی سرمایہ ہے۔ پانی کی کہانی عموماً ماحولیات کے حوالے سے بیان کی جاتی ہے۔ دنیا بھر میں پانی کے وسائل کے محافظ اور پرداخت کنندگان وہ ہیں جنہیں ماحولیات کے ماہرین کا نام دیا جاتا ہے۔ کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ سمندر کے عالموں کے پاس بھی ایک کہانی ہے، بے شک مگر یہ پانی کی کم اور سمندروں کی کہانی زیادہ ہے۔ تاہم پانی کا قصہ واضح طور پر اس حوالے سے کم ہی بیان کیا گیا ہے کہ اس کی وجہ سے مساوات کہاں ہے اور نابرابری کہاں۔ پھر یہ قصہ بیان نہیں کیا گیا کہ پانی کے استحقاق کے لیے کتنے لوگوں اور گروہوں کو سیاسی جدوجہد میں شامل کیا گیا۔ میں نے کوشش کی ہے اور میں نے ماحولیات کے معانی اور اہمیت کے حوالے سے مساوات کے جس عنصر کو دیکھا ہے اسے بیان کروں۔ میں نے گاندھی کی زندگی اور ماحولیات کے تعلق کے بارے میں جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ یہی ہیں کہ ماحولیات میں بھی عدم مساوات ہے۔

آیئے دیکھیں اور یاد کریں کہ ماحولیات (ایکالوجی) کا لفظ معیشت (اکانومی) سے مشتق ہے۔ (اکانومی یونانی لفظ رؤنگونومی سے نکلا ہے) یہ لفظ معاشیات کے ماہرین کی تحقیقات سے کوئی لگا نہیں کھاتا، اس کا ابتدائی معنی یہ تھا کہ کس طرح گھریلو معاملات کو مزید کم صرفے اور مستعدی کے ساتھ چلایا جا سکتا ہے۔ یہی مفہوم تھوریو کے ذہن میں اس وقت تھا جب اس نے والڈن اکانومی کا شروع کا باب لکھا جس میں اس نے بتایا تھا کہ کس طرح اس نے اپنی ضرورتوں کو کم سے کم کیا اور پھر بھرپور زندگی گزاری۔ یہی زندگی کا کم خرچ سٹائل ہے اور یہی انداز رویے، تقریر اور فکر کا انداز ہے جو مہاتما گاندھی نے مختلف آشرموں میں سختی سے اپنے آپ پر نافذ کیا۔ یہاں سے ہی آدمی معیشت (اکانومی) سے ماحولیات (ایکالوجی) تک کی لفظیات دیکھتا ہے۔ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری میں ایکالوجی کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ جانوروں اور نباتات کی اکانومی کی سائنس، جس سے لازماً یہ معنی نکلتے ہیں کہ مویشیوں، نباتات اور اپنے ماحول کی نگہداشت۔ چنانچہ پہلے مرحلے پر تو ماحولیات کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم دھرتی کے وسائل کے استعمال میں ضیاع سے گریز کرتے ہوئے بچت سے کام لیں۔ اس کے لیے لازم ہے کہ اگر وسائل کم بھی ہوں تو بھی ان کو بڑی سوجھ بوجھ اور بچت کے ساتھ استعمال کریں۔ معاشیات اور

ماحولیات کو اس باہم کاٹ کے حوالے سے دیکھیں تو گاندھی کی زندگی کے غیر متوقع انداز کے باب وا ہونے لگتے ہیں۔

ماحولیات کی مساوات... زندگی کا ایکو سسٹم

یہ سوچ دل کو لگتی ہے کہ گاندھی کو ماحولیات کے پہلے آشنا یا ماہر ماحولیات کہا جائے (۱۶) مگر یہ ماننے میں سو طرح کے مسائل حائل ہیں: گاندھی جدید صنعتی تہذیب کے بہت بڑے نکتہ چیں اور نقاد تھے۔ مگر انہوں نے فطرت کے بارے میں بہت کم باتیں کی ہیں۔ ان کا ایک بیان ہے کہ زمین کے پاس اتنا کچھ ہے کہ وہ ہر کسی کی ہوس اور لالچ تو نہیں مگر ضرورت کو پورا کر سکتی ہے۔ اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ گاندھی انسان کے ہاتھوں فطرت کے استحصال سے کس قدر واقف تھے۔ اگرچہ گاندھی کا نام بے شمار سیاسی اور سماجی اصلاح کی تحریکوں سے وابستہ کیا جاتا ہے مگر ان کی تحریروں میں ماحولیات کا لفظ نہیں برتا گیا نہ ہی انہوں نے اس حوالے سے کوئی تحریک چلائی مگر وہ انسان کے خارجی ماحول سے تعلق کے بارے میں گہری جانکاری رکھتے تھے۔ ہندوستان کی ماحولیاتی تاریخ لکھنے والے رام چندر گوہا نے بھی زور دے کر کہا ہے کہ گاندھی کے لیے ویرانے میں کوئی دلکشی نہ تھی (۱۷) ان کی تحریروں جن فطرت کا کہیں ذکر نہیں نہ ہی اچانک کسی خوبصورت آبشار یا کوہ ہمالیہ کی کسی چوٹی کو دیکھ کر خوشی کا اظہار ملتا ہے۔ ان کے زمانے میں سمندروں پر سفر کرنے میں کو اولیت حاصل تھی مگر انہوں نے اپنی آپ بیتی میں بھی سمندری سفر کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ ان کی تحریر کو وہ پچاس ہزار طبع شدہ صفحوں میں درختوں، جانوروں، سبزہ، منظر نام کی کسی چیز کا ذکر نہیں سوائے ان صفحات کے جن میں انہوں نے گائے کے تحفظ اور اپنی بکری کے بارے میں کہا ہے۔

گاندھی اور جان موئر یا اکڈ و لیو پولڈ کے تقابل کا سوچا ہی نہیں جا سکتا۔ گاندھی نیچری یعنی فطرت سے وابستہ تھے، نہ ہی سائنسی لحاظ سے اشیا کو باقی رکھنے کے شائق اور یہ بھی شبھے کی بات ہے کہ انہوں نے کبھی یہ بھی سوچا ہو کہ زمین اور جنگل وغیرہ کیسے مقامات تنہائی ہیں بلکہ انہوں نے ترقی کا کام کرنے والوں، صنعت کاروں، لکڑی کے ٹھیکیداروں اور ان شعبوں میں سرمایہ کاروں کے بارے میں بھی فطرت کے حوالے سے کچھ نہیں سوچا۔ گاندھی

تھوریو کی سول ڈس اوبیڈئنس (سول نافرمانی) ایسی تحریروں کے بڑے مداح تھے مگر انہوں نے شائد ہندوستان کے ایک اور روائتی پہلو پر بھی کچھ نہیں سوچا اور وہ ہے کہ لوگ کیوں جنگلوں کی راہ لے لیا کرتے تھے گاندھی جنگلوں میں جانے کے خلاف نہ تھے مگر وہ ساری عمر بدترین مسائل میں الجھے رہے ان کا زندگی گزارنے کا سارا انداز غیر دنیاوی یا روحانی تھا۔ جب کبھی باہر کا شور وغوغا بہت بڑھ جاتا وہ اپنی اندرونی آواز سنتے، اور اپنے من میں ڈوب جانے کی مکمل صلاحیت رکھتے۔ اسی طرح کماؤں کے آدم خور شیروں نے جو مسئلے کھڑے کر رکھے تھے اور جم کارٹ کی کتابوں نے جن کو بہت مشہور کیا۔ گاندھی کی نظر میں اس کا اخلاقی پہلو شائد کم ہوتا اور یہ پہلو زیادہ کہ انسان کے اندر جو ایک درندہ بیٹھا ہوا ہے اس کو تابع فرمان کرنے میں کیا مسائل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک معروف انگریز مورخ ایڈورڈ تھامپسن نے گاندھی سے کہا ''ہندوستان میں جنگلی حیات تیزی سے ختم ہو رہی ہے'' گاندھی نے جواب دیا ''جنگلی حیات جنگلوں میں کم ہو رہی ہے مگر شہروں میں بڑھ رہی ہے'' (۱۸) گوہا کا کہنا ہے کہ اگر گاندھی نے جنگلی حیات پر مزاجاً زیادہ توجہ نہیں دی تو وہ ہندوستان کے شہروں کے مخصوص سماجی اور ماحولیاتی مسائل نوٹس لینے میں بھی ناکام ہی رہے۔

گویا گاندھی نہ تو ماحولیات اور نہ ہی فطرت کے بچاؤ کے بارے میں زیادہ فکر مند تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہندوستان میں موجودہ ماحولیاتی تحریک کے پیچھے بھی گاندھی کی فکر ہے تو گاندھی کو جاننے والے یا ہندوستان میں ماحولیاتی تحریک کے پیچھے بھی گاندھی کی فکر ہے تو گاندھی کو جاننے والے یا ہندوستان میں ماحولیاتی تحریک کے کچھ وابستگان اعتراض کرتے ہوئے اس کی نفی کر دیں گے۔ گاندھی کے قریبی چیلوں یا مریدوں میرا بہن اور سرلا بہن کا چندی پرشاد بھٹ وملا اور سندر لال بہوگنا وغیرہ پر بے پناہ اثر تھا یہی لوگ تھے جنہوں نے ہمالیہ کے جنگل بچانے کے لیے چپکو تحریک شروع کی اور اس تحریک میں زیادہ تر خواتین سرگرم ہوئیں اور مدعا یہ تھا کہ موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لیے صاف زمین، پانی اور ہوا کا تحفظ کیا جائے۔ (19) اسی طرح بابا امتے اور میدھا پاٹکر نے نرمدا بچاؤ تحریک شروع کی جو ہندوستان میں دنیا کا سب سے بڑا بند بنانے کے خلاف شروع کی گئی کیونکہ بند کی تعمیر سے ہزاروں دیہاتیوں اور قبائلیوں کو بے گھر کیا جانا تھا۔ ابھی اس تحریک کے سربرآوردہ راہنماؤں نے کہا کہ انہوں نے یہ تحریک گاندھی کی فکر سے فیض یاب ہو کر چلائی تھی۔ ان تحریکوں کو گاندھی

تحریکوں کا نام دینا بھی غلط ہے کیونکہ اس طرح دوسرے حقائق مثلاً کسانوں کی مزاحمت کی روائت، روائتی اجتماعی طریق اور علم کے مقامی مظاہروں کی اپیل کے پہلو نظر انداز ہو جاتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ گاندھی کی روح نے ہندوستانی ماہرین ماحولیات کو متاثر ضرور کیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ہندوستان کی ماحولیاتی تحریکوں سے ہٹ کر، علاقوں اور ملکوں میں ماحول بچانے کے مدعیان نے۔ گاندھی کو خراج تحسین پیش کیا اور کہا کہ وہ بھی گاندھی کے خیالات سے متاثر ہیں۔ (۲۰) ناروے کے فلسفی ارنے نائس کے ساتھ ماحول بچانے کی تحریک بڑی جڑی ہوئی ہے، اس نے کہا کہ میں نے گاندھی سے یہ بات سیکھی ہے کہ جب تمام مخلوق کی وحدت (۲۱) (ہمہ اوست) سے آگاہی حاصل ہو جائے تب عدم تشدد کی طاقت اپنے جوہر دکھاتی ہے۔

گاندھی کے فکر و عمل کے ماحولیاتی پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے ہمیں ماحول اور ایکالوجی کی عام تعریف (زمروں سے) ہٹ کر کرنا ہوگی۔ ان لفظوں کے معانی روایات میں گم ہو گئے ہیں اس لیے ہوسکتا ہے یہ لفظ ہماری پوری ترجمانی نہ کرسکیں اور ہمیں گاندھی کے افکار اور عمل کے سمجھنے میں پریشانی ہو جب تک ہم یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ گاندھی کے افکار میں اخلاقیات، سیاسیات اور ماحولیات سب ایک دوسرے میں مکمل طور پر گندھے ہوئے ہیں اس وقت تک گاندھی کے قول اور فعل کو اس حوالے سے سمجھنا مشکل ہے مثلاً گاندھی مقررہ مدت کے بعد چوبیس گھنٹے کا چپ برت باقاعدگی سے رکھا کرتے تھے اس طرح وہ اپنی توانائی کو محفوظ کرتے، درون بینی کرتے، اپنے اندر کی دبی آواز کو سنتے اور پھر اسی انداز سے وہ برطانیہ کے ساتھ عام طریق کی گفت و شنید اور رابطے سے اختلاف کو بھی اہم بنا دیتے اور اس حوالے سے اپنی شرائط وضع کرتے۔ اسی طرح وہ برت اس لیے نہیں رکھتے تھے کہ برطانیہ اور دوسرے گروپوں کے ساتھ گفت و شنید کا در کھولا جائے بلکہ اپنے جسم، اور غیر مصفا خیالات کو صاف ہی نہیں کرتے بلکہ کروڑوں ہندوستانیوں کی محرومیوں کا بھی تجربہ کرتے۔ گاندھی ضیاع کے سخت خلاف تھے اور برت کا مطلب یہ بتانا تھا کہ جسم کی ضرورتیں کہاں تک ہیں اور اس کی یعنی جسم کی ماحولیات کو مناسب طریق سے محفوظ رکھا جانا چاہیے۔ مگر کھانے یا نہ کھانے کے سوال میں دوسرے لوگوں کے مقابلے میں ان کے لیے ایک اہم سوال پوشیدہ تھا۔ اس سوال کے ذریعے یہ بات پیش کی گئی کہ جسم اور سیاست کا

بھی باہم تعلق ہے۔ کوئی شخص گاندھی سے وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا جو ایڈمنڈ برک نے وارن ہیسنگز کے بارے میں کہا تھا'' جب وہ کھانے کے میز پر منہ کھولتا (ہندوستان میں) قحط پڑ جاتا تھا۔(۲۲)

گاندھی کی زندگی کا نقشہ سامنے لائیں تو ماحول کے بارے میں ان کا نظریہ کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ جس طرح فطرت اپنی سب سے بڑی مخلوق کو غذا فراہم کرتی ہے اسی انداز میں سب سے چھوٹی مخلوق کو بھی نوازتی ہے چنانچہ گاندھی نے اپنے سیاسی اور سماجی تعلقات میں چھوٹے بڑے عورت مرد سے فطرت والا سلوک کیا۔ گاندھی کی قریبی مرید اور حاضر خادم میرا بہن نے لکھا، کہ ایک طرف وہ آشرم میں موجود ہر شخص کی طرح وہ بھی مصروف ہوتے مگر ساتھ ساتھ اپنی بے پناہ خط و کتابت اور انٹرویو وغیرہ بھی جاری رکھتے۔ تمام بڑی پارٹیوں اور قوموں کے بڑے لوگ باپو کو ملنے آتے اور کوئی کسان اپنے مسائل لے کر آ جاتا تو وہ اس کو بھی اتنا ہی وقت دیتے جتنا بڑے لوگوں کو(۲۳) اعلیٰ انگریز عہدہ داران سے گفت و شنید کے درمیان وہ بکری کی دیکھ بھال کے لیے بھی وقت نکال لیتے۔ گاندھی نے اپنے ساتھیوں کے انتخاب میں طاقت، وقار اور مرتبے کی کبھی پرواہ نہیں کی اس طرح اہم قومی امور کے بارے میں چھوٹی سی چھوٹی جزئیات سے بھی باخبر رہتے۔ ان کے ایک ساتھی نے بتایا (اور وہاں اس قسم کے قصے کے کئی روپ بن جاتے ہیں) کہ ایک دوست کی بیٹی کی علالت کی خبر پہنچی وہ اس وقت راج کوٹ میں انتہائی شدید سیاسی جدوجہد میں مصروف تھے اور اسی حالت میں انہوں نے لڑکی کو ایک طویل خط لکھا اور خط میں لکھا کہ اسے کون کون سی دوا کھانی ہے، کون سے کھانے سے پرہیز کرنا ہے اور کون کون سے حفاظتی تدابیر کرنا ہیں۔ گاندھی بڑے کنجوس بدنام تھے، کبھی کبھی وہ اپنے نام آنے والے لفافوں یا ان کی پشت پر بھی خط لکھ دیا کرتے مگر انہوں نے اس لڑکی کو طویل تار بھیجے۔ یعنی زیادہ پیسے خرچ کرنے سے بھی تامل نہیں کیا۔(۲۴) ان کی پڑبھانجی نے اپنی چھوٹی سی کتاب ''باپو میری ماں'' میں لکھا کہ ہندوستان کی آزادی کے بارے میں بڑی اہم گفت و شنید ہو رہی ہوتی تو اس کیفیت میں بھی وہ اپنے سارے کام انتہائی نفاست اور صفائی کے ساتھ انجام دیتے، پڑبھانجی نے یہ بات لکھ کر گاندھی کی بہت ہی عزت افزائی کی ہے۔(۲۵)

دوسری بات یہ کہ وہ فطرت کے وکیل بنے بغیر بھی شدت سے اس بات کے قائل

تھے کہ فطرت کو اپنے طور پر پھلنے پھولنے کا موقع ملنا چاہیے۔ ارنے نائس نے لکھا ہے کہ انہوں نے زہریلے کیڑوں کے کاٹے کی تریاق دوائیں رکھنے سے منع کر دیا۔ ان کا ایمان تھا کہ انسان اور یہ کیڑے پرامن بقائے باہمی کے پابند ہو سکتے ہیں اور وہ سچے ثابت ہوئے کیونکہ پھر زہریلے کیڑوں کے کاٹنے کا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ (۲۶) فطری علاج کے بارے میں ان کے تجربے معروف ہیں انہوں نے انیما لینے اور کیچڑ سے غسل کی وکالت کی تاہم جدید ادویات کو ترک کرنے کے سلسلے میں ان کی ذات سے اور بھی بہت سے قصے منسوب ہیں۔ گاندھی کا نظریہ تھا کہ قدرت کی ساری مخلوق اپنے کام سے کام رکھتی ہے۔ ان کی یہ رائے کسی بیالوجسٹ، جنگلی حیات کے تربیت کنندہ یا زوآلوجسٹ کے مشورے کی مرہون منت نہ تھی، ان کا خیال تھا کہ اگر انسان بھی اپنے کام سے کام رکھے تو پھر ہمیں باقی مخلوق کی صحت یا معاملات کے بارے میں کوئی فکر نہیں ہونی چاہیے ایک مرتبہ ایک کوبرا (پھنئر) سانپ گاندھی کی کوٹھڑی میں گھس آیا،، واضح ہدایت یہ تھی کہ اگر وہ خود گاندھی کو بھی کاٹ لے تب بھی اسے مارا نہ جائے، دوسری طرف انہوں نے کبھی کسی کو سانپ نہ مارنے سے منع نہیں کیا۔ گاندھی نے کہا ''میں ایک سانپ کی زندگی کی قیمت پر زندہ نہیں رہنا چاہتا (۲۷) اس قسم کی کہانیوں میں ایسی کہانیاں بھی مشہور ہوئیں کہ اکثر کوبرا سانپ گاندھی کے قریب آتا اور احترام کے ساتھ ان کے سر پر اپنے پھن کا سایہ کر دیتا جیسے بادشاہوں کے سروں کے گرد ہالہ ہوتا ہے (۲۸) مقدس کتابوں اور تذکروں جیسے انداز کے ان واقعات سے یہ بات نظرانداز نہیں کی جا سکتی کہ گاندھی جانوروں اور کیڑوں مکوڑوں کے ساتھ اس زمین پر رہنے پر خوب رضامند تھے وہ ان جانوروں کو اپنی حیرت تماشہ اور قابل رحم شے بنانے کے حق میں نہیں تھے۔ گاندھی کے بارے میں اس ضمن میں شہادتیں بھی موجود ہیں۔ وہ اپنی تخلیق کو رینگنے والی مخلوق کی تخلیق کے مشابہ قرار دیتے کیونکہ ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم سب کو خدا نے پیدا کیا اس اعتبار سے ساری مخلوق جس شکل میں ہے خلق خدا ہی ہے۔ (۲۹) تاہم یہ ناممکن ہے کہ گاندھی نے جانوروں، کیڑوں مکوڑوں اور نباتات کا انسانوں کی طرح اسی ذوق وشوق سے علاج کیا ہو جس شوق سے ماہرین ماحول اب کرتے ہیں۔

تیسری بات یہ کہ گاندھی نے ضیاع کے تصور کو بدل دیا اور جو معانی یورپ کی نمائندہ حکومتوں نے انہیں دیئے' گاندھی نے ان کے بالکل الٹ معانی دیئے۔ میں نے پچھلے باب میں کہا ہے اور جیسا کہ اب سامراجیت کے طور طریقوں سے وابستہ پر پیچ عالمیت اور فاضلیت والے یورپی حکمرانوں کے لیے سب سے ناقابل قبول یہ بات تھی کہ ان کے تصرف میں یا حد نگاہ تک جتنی بھی زمین ہے خواہ آسٹریلیا اور کینیڈا کے کے ویرانے ہوں یا ہندوستان کے گنجان آباد علاقوں میں ہو وہ سب کی سب یا تو بالکل ہی غیر پیداواری تھیں یا بہت کم پیداواری تھیں۔ ان کو زرخیز بنانے کے لیے یورپنوں نے انہیں بنجر قرار دیا پھر انہیں اپنے معنوں میں پیداواری بنایا۔ (یعنی پہلے بالکل خالی یا غیر پیداواری تھیں) اور اس کام کے لیے صرف سفید فام انسان کا دماغ، ارادہ اور توانائی چاہیے تھی۔ اس کے مقابلے میں گاندھی کا خیال تھا کہ کوئی شے کتنی ہی زرخیز، پیداواری کیوں نہ ہو انسان کی یہ خصلت بھی ہے کہ وہ اس کو ہاتھ لگا کر ویران اور بنجر کر دیتا ہے۔ گاندھی کے قریبی کاکا کالیلکر کا کہنا ہے کہ اسے نیم کے چند پتوں کی ضرورت ہوتی تھی مگر وہ اس کے لیے پوری شاخ توڑ لیتا تھا۔ گاندھی نے دیکھا تو کہا ''یہ تو تشدد ہے ہمیں درخت سے معذرت کر کے چند پتے توڑنے چاہیں۔ تم نے تو پوری شاخ توڑ لی، یہ تو ضیاع بھی ہے اور سر بسر غلط بھی''۔ (۳۰) گاندھی نے کہا کہ انہیں تو اس بات پر دکھ ہوتا ہے کہ لوگ پھول اور پتیاں توڑ لیتے ہیں اور پھر پتیاں ان پر نچھاور کرتے اور پھولوں کے ہار ان کے گلے میں ڈالتے ہیں۔'' (۳۱)

مگر ضیاع صرف یہی تو نہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ انسانوں کے ہاتھوں ضیاع کی اور بھی قسمیں تھیں۔ اس موضوع پر ہندوستان کی ایک تکلیف دہ یا دردناک تاریخ لکھی جا سکتی ہے۔ شرم کی بات ہے کہ ہندوستان میں انسانی فضلہ کو ٹھکانے لگانے کے لیے انسانوں کا ایک الگ طبقہ یا فرقہ بنا دیا گیا اور انہیں معاشرے کا انتہائی قابل نفرت حصہ قرار دیا۔ (۳۲) گاندھی نے دیکھا اور اس مسئلے کو سرعام لانے کے لیے اسے سیاسی آزادی اور تباہ شدہ اداروں کی بحالی جیسے اہم مقاصد کے برابر قرار دیا۔ بڑی ذات کے ہندوؤں کے برعکس گاندھی نے اپنا فضلہ ٹھکانے لگانے کے لیے کسی دوسرے سے کام نہیں لیا بلکہ یہ کام خود کیا۔ ان کے آشرموں میں انسانی فضلہ کو نامیاتی کھاد میں بدل دیا جاتا تھا۔ زندگی کے آخری بیس سالوں میں انہوں نے ایسے غسل خانے بنانے کے تجربے پر تجربہ کیا جس میں

پانی (قدرتی وسیلہ) کا کم سے کم استعمال ہو۔ اگر گاندھی نے زندگی میں کچھ بھی نہ کیا ہوتا تب بھی وہ صفائی کی انجینئرنگ کے حوالے سے زندہ رہتے۔ گاندھی کو اس اعتبار سے بھی یاد رکھا جائے گا کہ وہ خود اونچی ذات کے ہندو تھے جنھوں نے بذات خود جھاڑو سے غسل خانے کی صفائی کی۔

چوتھا: اس نکتہ پر کبھی زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں کہ گاندھی نے ماحول کے بارے میں اپنی حساس طبیعت کو پیروکاروں کے لیے مقدس، قابل تقلید روائت نہیں بنایا نہ ہی اسے مذہب کا درجہ دیا ہے جس کے لیے بڑی محنت اور وفاداری درکار تھی۔ ایک لکھنے والے نے گاندھی کا فرمودہ لکھا ہے ''میں خود اپنے لیے تو بڑا کٹڑ ہوں مگر دوسروں کے لیے کیتھولک (بے تعصب) ہوں'' (۳۳) ان کی بے تعصبی کا اظہار ان کے گوشت کے بارے میں رویے سے ہوتا ہے۔ گاندھی پکے سبزی خور تھے، بعض بے دھیانی میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ ویسے ہی سبزی خور تھے جیسے کہ سارے ہندو پیدائش سے ہوتے ہیں۔ ان کی کتابوں سے بھی ظاہر ہے اور خود جانوروں پر ہونے والے ظلم سے بھی واقف تھے مگر وہ آج کے ماحولیات والوں کے ان دلائل سے واقف نہ تھے جو اکثر متعلقہ لٹریچر میں دیئے جاتے ہیں کہ گوشت کی صنعت کے باعث زمین (کھیتوں) اور پانی پر بڑا بوجھ پڑ رہا ہے۔ ان کے فکر و خیال اور اخلاقی آداب کے بارے میں بھی تنقیدی باتیں ہوتی ہیں اور اس معاملے میں بھی تنقید ہے کہ ان کا قصہ کہانی اور ٹوٹکوں والے ادب میں زیادہ ذکر اذکار ہے اور اسی کے ذریعے ان کی زندگی کے ہر فعل کا پتہ چلتا ہے۔ ایک بار ایک یورپی آشرم میں ملنے آیا۔ یہاں صرف سبزیاں پکائی جاتی تھیں مگر گاندھی نے اس کی گوشت سے تواضع کی۔ اس بات پر ہر کسی کو بڑا تعجب ہوا تو گاندھی نے کہا کہ وہ جانتے تھے کہ آنے والا ہر کھانے میں لازماً گوشت کھاتا ہے اس لیے جو گوشت کھانے کا عادی ہے اس پر دوسری خوراک زبردستی ٹھونسنا بھی جبر ہے۔

گاندھی خود دودھ اور دودھ کی بنی اشیا استعمال کرتے ان امریکی لوگوں کی طرح نہیں جو جانوروں سے متعلق کوئی بھی چیز استعمال نہیں کرتے دوسری طرف گاندھی کا جانوروں کے بارے میں نرم رویہ اس شدت پسند رویے سے مختلف تھا جس کا دوسرا نام تشدد ہے۔ گاندھی کے ایک اور ساتھی جہانگیر پٹیل نے لکھا ہے کہ ایک روز میرا بہن دوڑتی ہوئی اور

بڑے غصے میں اس کے پاس آئی۔ بابو ناشتہ نہیں کھا سکیں گے کسی نے فرج میں ان کے ناشتے کے ساتھ گوشت رکھ دیا تھا۔ یہ کیسے ہو گیا ہے؟ خانسامے علی نے کہا کہ میں نے گوشت کتوں کے لیے لیا تھا اور ابھی وہاں سے اٹھا لیتا ہوں۔ جہانگیر نے علی سے کہا کہ نہیں گوشت وہیں پر رہنے دو اور میں خود جا کر گاندھی کو بلا لایا۔ تب جہانگیر نے گاندھی سے معذرت کی۔ ''مجھے علی سے کہنا یاد نہیں رہا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ سب کچھ ایسے ہو جائے گا'' گاندھی بولے ''معذرت نہ کرو، جہاں تک میں سمجھتا ہوں آپ نے یا علی نے کچھ بھی تو غلط نہیں کیا۔'' گاندھی نے گوشت کے قریب پڑے انگور کے چند دانے اٹھائے اور منہ میں ڈال لیے اور پھر میرا بہن سے مخاطب ہو کر کہا ''ہم اپنے دوست کے گھر میں مہمان ہیں، ہمیں ان پر یا کسی پر بھی اپنے خیالات ٹھونسنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ جو لوگ گوشت کھانے کے عادی ہیں انہیں میری موجودگی کی وجہ سے گوشت کھانا نہیں چھوڑنا چاہیے۔'' اسی طرح گاندھی شراب نوشی کے سخت خلاف تھے مگر کسی کو شراب پینے سے منع نہیں کرتے تھے مگر جو شخص پیتا تھا اور فریب سے شراب نوشی کو چھپاتا بھی تھا اس کی مذمت کرتے۔ انہوں نے جہانگیر کو بتایا کہ میری تو خواہش ہے کہ تم بے شک پیو اور پیٹ بھر کے پیو مگر شراب نوشی میں مکاری اور پردہ پوشی مت کرو۔'' (۳۵)

گاندھی ماحول کے فلسفی نہ تھے اور بہت مشکل سے ہی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کا تھوڑا سا ماحول سے تعلق تھے۔ مگر ان کی سُر ان سب لوگوں سے ملتی ہے جنہیں ماحول سے دلچسپی تھی جو پھولوں سے محبت کرتے تھے۔ سبزی خور تھے عدم تشدد کے اصولوں پر عمل پیرا تھے، پانی کی بچت کرتے تھے، ترقی و تعمیراتی کام کرنے والوں کی غلط کاریوں کے خلاف تھے، کاغذ کو دوبارہ استعمال کرتے یا دوبارہ استعمال کے قابل بنانے والوں کو اچھا سمجھتے یا جانوروں کو انسانوں جیسی عزت دیتے تھے۔ ماہرین کی اس اصطلاح کی ایجاد سے بھی پہلے گاندھی اندر سے ماحولیاتی ہی تھے۔ شبہ ہوتا ہے کہ شائد بھرپور ماحول کے تصور میں بھی اتنی گنجائش نہیں کہ اس میں گاندھی کی زندگی کے ان انقلابی اور مقدس پہلوؤں کو سمیٹا جا سکے۔ انہوں نے ماحول پر کوئی فلسفیانہ یا تحقیقی مضمون نہیں لکھا مگر انہوں نے اپنی زندگی میں ہی ہمارے لیے آخری اپنیشد یا جنگل کی کتابیں چھوڑیں۔ ان کی زندگی میں کوئی لمحہ، کوئی جذبہ یا خیال بے کار یا بے جا نہ تھا۔ گاندھی نے بہت تحریریں چھوڑیں مگر ہر تحریر میں بے پناہ

اختصار تھا، ان کا باداموں اور پھلوں کا مختصر کھانا، ان کی صبح کی پرارتھنا اور جسمانی مشقتیں، مخصوص مدت کے بعد چپ کا برت، صبح کی سیر، چھوٹی موٹی کاشتکاری، ضیاع سے نفرت، برت رکھنا یہ سب اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ نغمہ کن سُروں سے بنایا گیا تھا۔

عدم مساوات کی معیشت: افلاس اور ثروت مندی

گاندھی ماحولیاتی یا مساوات کے نظریہ ساز نہ تھے مگر ان کی زندگی شاہد ہے کہ انہوں نے ان تصورات پر بہت غور وفکر کیا۔ دوسری طرف آج کی جدید تہذیب کی یہ ایک حقیقت ہے کہ مساوات کا مسئلہ چند فعال سیاستدانوں اور کچھ فلسفیوں کی سوچ و بچار کا مسئلہ ہے یہ دوسری بات ہے کہ کھانے کی میز پر اس مسئلہ پر پر جوش مگر بے دلیل بحث ہوتی ہے بحث کرنے والے اکثر راست نیت کے لوگ ہوتے ہیں مگر دائیں دھڑے کی طرف مائل نہیں ہوتے۔ سیاسی نظریے تو امریکہ کے پولیٹکل سائنس کے شعبوں میں انتقال پا چکے ہیں۔ جہاں عقلی انتخاب کے حوالے سے نظریے اور رسمی سی مثال گری نے سیاست، فلسفہ اور مغربی طرز کی تحقیق کی روایت کے بارے میں سنجیدہ غور وفکر کا سلسلہ ہی ختم کر دیا ہے اس لیے وہاں کے سیاسی سائنسدانوں سے یہ توقع ہی عبث ہے کہ وہ اس موضوع میں سنجیدگی سے دلچسپی لیں گے۔ جو سائنسدان واقعی انصاف اور ناانصافی مساوت، عدم مساوات جیسے مسائل پر پوری دیانتداری اور سنجیدگی سے سوچتے ہیں وہ بے چارے اپنے مضمون کے ریاضیاتی نقشے کے باعث اور محض فوری مثالی وضع کرنے کے عمل کے تلے دب کر رہ گئے ہیں اور اب نہ وہ تفصیل کے ساتھ لکھ سکتے ہیں اور نہ ہی ان موضوعات پر بھرپور انداز سے وابستہ رہ کر ماضی کی طرح کا پُر مایہ لٹریچر پیدا کر سکتے ہیں۔ چند ایک کو چھوڑ کر معاشی ماہرین کو تحقیق طلب موضوع کے طور پر یا قابل حصول اصول کے طور پر مساوات میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں پہلے کہہ آیا ہوں کہ ان کی علت غائی یہی ہے کہ عدم مساوات کی صورت حال کو اور سنگین کیا جائے۔ ہر چند یاسیت والے علوم کے داعیان کے بارے میں یہ تبصرہ درست ہوسکتا ہے اس لیے معیشت دان کے بارے میں یہ کہنا ہی کافی ہوگا کہ وہ ایسے ماہرین ہیں جو اضافے یا پیداوار کے انجن کی صرف سروس کرتے ہیں۔ ان عالموں میں سے ایک (زیادہ تر امریکی ہیں اور ان کی بے ہنگم تعداد یونیورسٹی آف شکاگو میں ہے) کا

کہنا ہے کہ مثبت معاشی نظریے میں مساوات کا کوئی تصور نہیں ہے اور پھر بڑے طمطراق سے مزید کہتا ہے کہ بہبود کی معاشیات نے خود کو نتائج کی مساوات کے نظریے کی شاخ بندی کے طریقے تلاش کرنے کے لیے وقف کر دیا ہے۔ اس معاشی میدان سے وابستگان کو پیشے کے معمولی درجے کے ماتحت سمجھا جاتا ہے۔ اس پیشے یعنی معاشیات کے نسخے ہیں۔ آزاد تجارت، ڈی ریگولیشن، مزید آزاد کرنا اور دولت، مختصراً منڈی۔ ایک اصطلاح یعنی مارکیٹ یا منڈی کا فروغ۔

مساوات اور عدم مساوات کا سوال، معاشی ماہرین کی لاپرواہی سے آگے چلا گیا ہے۔ کلنٹن نے ایک اصطلاح استعمال کی تھی۔ تاریخ کی صحیح جانب، اس کو کولن پاول، کونڈولیزا رائس بھی اور دوسرے امریکی افسر بڑی خوشی خوشی استعمال کرتے ہیں۔ (۳۸) وہ لوگ جو بظاہر اور بڑے نادر انداز میں تاریخ کی صحیح جانب کھڑے ہیں وہ ہمیشہ یہی کہنا کافی سمجھتے ہیں کہ ہم سب برابر خلق ہوئے تھے پھر دولت بنانے کے سودے میں لگ گئے (یا گویا یہ عدم مساوات کے علاوہ کوئی اور شے ہے) بعض لوگوں نے سوچا کہ فرانسیسی اور امریکی انقلابوں کے مداحین نے مساوات کا جو اعلان کیا ہے اس کے بارے میں تو یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ مساوات کے قیام کے مثبت نسخے کا انجام تو انتہائی ہولناک خواب کی صورت میں ہوگا جیسا کہ کیمونسٹوں کی حکمرانی کی خاصیت بن گیا ہے۔ اس بات کو کہ کبھی ہم بڑے گھیرے میں برابر ہی ہوا کرتے تھے ماننے کا یہ مطلب ہے کہ یہ قبل از جدید دانش مندانہ عہد کے خیالات میں اضافہ کر رہے ہیں اس کے علاوہ وہ بھی ہیں جو بلاشک یہ سمجھتے ہیں کہ مساوات کے نصب العین کی تکرار کے معنی یہ ہیں کہ یہ بھی زندگی کی ایک حقیقت ہے۔ گزشتہ کئی دہائیوں سے ہونے والی رائے شماریوں کے مطابق امریکیوں کی اکثریت عدم مساوات کو ناقابل اعتراض نہیں گردانتی اور بہت کم امریکیوں کو مساوات ایک قابل تعریف مقصد نظر آتی ہے مگر ضروری نہیں کہ یہ مساوات قابل حصول بھی ہو۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ہم سب خالق کی نظر میں ایک برابر ہیں۔ مگر اکثر امریکیوں کے نزدیک یہ بات انتہائی غیر مناسب ہے کیونکہ ان کا مشاہدہ بھی ہے اور بات قدرتی بھی ہے کہ وہاں کچھ لوگ تو دولت کی ریل پیل میں پیدا ہوتے ہیں اور باقی غربت ہیں۔

انتہائی دولت مند افراد خواتین اور مردوں کو بطور مثال پیش کیا جاتا ہے کہ یہ قابل تقلید

ہیں۔ پھر بعض اوقات ان دلائل کو رد کر دیا جاتا ہے جو امیر اور غریب کے درمیان بڑھتے ہوئے فاصلوں کے بارے میں دیئے جاتے ہیں اور تبصرہ یہ کیا جاتا یا وجہ بتائی جاتی ہے کہ امریکہ خواب میں جو معاشرہ ہے اس میں یہ فرق اور امتیازات ہمیشہ حرکت میں رہتے ہیں اور جو لوگ آج غریب طبقے میں ہیں وہ بھی بجا طور پر امید کر سکتے ہیں کہ وہ بھی ایک دن دولت مندوں کی صف اول میں شامل ہوں گے۔ رونلڈ ریگن عام امریکی کے بارے میں جو خواہش رکھتا تھا اس مشاہدے کو یوں پیش کیا جا سکتا ہے۔"جو بھی کچھ میری خواہش اور تمنا ہے وہ یہ ہے کہ یہ ملک ایسا رہے جہاں امیر بننے کا رستہ ہمیشہ کھلا رہے۔(۳۹) عام امریکی بھی ایسے ہی سوچتا ہے۔ دو دہائیاں گزریں وہاں چوبیس لاکھ لکھ پتی تھے۔ 1999 کے آخر میں ان کی تعداد پچاس لاکھ ہو گی۔ 1982 میں 13 ارب پتی تھے اور 2000 میں ان کی تعداد بڑھ کر 267 ہو گئی گذشتہ چند سالوں میں لوگوں کی آمدنی میں اضافہ نہ ہوا تو بہت سے ایسے لوگ تھے جو دولت مند ہونا نہیں چاہتے تھے یا مزید دولت فراہم کرنے کے بارے میں غافل ہو گئے تھے چنانچہ انتہائی ثروت مندوں کی تعداد کم ہو گئی ہے۔ امریکہ میں یہ منظر بہت سے مبالغوں کے ساتھ سامنے آیا کہ امریکہ میں انتہائی امیر لوگوں کے بارے میں داستان در داستان مشہوری ہوئی ان کے قصے تقریباً ساری دنیا میں پھیلے خصوصاً ان ملکوں میں جنہوں نے کمپیوٹر سے متعلق ٹیکنالوجی میں بڑی سرمایہ کاری کر رکھی ہے۔ اسی طرح ہندوستان میں بھی درمیانے طبقے سے بعض لوگ نو دریافت ایٹمی ٹیکنالوجی اور اس کی قابل رشک سافٹ ویر کی کامیابی کو دیکھ کر ہندوستان کے ایک سپر پاور ہونے کے بارے میں سوچنے لگے۔ ہندوستان کے ارب پتیوں میں بھی دلچسپی شروع ہوئی ان کی دولت کو اربوں روپے میں نہیں گنا گیا کہ اس طرح لوگوں کو روپے کی سمجھ آئے گی اس لیے ڈالروں میں گنا گیا۔

ہندوستان میں اب بھی رسالہ انڈیا ٹوڈے وسیع سطح پر پڑھا جاتا ہے۔ اس رسالے میں ہندوستان کے ارب پتیوں کے بارے میں مضامین چھپنے شروع ہوئے اور ان میں شامل ہیں۔ وپرو کے چیف ایگزیکٹو عظیم پریم جی "الفوسیز ٹیکنالوجیز کا نرائن مورتی اور سائیکا مور نیٹ ورک کے گورو راج دیشو پانڈے ہے۔ اور پھر دوسرے ملکوں میں پھیلے ہندوستانی اخباروں، انڈیا ابراڈ (نیویارک) اور انڈیا ویسٹ (کیلیفورنیا) اب بڑی باقاعدگی

سے فوربز میگزین کی ورق گردانی اس لیے کرتے ہیں کہ انہیں پتہ چلے کہ اب کتنے ہندوستانی دنیا کے پانچ سو امیر ترین افراد میں شامل ہو گئے ہیں۔ عظیم پریم جی کی عظیم کامیابی کے بارے میں 1999 اور 2000 سالوں میں ہندوستان کے اخبارات بھرے رہے اور جب سنڈے ٹائمز نے عظیم دنیا کو تیسرے امیر ترین آدمی کے طور پر پیش کیا تو بتایا کہ اس کے اثاثوں کی مالیت 35 ارب پاؤنڈ ہے تو تب درمیانے طبقے کے ہر ہندوستانی کا سینہ فخر سے پھول گیا۔ ایک ارب آبادی والے ملک ہندوستان میں کم از کم ایک ارب پتی پیدا ہونے پر فخر کیا جا سکتا ہے اور یہ کوئی نیم عریاں فقیر نہیں۔ مگر ہندوستانی تہذیب کا غالب پہلو روحانی ہے اور لوگوں کا رجحان بھی روحانی ہے۔ اس لیے پریم جی کے بارے میں تفصیل کے بعد یہ بھی لکھنا پڑا اور کمال احترام کے ساتھ کہ پریم جی کو اپنی دولت سے کوئی زیادہ پیار نہیں۔

ایک کے بعد دوسرا انٹرویو ہوا ہر ایک میں یہی بتایا گیا کہ اتنی دولت کے باوجود پریم جی کا دماغ پھر نہیں گیا۔ نہ ہی اس کے جمہوری طرز احساس میں کمی آئی ہے یعنی ایک ماں اپنے بچے سے پیار کرنا ترک کر سکتی ہے مگر پریم جی کی یہ صفات کم نہیں ہو سکتیں مگر جس تیزی سے پریم جی کو عروج حاصل ہوا اسی انداز میں اسے ٹھوکر لگی اور ہندوستان کے بڑے اخبار ہندوستان ٹائمز نے سوال اٹھایا کہ صرف ایک سال کے عرصے میں پریم جی دنیا کے پچاس امیر ترین لوگوں کی فہرست سے کیسے غائب ہو گیا (۴۱) جو ہندوستانی ان امیر ترین لوگوں کی فہرست میں شامل ہوتا ہے اس کو ہندوستان کی صلاحیتوں کی کامیابی اور خود اعتمادی پر محمول کیا جاتا اور کہا جاتا ہے کہ ہندوستان بھی اسی رنگ پر آ گیا ہے۔ مغرب کے رنگ میں رنگا ہوا ہندوستان کا متحرک درمیانہ طبقہ ہندوستان کے کسی شعبے میں نمایاں ہونے سے اتنا متاثر نہیں ہوتا جتنا امیر ترین لوگوں کی فہرست میں شامل ہونے والے ہندوستانیوں سے متاثر ہوتا ہے۔ دریں اثنا کسی نے یہ نہیں سوچا کہ چند سال پیشتر کسی ہندوستانی کے ارب پتی ہونے کی کوئی گنجائش نہ تھی مگر اب ارب پتی کے اس لفظ نے دیسی زمرے یا لفظ کروڑ پتی کی جگہ لے لی ہے۔ 100000 اس رقم کو لاکھ کہا جاتا ہے۔ دس ملین کی رقم کو کروڑ کہا جاتا ہے۔ دس ملین والی رقم کے لیے ہندوستان میں کوئی لفظ نہ تھا۔ اسی طرح بلین (ارب) کے لیے بھی کوئی لفظ نہ تھا۔ مگر سیاست کے علم نے ہندوستانی احساس کو بھی تبدیل کر کے رکھ دیا ہے پتی جو کروڑ کے بعد آتا ہے کا مطلب تھا مالک، خاوند یوں کروڑ پتی کا مطلب ہے

وہ جو بڑی دولت کا مالک ہو اس اصطلاح میں اخلاقی معاشیات کا عکس بھی پایا جاتا ہے۔ اس اخلاقی معاشی پہلو کا مطلب یہ تھا کہ جن کے پاس اتنی دولت آ گئی ہے وہ اسے کسی اعلیٰ مقصد کے لیے استعمال کریں (۴۲)

گزشتہ چند برسوں سے لکھ پتیوں اور کروڑ پتیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ 2000 کے وسط سے اب تک سٹاک مارکیٹوں کی کبھی کبھی خرابی کے باعث ایسی فہرست میں اضافہ آہستہ آہستہ ہوتا ہے اور اس حوالے سے سیاسی اور معاشی تبصروں میں اکثر قوموں میں غریبوں اور امیروں کے درمیان بڑھتے فرق کا ذکر ہونے لگا ہے۔ متعدد بین الاقوامی تنظیموں اقوام متحدہ کا ترقیاتی پروگرام، عالمی بنک اور تھرڈ ورڈ نیٹ ورک (پینا لگ) انٹرنیشنل فورم آن گلوبیلائزیشن (سان فرانسسکو) اور ورلڈ واچ انسٹی چیوٹ (واشنگٹن ڈی سی) جیسی اور دوسری بہت سی این جی او کی رپورٹوں میں بھی بتایا گیا ہے کہ شمال اور جنوب میں خلیج وسیع ہو رہی ہے اور مقبول تبصرے بھی امیروں اور غریبوں کی بڑھتی ہوئی تعداد پر ہو رہے ہیں۔ اکثر ممالک میں یہی صورت حال ہے۔ امریکہ میں ایک پکی رائے ہے کہ قوموں (اور افراد) کے درمیان نابرابری دراصل تاریخ کی ایک ناگزیر حقیقت ہے، امریکہ میں اس رائے سے کوئی اختلاف بلند نہیں ہوا۔ اسی طرح زیریں صحارا افریقہ میں گزشتہ ایک دہائی سے آمدنی کم ہوتی جا رہی ہے مگر اس پر کوئی توجہ نہیں دی جا رہی تاہم جب دنیا کے ضمیر پر وہاں کی خشک سالی، قحط، بچوں سے جنگی کام لینے اور نسلی قتل عام کا بوجھ بڑھے تو پھر ان کے بارے میں دنیا کی توجہ ہو جاتی ہے۔ (۴۴)

وال سٹریٹ جرنل تحقیق پر مبنی رائے کا اظہار کرتا ہے کہ بڑھوتری اور کار جوئی میں بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اس نے پیش گوئی کے طور پر نتیجہ اخذ کیا ہے کہ کار جویا ایئر پرنیٹو پر سوسائٹیوں کی آمدنیوں میں بڑا فرق ہے اور وہ اسے قبول بھی کرتی ہیں۔ (۴۵) اسی طرح افریقہ اور امریکہ کے درمیان عدم مساوات یا امریکہ او ای سی ڈی (معاشی تعاون اور ترقی کی تنظیم، آرگنائزیشن فار اکنامک کوآپریشن اینڈ ڈویلپمنٹ) کے ممالک کے درمیان عدم مساوات کو قدرت کی رضا کہا گیا ہے۔ دوسرے شعبوں کی طرح اس شعبہ میں بھی ارتقائی طریق کو ملحوظ رکھتے ہوئے انتہائی نامناسب انداز میں عدم مساوات کو قبول کیا جاتا ہے۔ (۴۶) مزید یہ کہ دنیا کی بجائے اپنے شہر اور اپنے ملک میں بڑھتی ہوئی عدم مساوات کا اندازہ لگانا آسان ہے۔ بہر طور دوسرے لوگوں کے لیے دوسری اقوام کے اندر کا یہ فرق

معلوم کرنا مشکل ہوتا ہے اور ویسے ایک دوسرے کے حال کا پورا علم بھی نہیں۔ غصے میں آئے ایک ڈرائیور کے ہاتھوں کتے کی موت کی خبر تو قومی اخباروں کی سرخی بن جاتی ہے۔ ایک بلی درختوں کی شاخوں میں پھنس جائے تو وہ بھی اخبار نویسوں کے لیے بڑی خبر بن جاتی ہے مگر عدل کو عام کرنے کا معاملہ اکثر امریکیوں کے دائرہ خبر میں نہیں آتا۔ ولیم جیمز فرد کی نفسیات کے بارے میں ایک طالب علم ہے ولیم جیمز نے کہا ''ہماری امریکی تہذیب کا بھیانک پہلو مجرد انصاف کی طرف ظالمانہ رویہ ہے۔ (۴۷)

لاکھ پتیوں کی تعداد بیوپار میں بڑھتی جا رہی ہے اس کے ساتھ ساتھ ارب پتیوں کی نئی نسل میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ افراد اور قوموں کی امارت اور غربت جانچنے کا معیار اب بل گیٹس کی دولت بنی ہوئی ہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں دولت کا معیار راک فیلر اور کارنیگیز کے اثاثوں سے مقرر ہوتا تھا پھر ہمارے زمانوں میں کویت اور سعودی عرب کے شیخوں کے اثاثے معیار بنے لیکن ان سب کے مقابلے میں جدیدیت کے زمانے میں عظیم الجثہ گیٹس کا کوئی مقابلہ نہیں۔ جب بھی مائیکروسافٹ کی قیمتیں بڑھتی ہیں بل گیٹس کے پرسنل ویلتھ کلاک کو بھی نئی شرح کے حساب سے بدلا جاتا ہے۔ 25 اگست 2001 میں جب فی شیئر قیمت 62.05 ڈالر ہو گئی گیٹس کی دولت کا اندازہ 70.70 ارب ڈالر لگایا گیا۔ اندازہ لگانے والی (ویب سائٹ) امریکہ میں اس رقم کے حوالے سے ہر مرد عورت کے حصے میں 245.884 ڈالر آتے ہیں جبکہ پوری دنیا میں ہر فرد کے حصے میں 11.3586 ڈالر آتے ہیں۔ (۴۸) فرض کریں کہ بل گیٹس گزشتہ پچیس برس میں چودہ گھنٹے کام کرتا تھا تو اس کی فی گھنٹہ اجرت یا معاوضہ 10 لاکھ ڈالر اور ہر سیکنڈ کی اجرت تین سو ڈالر ہے۔ بل گیٹس ویلتھ انڈیکس نام کی ویب سائٹ کے مطابق گیٹس کا وقت اتنا قیمتی تھا کہ اگر اس کے ہاتھ سے ہزار ڈالر کا نوٹ گر جائے تو وہ جھک کر اسے اٹھانے کی کوشش نہیں کرے گا کیونکہ اس عمل میں جتنا وقت صرف ہوگا اس وقت میں گیٹس اس سے کہیں زیادہ رقم کما لے گا۔ (۴۹) (ویب سائٹ) بل گیٹس نیٹ ورتھ پیج جمع تفریق کی مزید جامع تصویر پیش کرتا ہے یعنی گیٹس کی دولت کا مقابلہ دنیا کے بے شمار ممالک کی کل قومی پیداوار سے کیا گیا۔ دنیا کی سب سے بڑی کارپوریشن کے اثاثوں اور مارکیٹ میں موجود سرمایے اور سب سے بڑے بنکوں کے جمع شدہ سرمایے سے کیا گیا ہے۔ ویٹ سائٹ کا مصنف کہتا ہے کہ اگر گیٹس کی دولت کا اندازہ ہاتھ روک کر بھی لگایا جائے تو وہ چالیس ارب ڈالر ہے اور یہ نائیجیریا اور یوکرین جیسے بے شمار ملکوں کی کل قومی

پیداوار سے بھی زیادہ مالیت کا ہے۔(۵۰) انٹرنیٹ پر دولت کے بارے میں اندازے قیافے اور مقابلے ہوتے رہتے ہیں مگر صرف انٹرنیٹ تک ہی محدود نہیں کہ جس کی وجہ سے بل گیٹس، ٹیکنالوجی کے بڑے ای سی اور اثاثوں کے باعث ان میں اور دنیا بھر کے غریبوں کی خلیج اور گہری اور وسیع ہوتی جا رہی۔ ان غریبوں میں شامل ہیں جنگ کا نشانہ بننے والے اندرونی طور پر بے گھر ہونے والے، نسل کشی، خشک سالی کا شکار ہونے والے اور وہ بھی جو ہندوستان، چین، افریقہ اور جنوبی امریکہ کے دور دراز علاقوں میں انتہائی عسرت میں دن گزار رہے ہیں۔ اخباروں نے امیروں اور غریبوں کے درمیان بڑھتے ہوئے افسوسناک فاصلوں کی پیمائش کے لیے اپنا پیمانہ بنایا ہے۔ شیئرڈ کیپٹلزم انسٹی ٹیوٹ کے جیف گیٹس (جیف ہے۔ مل نہیں) نے امریکی معاشرے میں دولت کی تقسیم کا مطالعہ کرنے والے ماہر معاشیات ایڈورڈ وولف کے فراہم کردہ اعداد و شمار کے حوالے سے بل گیٹس کی دولت کو ایک دوسرے پس منظر میں پیش کیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ بل کی دولت مجموعی طور پر نیچے کے 45 فی صد امریکیوں کے کل اثاثو سے بھی زیادہ ہے اور پھر انہیں اعداد و شمار کے حوالے سے وہ یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ نیچے کے 45 فی صد امریکیوں کے پاس جتنی دولت ہے وہ ترقی پذیر یا پس ماندہ ممالک کے درمیانے طبقے کے کل اثاثوں اور دولت سے بھی زیادہ ہے۔ بل گیٹس اور مائیکروسافٹ قائم کرنے میں اس کے شریک پال ایلن کے اثاثے جمع ان کے ساتھ کے ارب پتی وارن لیفٹ کے مجموعی اثاثے دنیا کے اکتالیس غریب ممالک کی مجموعی قومی پیداوار سے بھی زیادہ ہیں۔(۵۱) ان چند افراد کے اثاثوں کو چھوڑ کر پوری امریکی آبادی کے اثاثوں کو دیکھیں تو معاملہ کہیں سے کہیں جا پہنچتا ہے یعنی یہ ایک اور کہانی ہے۔ اوپر کے چار سو امیر امریکیوں کی آمدنی میں اوسط (99-1998) سالانہ اضافہ چورانوے کروڑ ڈالر کا ہوا جبکہ 1983 اور 1995 کے درمیان نیچے کے چالیس فی صد امریکیوں کے نقد اثاثوں میں 80 فیصد کی کمی ہوئی۔ امریکہ کے کل اثاثوں میں سے ایک فی صد امریکی 95 فی صد کے مالک ہیں اور اسی (80) فیصد امریکی بیس سال پہلے جو کماتے تھے اب اس کے مقابلے میں کم کمائی کر رہے ہیں۔(۵۴)

ساری دنیا میں عدم مساوات میں اضافہ کا قصہ بہت معمولی شکل میں بیان ہو چکا ہے۔ مثلاً ان اعداد و شمار میں جن میں امریکی معاشرے کی خوشحالی اور گل و گلزار کا زیادہ ذکر ہے۔ ہیومن ڈیولپمنٹ رپورٹ میں ہر سال شمال اور جنوب کے مابین بڑھتے ہوئے فاصلوں کی خطرناک تصویر پیش کی جاتی ہے۔ ہر چند اس رپورٹ کے مرتب کرنے والے

اپنی رپورٹ میں خاص مقصد سے کچھ ایسی خبریں بھی شامل کر لیتے ہیں جن کے ذریعے دنیا کے غریب ترین ممالک میں ہونے والی سماجی اور معاشی ترقی کے کچھ پہلو دکھائے جاتے ہیں۔ مثلاً سیلولر اور انٹرنیٹ استعمال کرنے والوں میں اضافہ کو ان کی ترقی کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ 1960 اور 1993 کے درمیان اہم اور غریب ملکوں کی پر کیپیٹا انکم (فی کس آمدنی) میں فاصلہ یا فرق تین گنا بڑھ گیا ہے۔ یہ فرق 5700 ڈالر سے بڑھ کر 15400 ڈالر ہو گیا۔ ان غریب ملکوں کی فی کس آمدنی میں اضافہ کے لیے مالی امداد اور معاشی پیکج بھی دیئے گئے تاکہ یہ فرق کم ہو۔ مگر نتیجہ الٹا ہوا یعنی یہ فرق بڑھتا گیا۔ 1900 میں امریکہ کی فی کس آمدنی حبشہ (ایتھوپیا) والوں کی فی کس آمدنی سے نو گنا تھی۔ آج یہ پینتالیس گنا ہے۔ 1960 میں امیر ترین ترقی یافتہ ممالک میں رہنے والے اوپر کے بیس فیصد لوگوں کی آمدنی اور دنیا کے غریب ترین ملکوں کے نیچے کی بیس فی صد آمدنی میں تیس اور ایک کا فرق تھا۔ 1990 میں ساٹھ ایک ہوا اور 1997 میں پچھتر اور ایک ہو گیا۔ یہی ہیں اعداد و شمار جو مختلف صورتوں میں سامنے آتے ہیں۔ اقوام متحدہ کی ہیومن ڈیویلپمنٹ رپورٹ 2001 کے ابتدائیہ میں لکھا ہے کہ 1993 میں دنیا کے دس فی صد غریب ترین لوگوں کے پاس دس فی صد امیر ترین لوگوں کے مقابلے میں صرف 1.6 فیصد دولت تھی۔ غریب ملکوں کے 57 فی صد لوگوں کی آمدنی امیروں کی آمدنی کے صرف ایک فی صد تھی۔ امریکی آبادی کی دس فی صد امیر یا 25 لاکھ لوگوں کے پاس دنیا کے غریب ترین ملکوں کی کل 43 فیصد یا دو ارب لوگوں کے پاس اثاثے یا آمدنی برابر تھی۔ (۵۸) یہ اعداد و شمار ان لوگوں کی قوت خرید کو بنیاد بنا کر مرتب کیے گئے ہیں۔

نسلی اور سماجی پہلوؤں سے جب افلاس اور عدم مساوات کا جائزہ لیا جاتا ہے تو انتہائی امیر (لوگوں اور ملکوں) کی دولت کے بارے میں اعداد و شمار بآسانی ہاتھ آجاتے ہیں۔ بہر طور اگر ہم بہت ہی امیر لوگوں کی زندگی کی خصوصیات کو معمولی شے سمجھ کر نظر انداز کر دیں تو یہ بڑی غلطی ہو گی۔ مثلاً برطانیہ کی شہزادی ڈیانا نے بیس ہزار ڈالر کی مالیت کے گاؤن پہنے۔ امیلڈا مارکس کے گھر سے جرابوں کے تین ہزار جوڑے برآمد ہوئے۔ بھگوان رجنیش کے پاس رولز رائس کی 93 گاڑیاں تھیں۔ ان کو بے شک فالتو خانے میں ڈالیں یا انہیں ضمنی دولت میں۔ ایسی بہت سی فالتو دولت آمدنی اور دولت کے معتبر تجزیوں میں شمار نہیں ہوتی اور یہ تجزیے بھی سرمایہ داری، ٹیکنالوجی، ایجادات، مارکیٹنگ، اجارہ داری اور کارپوریٹ

ٹرانسنیشنلزم کی تاریخوں میں سے ہیں۔ اس بظاہر فالتو اشیا کو سماجی علوم کے نقشے میں وہی جگہ ملنی چاہیے جو کوڑا کرکٹ کو شہر اور صنعتی علاقوں میں ملتی ہے۔ اگر ہم جدید معاشروں کی نوعیت کا نقشہ بنائیں، صرفے کی صورت مال کو سمجھ سکیں اس کے ساتھ ساتھ لائف سٹائلز اور کھانے پینے کی عادات جان سکیں تو اس کے لیے کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں پر نظر ڈالنا پڑے گی۔ ہم کوڑے کرکٹ کے بہت بڑے بڑے ڈھیر لگاتے ہیں۔ امریکی معاشرے کی انتہا کی امارت اور ضیاع کا اندازہ اس بات سے لگایا جائے کہ دنیا بھر میں جو کوڑا کرکٹ پیدا ہوتا ہے اس کا نصف تو صرف امریکہ کا ہوتا ہے۔

اس وقت جو غالب منظر ہے اس کا تقاضہ ہے کہ ہم غریبوں کو ایک مسئلہ سمجھیں۔ اس وقت دنیا کے کوئی ایک ارب کے قریب افراد کی روزانہ آمدنی ایک ڈالر سے بھی کم ہے اور دنیا کی آدھی آبادی کی روزانہ آمدنی فی ڈالر ہے۔ مسئلہ کی گمبھیرتا تقاضا کرتی ہے کہ اس کے حوالے سے دنیا کے دردمندوں کو ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا جائے کہ وہ اس مسئلہ کے حل پر توجہ دیں۔ جب ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ زیادہ فضلہ یا کوڑا کرکٹ کس کا ہوتا ہے تو پھر کہا جاتا ہے کہ امیر کیا غریب یہ آفاقی یا عالمگیر معاشرے کے مسائل ہیں۔ امیروں اور غریبوں کے لائف سٹائل کا تقابل کریں تو کیا واقعی نادار کا کوئی لائف سٹائل ہے؟ بلاشک کچھ لوگ یہ بھی پوچھیں گے۔ کیا کبھی اس کی کوئی معقول تاریخ بھی لکھی گئی ہے۔ تاہم افلاس کی تاریخ لکھنے کا سب سے بہترین طریقہ یہی ہے کہ انتہائی امیر لوگوں یا ان کی امارت کے بارے میں لکھا جائے۔ اس طرز فکر سے یہ نتیجہ نہ اخذ کیا جائے کہ غریب روحانی لحاظ سے بہتر زندگی گزارتا ہے نہ ہی اس سے یہ مراد ہے کہ افلاس کو عظیم ثابت کیا جائے یا یہ بہانہ تراش لیا جائے کہ لازمی ضروریات پوری کرنا اور بہت ہی معمولی سی آسائشیں لوگوں کی فلاح میں کوئی خاص کردار نہیں ادا کرتیں مگر جذباتی اور منطقی دونوں حوالوں سے دیکھا جائے تو پھر گہرائی میں جا کر پتہ چلتا ہے کہ امیر کی زندگی میں غریبی کہاں ہوتی ہے۔ انتہائی امیر کا انحصار کس حد تک انتہائی غریبوں پر ہے اور کہاں کہاں دولت اور غریبی کے ڈانڈے ملتے ہیں۔ ایک پرانا قول ہے کہ غریب ہمیشہ ہمارے ساتھ ہوگا، اس کا دوسرا نصف یعنی امیر ہمیشہ ہمارے ساتھ رہے گا اس عوامی دانش کا حصہ نہیں بن سکا جو ہمیں ورثے میں ملی ہے۔ تو پھر ہم جب تک آج کے امیروں کے خلاف آواز نہیں اٹھاتے تو پھر یہ کیسے سوچ لیں کہ ایک اور قسم کا مستقبل بھی ہوگا جو موجود سے منکر ہوگا یا مختلف ہوگا۔

باب 6

اختلافی مستقبل

جمعیت یا موضوع بندی تمام نظام علوم کا ایک اٹوٹ انگ ہوتا ہے۔ بڑی عالمانہ کتابوں کی پشت پر لکھا ہوتا ہے کہ کتاب کا علمی موضوع کیا ہے، تحقیق کا پہلو کیا ہے، یہ کام کس نے کیا اور جہاں موضوع دو مضامین کے ہوں تو پڑھنے والا ایک دم چونک جاتا ہے کہ یہ کیسا اچھا کام ہوگا جس میں دو شعبوں کو ایک ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ سماٹرا کے پہاڑی علاقوں میں ایک مقام یا علاقہ گائیو ہے یہاں کے مسلم معاشرے کا حال ہی میں مطالعہ کیا گیا ہے اور اس پر کتاب لکھی گئی ہے جس میں دو موضوعات علم البشریات اور مذہب پر بیک وقت بات کی گئی ہے۔ (۱) اسی طرح ایک دوسری کتاب کی پشت پر بھی مذہب اور عوامی ثقافت دو شعبوں کا ایک ساتھ ذکر کیا گیا ہے (۲) کتاب کا نام ہے Children of Ezekiel, UFOS, The Crisis of Race, and The Advent of End Time

علم البشریات اور مذہب علمی سطح پر دراصل ایک فطری جوڑا بن سکتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بشریات میں بہت تنوع ہے اور لگتا ہے کہ اس کے عالموں کے زیر مطالعہ ساخت، تشدد، عالمگیریت، مادی ثقافت اور جنسی طریقے رہتے ہیں۔ بشریات کے ماہرین نے ہمیشہ یہ فرض کر لیا ہے کہ مقامی یا قدیم لوگوں کے معاشروں میں عقائد کا ایک نظام یا مذہب ضرور ہوتا ہے۔ بشریات والوں نے روایتی انداز میں جن معاشروں یا گروہوں کی زندگی کا مطالعہ کیا ان کے بارے میں کہا گیا کہ ان کے ہاں بھی الوہی یا خدائی تصور موجود تھا، تاہم جدید زمانے کے ذرا معتبر قسم کے بشریاتی ماہرین مزاجاً سیکولر ہیں اس لیے اب

انہیں مذہب بہت پس ماندہ، کم ترقی یافتہ لوگوں میں نظر آتا ہے یا ترقی یافتہ دنیا کے ان عوام میں جو بڑی حد تک بے خبر ہیں۔ ''عوامی کلچر'' ایک ایسا لفظ ہے جو یہ بتاتا ہے کہ کتاب کا موضوع ترقی یافتہ دنیا ہے یا شہری معاملہ ہے یا تیسری دنیا کے جدید سیکٹر کے بارے میں ہے: جہاں تک قدیم لوگوں کا تعلق ہے جو موضوع کے لحاظ سے کبھی بشریات کے باوا آدم ہوا کرتے تھے ان کا کوئی مقبول یا مستند کلچر نہیں ہے بلکہ صرف لوک کلچر ہے۔ یہ مقبول یا مستند کلچر ہرگز باقی نہ ہوتا اگر اسے مطبوعہ یا تصویری صورت میں کسی حد تک فیتہ بند کر کے اور ثقافتی مضامین میں وسیع پیانے پر پیش نہ کیا گیا ہوتا۔

ہم بجا طور پر وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ بہت کم ایسی کتابیں ہوں گی جن کے بارے میں کہا جائے گا کہ ان میں بیک وقت تین شعبوں بشریات، مذہب اور مقبول یا عوامی کلچر کو شامل کیا گیا ہے۔ دسری طرف ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جو لکیریں تاریخ، بشریات اور سماجیات کو الگ الگ کرتی ہیں وہ کسی کسی وقت بہت دھندلا بھی جاتی ہیں۔ حال ہی میں بعض کتابیں ایسی لکھی گئی ہیں یا بعض کام ایسے ہوئے ہیں جن کا مطلب یہ تھا کہ مختلف شعبوں کا تفصیلی اشتراک کیا جائے اور اس طرح اس میں ایک ایسا میدان یا شعبہ بھی پورا ہو گیا جسے ثقافتی مطالعے کا نام دیا گیا ہے۔ ہر چند زیادہ تر یونیورسٹیوں نے اس شعبہ کو رسمی طور پر تسلیم کرنے میں دیر لگائی یعنی شعبہ قائم کرنے، یہاں پر ڈاکٹریٹ کی سطح پر تحقیق کروانے، باقاعدہ چیئر قائم کرنے میں تاخیر کی، دوسری طرف ثقافتی مطالعوں کے بارے میں کتابوں کی اچھی دوکانوں میں خصوصاً جہاں پرانی اعلیٰ علمی اور اچھی کتابیں دستیاب ہیں کم از کم ایک حصہ ثقافتی جائزوں کی کتابوں پر بھی موجود ہے۔ تاہم بندے کو اکثر یہ گمان ہوتا ہے کہ ثقافتی مطالعے میں فالتو، باقی ماندہ، یا بغیر درجہ بندی والی چیزیں ہوں گی اس لیے مندرجہ بالا کتاب **Children of Ezekiel** کا ٹھکانہ بھی آخر ''ثقافتی مطالعوں'' والے سیکشن میں ہی ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ سائنسی کہانی تو نہیں ہے اور سائنسی کہانی بھی دو تین دہائی پہلے کبھی بھی علمی توجہ کا مرکز نہیں بنی تھی اور اگر بنی بھی تو اس وقت جب ادب کے نقادوں نے اس پر توجہ دی۔ مگر اس کتاب (چلڈرن آف ایزیکل) کی ضمنی سرخی یا عنوان میں ان لوگوں کے لیے کشش ہے جن کی ہزاری مطالعوں، قیامت ناموں، مذہب اور نسلی جائزوں میں دلچسپی ہے۔ اس کی ضمنی سرخی ''نسل'' کو دیکھ کر اسے (کتاب کو) ثقافتی

مطالعوں کے شعبے میں ڈال دیا جائے گا یا اگر کسی نے اسے غور سے دیکھا ہے تو پھر وہ اسے سماجیات کے شعبے میں رکھ دے گا۔ عوام کے نقطۂ نظر سے ثقافتی مطالعہ کے ساتھ ایک بنیادی مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ اس میں ایک خاص قسم کا طنطنہ یا بڑبولا پن ہوتا ہے کہ ثقافتی مطالعوں سے پہلے ثقافتی مطالعے کی کوئی تاریخ ہی نہیں تھی۔ تاہم ثقافتی ماہرین کو علم ہے کہ ان کے علم کی بنیادیں مختلف اور متضاد حدود سے شروع ہوتی ہیں ان میں متضاد نظریات بھی آتے ہیں۔ ایک طرف نفسیاتی تجزیاتی ڈھنگ ہے دوسری طرف مارکسزم کے بعد کے فلسفہ سے لے کر مابعد نوآبادیاتی نظریہ اور مابعد سٹرکچرلزم اور یہ بھی کہ ثقافت کا مطالعہ لوگوں کی نمائندگی کی سیاست اور آئین کے بارے میں نئے سوال پیدا کرتا ہے اس کے باوجود ثقافتی جائزہ کاروں کو ہردم اس سوال کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ کیا ہم ہمیشہ یہی ثقافت نہیں پڑھتے رہے'؟؟

بظاہر سوال بے ڈھنگا اور ڈھیلا سا ہے مگر ثقافتی مطالعہ کے پاس اس کا کوئی نرم سا جواب بھی نہیں۔ معاملہ یہ ہے کہ ثقافتی مطالعہ دراصل خود ثقافت کا بھی تو مطالعہ ہے۔ سٹیورٹ ہال اس کے بانیوں میں ہیں۔ بہت نمایاں اس لیے اسے بعض اوقات ''بابائے ثقافتی مطالعہ بھی کہا جاتا ہے، ثقافتی مطالعہ کا آغاز برطانیہ سے ہوا تھا اس لیے دو دہائی بعد سٹیورٹ ہال نے تسلیم کیا کہ ''ثقافتی مطالعہ کوئی ایک چیز نہیں ہے یہ کبھی بھی ایک شے نہیں تھا۔ (۵) جدید درسیاتی علوم میں سے ثقافتی مطالعہ کا ایک شعبہ کی صورت اختیار کر جانا دوسرے علوم کے لیے باعث افسوس تھا چنانچہ ہال کا خیال تھا کہ یہ کبھی الگ شعبہ نہیں بن سکے گا۔ اس کے علاوہ اگر ثقافتی مطالعہ کوئی ایک شے نہیں ہے تو پھر ایک زوردار شبہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ صرف وہی کچھ ہے جو اس کے ماہرین نے اسے بنا دیا ہے، دوسرے لفظوں میں ایک دوسرے پیرائے میں یہ کہا جائے کہ یہ تو بس ٹھس ہی ٹھس ہے اور کچھ بھی نہیں۔ مخالفین کہتے ہیں کہ ثقافتی مطالعہ بڑا ڈھیلا ڈھالا شعبہ ہے اس میں کوئی نظم اور ترتیب نہیں۔ 'اخلاقی اضافیت کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور خود اس میں ''توانائی'' بھی نہیں۔ توانائی وغیرہ ان صفات میں شامل ہے جن کی کبھی کوئی جامع تعریف نہیں کی گئی۔ پھر ایک ان کہا مفروضہ بھی ہے، کہ معاشیات شماریات اور خالص سائنسی مضامین اور توادر کلاسیکل زبان کا مطالعہ بھی توانائی مانگتا ہے۔ مگر ثقافت کے مطالعہ سے ایک مجہول اور نظریہ سے لدا عہدنامہ موجود ہے

اس کی شکل، عموماً زوال آشنا ہے اور لگتا ہے کہ یہ اصل علم کے ساتھ ایک طرح کی مسخری کر رہا ہے۔ امریکی لغات میں ثقافتی مطالعہ کوئی راکٹ ایسی سائنس نہیں ہے یعنی راکٹ سائنس سے مراد ہے وہ علم جس پر کوئی تنازعہ نہ ہو اور جس کے لیے برسوں کی محنت، ذہانت اور تربیت کی گئی ہو۔ اس جیسے تصور کی گرفت ایسی خوفناک ہے کہ جو کوئی بھی راکٹ سائنس کا حوالہ دیتا ہے اس میں یہ پوچھنے کی جرات بھی نہیں ہوتی کہ آخر راکٹ سائنس کا گن کیا ہے اور کیا اس قسم کی مشتبہ سائینسوں کے بغیر دنیا ایک بہتر جگہ نہ ہوگی؟

ثقافتی مطالعہ دوسرے علمی شعبوں کو تسلیم نہیں کرتا مگر خود ان میں پھنسا ہوا ہے۔ بہر طور یہ مطالعہ اس نوعیت کا ہے کہ اس کے ذریعے لوگ دوسروں کی ثقافت کو سمجھنے پر مائل ہو جائیں گے اور اس کے ذریعے ثقافتی مکالمہ میں بھی اضافہ ہوگا۔ ثقافتی مطالعہ کے علم نے یونیورسٹیوں خاص کر امریکہ میں غیر معمولی کامیابی حاصل کر لی ہے۔ روائتی علمی شعبوں کو جس قدر توجہ اعلیٰ تعلیمی اداروں سے ملتی ہے۔ ویسی امداد تو ابھی ثقافتی مطالعہ کو نہیں ملی اور اس کو ایک شعبہ کی واضح صورت دینے میں بھی ہچکچاہٹ موجود ہے۔ اس کے باوجود اس نے غیر معمولی اہمیت اور مقام حاصل کر لیا ہے۔ ثقافتی مطالعہ کے بارے میں بے شمار کانفرنسیں ہوئی ہیں اور دوسرے رسائل و جرائد کے علاوہ مندرجہ ذیل ذیلی معروف جریدے بھی چھپ رہے ہیں۔ کلچرل سٹڈیز، نیو فارمیشنز، سوشل ٹیکسٹ، کلچرل کریٹیک، باؤنڈری ٹو، پبلک کلچر، ڈفرینسز، ارنیا، یہ مطبوعات گزشتہ دو دہائیوں سے شروع ہوئی ہیں اور ان کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے کہ یہ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ثقافتی مطالعہ کو فروغ دے رہی ہیں۔ اس شعبہ سے وابستگان کی بہت بڑی تعداد اپنی قومیت کا رشتہ سابق نو آبادیاتی دنیا سے جوڑتی ہے انہیں ان کے کام کے حوالے سے امریکی علمی دنیا کے سب سے روشن ستارے کہا جاتا ہے۔ ان کی تنخواہیں حیران کن حد تک زیادہ ہیں۔ بہت سی یونیورسٹیوں میں یہ پروفیسر اور شعبے کے سربراہ بن گئے ہیں اور انہیں ایسی شہرت حاصل ہوئی جیسی فلمی ستاروں اور معروف سماجی شخصیات کو حاصل ہے۔ اس کی ایک مثال پروفیسر ہومی بھابھا ہیں جو شکاگو یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے۔ انہیں ہارورڈ یونیورسٹی لے اڑی تو ان کے بارے میں نیو یارک ٹائمز میں ایک بہت طویل مضمون چھپا اور رپورٹر نے بتایا کہ شکاگو سے پروفیسر بھابھا کا لے اڑنا ایسے ہی ہے جیسے کوئی بڑا انقلاب ہو جائے اور جیسے سیمی سوسا بوسٹن ریڈ

سوکس میں چلی گئی ہو۔ (۶)

ہر چند امریکہ میں اساتذہ اور یونیورسٹیوں کے عملے کی تنخواہیں بہت ہیں مگر جیسے امریکی سپورٹس مین لیگ میچ کھیلنے والے بڑے معاوضوں کے پیچھے دوڑتے ہیں اس طرح یہ تجارت جاری رہتی ہے اور اسی طرح آوی لیگ کا مطالعہ بھی اسی قسم کی سودے بازی میں چلتا ہے۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ شکاگو کے شدید سرد موسم کے باعث بھابا بوسٹن چلا گیا یا یہ کہ علمی اعتبار سے ہارورڈ کے مقابلے میں شکاگو کی کوئی کم اہمیت ہے۔ مگر ہارورڈ کے نام میں جو چکا چوند ہے وہ شکاگو میں کہاں۔ پھر جب معاملہ سابق آبادیاتی علاقے خصوصاً اس علاقے کی پارسی برادری سے ہو تو پھر ہارورڈ میں کشش بہت زیادہ ہو، پھر پارسی لوگوں نے تو اپنا رشتہ جدید مغرب کی اخلاقی اور فکری تاریخ سے جوڑ رکھا ہے۔ (۷) چنانچہ باوقار علمی خزانے سے وابستگی میں تو خاص میٹھا مزا ہے۔ دوغلا پن' وچولا پن اور نوآبادیاتی تضادات بھابھا کے ٹریڈ مارکہ بن گئے ہیں (۸) عالم فاضل لوگ یہ نہیں چاہتے کہ انہوں نے بڑی سوچ بچار کے بعد جو نظریات بنائے ہیں انہیں صرف ان کی ذاتی فکر کی جزوی تخلیق سمجھا جائے تاہم جنہوں نے نوآبادیات کرنے والوں کی کمزور اخلاقیات اور جابر حکومتوں کی کارکردگی کے بارے میں مطالعے میں عمریں گزار دی ہیں ان عالموں میں اس قسم کے عالمانہ تضادات یا متبادل فکری بڑی حد تک قابل معافی ہے۔ امریکہ آنے سے پہلے بھابھا نے بہت وقت اچھی برطانوی یونیورسٹی میں گزارا۔ چنانچہ بہت عرصہ اس نے درمیانی سیڑھی پر گزارا اور اب اس کے لیے بہر طور سب سے اونچا مقام حاصل کرنا ہی رہ گیا تھا۔

امریکی یونیورسٹیوں میں نامور اساتذہ کی (تنخواہوں کے لیے) سودا بازی بڑی عام ہو چکی ہے اور یہ افواہیں اور خبریں اکثر سننے میں آتی ہیں کہ ان یونیورسٹیوں میں تازہ دار دان آج یہاں اور کل وہاں آ جا رہے ہیں، بعض اوقات تو یہ ابھی کسی یونیورسٹی میں آتے بھی نہیں تو ان کے بارے میں ترک ادارہ کی افواہیں شروع ہو جاتی ہیں۔ اکیڈیمی یعنی شعبہ علم و دانش اور تعلیم میں بھی کارپوریٹ سیکٹر کی طرح زبردست سودے کیے جاتے ہیں اور اس میں کسی قسم کی شرمندگی محسوس نہیں کی جاتی اور اب اس بات کا بھی دھیان نہیں رکھا جاتا کہ علم کا انعام تو خود علم ہے اور ذہنی اور فکری قسم کی زندگی گزارنے میں جو مزا تھا اس کی بھی اب کوئی اہمیت نہیں رہی۔ ثقافتی مطالعہ کرنے اور مابعد نوآبادیات کے نظریہ سازوں

میں اس قسم کے معاشی سودوں پر کم ہی تنقید ہوتی ہے حالانکہ یہ لوگ ترقی یافتہ سرمایہ داری کے بارے میں مارکس کے نظریات کے بڑے معترف ہیں۔ تو یہ سارے معاملے سرعام ہو رہے ہیں۔ پہلی نسلوں کے علما کی شہرت اور قابلیت کا چرچا زیادہ تر ان کے ان طالب علموں کے ذریعے ہوتا تھا جو ان کے تربیت یافتہ ہوتے تھے اور وہ یونیورسٹیوں میں اہم جگہوں پر متعین بھی ہوتے، ان نسلوں کے برعکس آج کے عالم فاضل (سپر سٹارز) ایک یونیورسٹی میں زیادہ دیر کم ہی ٹھہرتے ہیں اور علما کی ایک نسل کو تیار کرنے سے پہلے ہی کہیں اور کوچ کر جاتے ہیں۔ ان سپر سٹارز فاضل لوگوں کی اداروں سے وابستگی دراصل ان کے اپنے ثقافتی ورثے سے وابستگی کی مرہون منت ہے۔ وہ دنیا دار ہیں اور یہی امور ان کا رویہ متعین کرتے ہیں۔ ان کو یقین ہوتا ہے کہ ان کے چاہنے والے ہر اس کانفرنس اور یونیورسٹی میں موجود ہیں جہاں وہ جاتے ہیں اگرچہ ثقافتی امور کے ماہرین اور مابعد نوآبادیات کے نظریہ سازوں نے بڑی بڑی معروف کتابوں اور بیانات کا کڑا جائزہ لیا ہے اور خرد افروزی کی تہہ میں ایک خاص قسم کے تعصب کو رکھ کر بھی آفاقیت کا چولا پہننے کی صدا لگائی ہے اور پھر انہیں مقدس گردانتے ہوئے ان کی تشریح و تفسیریں کی ہے جیسے بائبل کی شرح کی جاتی ہے۔ نوآبادیاتی کلچر' شناخت کی سیاست، مقبول عام کلچر اور ادب' کلچر اور جدید معاشروں کی نادار اشیاء کے بارے میں تحریر یا تجزیہ کرتے ہوئے یہ لازم ہے کہ مندرجہ بالا عاموں کی تحریریں بطور سند پیش کی جائیں۔ ان سپر سٹاروں اور ان کے قریبی جانشینوں کی اپنی اپنی جاگیریں ہیں۔ اپنی چھوٹی سی بادشاہت اور سلطنت جن کا وہ مطالعہ کرتے ہیں اور پھر اسے توڑ دیتے ہیں۔

ثقافتی مطالعوں اور ثقافتی ماہرین کو یونیورسٹیوں میں کوئی معمولی شے نہیں سمجھا جاتا۔ اس لیے کہ انہوں نے امریکہ کی مالی لحاظ سے زیر سرپرستی لی گئی علمیت میں بڑی جلدی مقام حاصل کرلیا ہے۔ پھر یہ اپنا اثبات یا موجودگی بھی دھونس سے کرواتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ شعبہ علم اور سیاست اور عوامی امور کے بارے میں بڑے بڑے مشکل سوالات بھی اٹھاتا ہے۔ علم کے ڈھانچے میں انکار اور اختلاف کے امکانات کو کم کرتا ہے اور اس محدود مستقبل کے بارے میں پوچھ گچھ کرتا ہے جس کا تصور یونیورسٹی کے ان عالم فاضل لوگوں نے قائم کیا جو خود کو ترقی پسندانہ سوچ کے پیش رو سمجھتے تھے۔ امریکی یونیورسٹیوں میں ثقافتی

مطالعہ کو اس وقت زیادہ پذیرائی ملنے لگی جب سب سے بڑے عہدہ پر ایک ایسا شخص منتخب ہو کر آیا جس کے دل و دماغ میں یہ خیال چھایا ہوا تھا کہ ''بدی کی سلطنت'' کو روکنا ہے۔ یعنی اسے اور اس کے اصلی یا مشتبہ حواریوں کو ہوا خواہوں نے دوسرے لوگوں کو ادب آداب سکھانے ہیں۔ گوشمالی کرنا ہے اور انہیں نیچا دکھانا ہے اور حکومتی اثرات میں کمی کر کے پرائیویٹ کاروبار اور انتظام کو ''امریکی انداز'' قرار دے کر اس کا حوصلہ بڑھانا ہے۔ یعنی اب اس انداز سے بے شمار معاشی، سماجی اور سیاسی مسائل کو حل کرنا ہے۔ 1980 کی دہائی میں ثقافتی مطالعہ کے شعبہ کے پاؤں یونیورسٹیوں میں پوری طرح جم گئے تھے۔ خصوصاً طلبا اور سرگرم عناصر کے حوالے سے کثیر الثقافتی اور شناخت کی سیاست کی تجسیم ان مطالعوں میں کر دی گئی تھی۔ ری پبلکن حکومت کے اقتدار میں آنے کے بعد سماجی بہبود کے پروگرام کم کر دیے گئے اور بہت سے ایسے لوگوں کو جنہیں مخالف اور ضدی سمجھا گیا نیکی، نظم و ضبط کی پابندی اور پرہیز کا درس دیا گیا۔ انتظامی انقلاب کے نام پر کارپوریشنوں کی کارکردگی میں اضافہ کیا گیا، ملازموں کی چھانٹی کر کے ڈاون سائزنگ کی گئی، کارپوریٹ کمائی بڑھائی گئی اور اپنے سینئر افسروں کو واہیات حد تک مالی فوائد پہنچائے گئے۔ 1980 اور 1990 کی دہائیوں میں یونیورسٹیوں میں ثقافتی مطالعہ کا بڑا چرچا ہوا۔ تب طبقاتی فرق اور بڑھنے لگا اس کی پیمائش یوں ہوئی کہ ایک طرف افلاس کی لکیر سے نیچے لوگوں کی تعداد بڑھنے لگی، دوسری طرف انتہائی ثروت مند افراد کی تعداد میں بھی دن دوگنا رات چوگنا اضافہ ہونے لگا۔ مگر ان رجحانات پر ثقافتی مطالعہ نے شاذ ہی توجہ مرکوز کی اس طرح امریکی منحرفین کی نظر میں یہ مطالعہ افسوس ناک حد تک طبقاتی مسئلہ سے دامن کشاں رہا۔ (۹)

یونیورسٹیوں کے بارے میں ہمیشہ یہ تصور کیا گیا کہ یہ آزادی کے مقام ہیں خود مختار دنیا کے۔ سیاست کی غلیظ دنیا کی آلائشوں سے نسبتاً پاک صاف ہے اور یہاں خالص افکار کو پذیرائی مل سکتی ہے۔ غالب سیاسی خیال یہی تھا کہ یونیورسٹیاں بالکل اسی کیفیت میں ہیں۔ ایک طرف شناختی سیاست کو فروغ ملا اور کوشش کی گئی کہ ان تمام مظلوم، پس ماندہ اور خاموش کر دیئے گئے لوگوں کے حوالے سے ایک رنگا رنگ قوس قزح بنائی جائے۔ لتامانی نے 1990 کی دہائی کے شروع میں ثقافتی مطالعے کے بارے میں لکھا ''ثقافتی مطالعہ نے مختلف عنار کے درمیان ہم قدری قائم کرنے کی ایک مشکل زنجیر بنائی اور عورتوں، امریکہ

میں رنگدار لوگوں، تیسری دنیا کے لوگوں، ہم جنس پرست عورتوں اور مردوں میں ہم قدری یا برابری قائم کی۔ اس کا بالواسطہ مطلب یہ ہے کہ یہ گروپ مابعد جدیدیت کے مماثل انداز کے جال میں گرفتار کیے گئے'' مگر مانی نے کہا کہ ''اختلافات کی فہرت تیار کرنا، دراصل اختلافات کی نوعیت کو دیکھنے بھالنے سے مختلف کام ہے اور ان عناصر میں جو اشتراک پیدا کیا گیا ہے وہ خیالی اور غیر حقیقی ہے جس کے ذریعے بڑھتی ہوئی نسلی، طبقاتی اور سماجی کشیدگی بڑھی جو امریکہ سے مخصوص ہے۔ (۱۰) دوسری طرف ثقافتی مطالعہ کے نظریہ سازوں یا ان کے پیروکاروں نے خوشی خوشی سوچا کہ ان کو جو بنیادی بیانات اور کتابیں ملی ہیں اور جن پر انہوں نے کام بھی کیا ہے تو اس سے عملی سیاست میں ایک بڑی تبدیلی آ جائے گی اور ان کی کاوش سے یہ دنیا رہنے کے لیے بہتر جگہ بن جائے گی۔ (۱۱) ان کے مؤثر یا زیادہ استعمال کیے گئے الفاظ تھے، مزاحمت غیریت اور سپاہی یا ماتحت ان سب لفظوں سے ایک ہی مطلب ٹپکتا تھا کہ پچھڑے ہوئے اور گمنام لوگوں نے اپنی تاریخ بنانے کے لیے بڑی دلیرانہ جدوجہد کی ہے۔ جب ثقافتی مطالعہ بطور مضمون روشناس ہو گیا اس وقت امریکہ، وسطی امریکہ (جنوبی) میں قتل و غارت کر رہا تھا۔ جنوبی افریقہ میں یارجعت پسندوں یا نوآبادیات کے خلاف تحریک کی حمائت کر رہا تھا۔ افغانستان اور وسطی ایشیا میں عسکریت پسند اسلام کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا اور عراق کو ریزہ ریزہ کرنے کے لیے بمباری کر رہا تھا۔ جرائم کی اس فہرست میں بڑی آسانی کے ساتھ اضافہ ہوسکتا ہے۔ جبکہ دریں اثنا معاشی محاذ پر این اے ایف ٹی اے، ترقی پذیر ممالک میں ڈھانچے میں مطالبقت پیدا کر کے پروگرام، گاٹ اور اس کی جانشین عالمی تجارتی تنظیم (ڈبلیو ٹی او) (جس کو تسلیم کرنے کا مطلب ہے آزاد تجارت کو قبول کرنا) کے ذریعے پوری دنیا کو دھوکا اور فریب دیا جا رہا تھا۔ فلسفی پروفیسر تھامس نیگل نے تین دہائی پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ امریکہ ایک مجرمانہ جنگ میں مجرمانہ انداز میں حصہ لے رہا تھا جس کی وجہ سے پروفیسر کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ نظریاتی لحاظ سے جو کچھ ہو رہا ہے سب بے معنی ہے اور اس کی وجہ سے میرے اندر نظریاتی کام کی بے معنویت کے باعث بے چینی پیدا ہوگئی ہے۔'' امریکہ نے ویت نام میں جو جرم کیے ان کی وجہ سے غصے اور وحشت کا احساس پیدا ہوا جس کی وجہ سے فلسفے کے پروفیسروں کو عوامی مسائل پر بڑی سنجیدگی کے ساتھ اپنا پیشہ ورانہ کام کرنا پڑا۔ (۱۲) لیکن

1980 اور 1990 کی دہائیوں میں پوری دنیا میں آزاد دنیا کے صدور اور راہنماؤں نے جو دراصل ڈاکو تھے، دنیا میں امن و امان کی مہم شروع کی اور انہی دنوں امریکہ کے اندرونی شہروں کے اندر میدان جنگ کھل گئے۔ ان سے تعفن اٹھنے لگا اور انقلابی استادوں اور عالموں نے ثقافتی مطالعوں سے بڑی تسلی اور تشفی حاصل کی۔

امریکی یونیورسٹیوں اور اسی طرح برطانیہ اور آسٹریلیا کی یونیورسٹیوں میں بھی ثقافتی مطالعوں کے شعبے قائم ہوئے، اپنے اپنے انداز میں۔ اور جو موجود سے اختلاف رکھتے تھے... یا کم از کم اتنا مختلف تھے جتنا کہ یونیورسٹیوں کا جدید کلچر اس کی اجازت دیتا تھا وہ اختلاف کرتے رہے ثقافتی مطالعہ کی کسی نے بھی آج تک کوئی خاص حدود مقرر نہیں کیں اس لیے ثقافتی مطالعے کے دائرے مندرجہ ذیل شعبوں سے بھی آزادانہ ملا دیئے جاتے ہیں۔ مابعد نوآبادیات نظریہ، مابعد سٹرکچرل ازم (۱۳) حتیٰ کہ سائنسی مضامین جدید امریکی مطالعے (۱۴) نسلی مطالعے (۱۵) اور متعدد نئے موضوعات جو اب شعبے بن گئے ہیں۔ (ان میں عجائب نظریہ، یا ہم جنس پرست عورتوں اور مردوں کے مطالعے شامل نہیں) اس میں کوئی شک نہیں کہ پچھلے بیس برسوں میں روائتی مضامین اور شعبوں کے بارے میں نئے قسم کے سوالات پیدا ہوئے آوازیں اٹھیں اور ان کی تعبیر کے زیادہ طریقے رائج ہوئے۔ مثلاً متن کا مطالعہ ایک نئے ڈھنگ سے تا کہ ان کی کمیوں کو دیکھا جائے یا رنجیت گوہا کے الفاظ میں انسداد بغاوت کی نثر اس کے شقاق کے حوالے سے (۱۶) اور متن کے بارے میں اٹھنے والے بے شمار معاملات......تو ماننا پڑتا ہے کہ مضامین کا معاملہ اور آگے چلا گیا۔ اس نے ترقی کی ہے۔ میں نے بیان کیا تھا کہ کثرت الوجودیت کی ماحولیات بقا اور فروغ بہت ضروری ہے مگر امریکہ کے بڑھتے ہوئے غلبے' تیسری دنیا کے بڑے حصے کی غریبی، امریکہ میں آباد افریقی مردوں کی بڑھتی ہوئی قید اور اسیری، علمی سلسلوں کی عالمگیریت، ثقافتی رسم و رواج، کارپوریٹ کلچر اور اشیائے صارفین کے حوالے سے ثقافتی مطالعوں کی یکتائی کے سلسلے میں بھی کم کام ہوا۔ اگر ان یونیورسٹیوں کی نظر میں سب سے اعلیٰ مضمون ثقافتی مطالعہ ہے تو پھر علمی سیاست کی تطہیر یا نجات کے مضمون کے رائج ہونے کا تو بہت ہی کم امکان ہے۔ یونیورسٹیوں میں ایک مختلف یا اختلاف والے مستقبل کے بارے میں غور و فکر کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوسکتی۔ (۱۷)

محدود بازی: تہذیبوں کے ٹکراؤ کے یرغمالی

میں نے کتاب کا آغاز کیا تھا بالکل خیال آرائی سے اور خیال آرائی تھی کہ کس طرح زمرہ بندی یا کتاب یا علم کو حلقہ آداب میں لایا جائے۔ 1980 کی دہائی کی درمیانی مدت کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے۔ میں یونیورسٹی شکاگو میں گریجوایشن کا طالب علم تھا۔ رسالہ الٹرنیٹوز دیکھنے یونیورسٹی لائبریری میں گیا۔ مجھے دیکھ کر انتہائی تعجب اور پریشانی ہوئی کہ وہ رسالہ یونیورسٹی کے بزنس سکول کی لائبریری میں معاشیات اور آپریشن والے سیکشن میں دوسرے رسالوں کے ساتھ رکھ دیا گیا ہے۔ مجھے ہرگز یہ توقع نہ تھی کہ آلٹرنیٹوز جیسا رسالہ جس میں جدید معاشرتی خاکے اور مستقبل کے زمانے کے متبادل نقشے اور گہرائی اور گیرائی والے مضامین شائع ہوتے ہیں اور جس میں آج کی جنگ کے مختلف پہلوؤں، تشدد، سیاسی اور معاشی دباؤ اور اس قسم کے موضوعات پر خیال افروز تنقیدی تحریریں چھپتی ہیں اس رسالے کو معاشیات کے رسالوں کے ساتھ رکھ دیا جائے گا۔ اس بات پر سب کو اتفاق نہیں ہے کہ معاشیات ایک مایوس کن علم یا سائنس ہے۔ اس کے باوجود اس کے دعوے دوسری سماجی سائنسوں سے بھی زیادہ اور اس کے ماہر یا پیشہ ور خود کو تیزی سے ریاضی دان سمجھنے لگے ہیں۔ آلٹرنیٹوز کے نواح میں دوسرے شیلف پر پیش گوئی ''ٹیکنالوجیکل منصوبہ بندی' تزویراتی انتظامیہ کے بہت سے رسالے پڑے ہوئے ہیں گویا ہمیں مستقبل کا صرف وہی نقشہ دیکھنے کی اجازت ہے جو معیشت دانوں، انتظام کے ماہرین اور ٹیکنو کریٹس کے اس جتھے نے بنا رکھا ہے جو ہمیں ابھی تک ایک بہتر معاشرہ دینے میں بری طرح ناکام ہوا ہے۔ ان کی نظر میں انسانیت کو صرف ان کا بنایا نقشہ دیکھنے کی اجازت ہے۔ معیشت دان خود تو بڑے پھولے پھلے ہیں مگر ان کی تحویل میں جو معاشرے ترقی کرنے کے لیے دیئے گئے ان پر اتنا ہی زوال آیا جبکہ معاشی ماہرین کا قبیلہ بھی اپنے سرپرستوں کی طرح کبھی خوش' مطمئن اور خود کفیل نہیں رہا۔ ممکن ہے کہ جن یونیورسٹیوں کی لائبریریوں میں آلٹرنیٹوز کو ایک خاصہ جگہ رکھا گیا ہے وہ دراصل خانہ بندی کا حصہ ہے یا شائد کچھ بے خبر لائبریریز کی وجہ سے یہ غلط جگہ پر چلا گیا۔ یہی ایک طرح کا ہمدردانہ رویہ ہے اور اسی سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ میں نے ایک بار اشیس سندی کی کتاب دی ٹاؤ آف کرکٹ The Tao of

Cricket دیکھی اس میں کرکٹ کو کیسے نوآبادیاتی مردانگی کے کلچر اور وکٹورین زمانے کے انگلستان کے شوق و ذوق کا ایک مروج استعارہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب میں نے ایک سٹور میں دیکھی جہاں اس کے ساتھ موٹر ریس، باکسنگ اور فٹ بال کی کتابیں رکھی تھیں۔ تمام علمی نظاموں میں درجہ بندی ہوتی ہے ایک درجہ بندی سے دوسری درجہ بندی میں کچھ ایسا ہی اختلاف ہوتا ہے جسے ثقافت اور معاشرے کے بارے میں نقشوں میں فرق ہوتا ہے۔ درجہ بندی اور زمرہ بندی کے بارے میں میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ یہ کوئی چھوٹی باتیں نہیں ہیں۔ مثلاً اگر انگریز سکھوں کو ایک ''لڑا کا نسل'' (۱۸) نہ کہہ گئے ہوتے تو آزادی کے بعد ان کی تاریخ مختلف ہوتی۔ اگر گورکھا بھی اسی زمرے میں نہ شامل کیے گئے ہوتے تو وہ برطانوی سامراجیوں کے لیے غلیظ کام نہ کر رہے ہوتے۔ اسی طرح ایک دلیل پہلے دی گئی ہے کہ اگر بیسویں صدی میں ترقی کے نام پر ہونے والی ہلاکتوں، نسل کشی کا نشانہ بننے والے ملک میں ہونے والی اموات کو جمع کیا جائے تو بیسویں صدی سب سے قاتل صدی نکلے گی اور یہ تاریخ کے ایک عام قاری کو بھی اسی صورت (قاتل) میں نظر آئے گی۔ یہ درجہ بندی اور تقسیم ہی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم ہم ہیں اور دوسرے دوسرے ہیں۔ سرحدیں اس طرح کھینچی جاتی ہیں اور تمام ثقافتوں کے بارے میں ان کے تہذیب میں ہونے یا دائرہ تہذیب سے باہر ہونے کا حکم لگایا جاتا ہے۔

جو رسالہ غلط جگہ پر نہیں رکھا گیا اس کے بارے میں قصہ یہ ہے بلکہ ایک زیادہ افسوس ناک تنبیہ ہے کہ ایک یہ کہ جدید علمی سسٹم بڑا جابرانہ ہے دوسرا اسی انداز میں ہمارا مستقبل بھی غلام (نوآبادیاتی) بنالیا گیا ہے۔ یہ الفاظ پاکستانی دانش ور، ضیاء الدین سردار کے ہیں (۱۹) ماضی بعید میں مستقبل کے نجومیوں، پیش گوئی کرنے والوں، دست شناسوں اور بہت سی جادو کی صورتوں، قسمت کا حال بتانے والوں اور بد دعاؤں کا شعبہ تھا۔ ہر داستان گو مستقبل نما بھی تھا کیونکہ کہانیاں (جو اکثر ماضی میں پیوست ہوتی ہیں) مستقبل کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں۔ داستان یا کہانی سننا سنانا بچوں کے حوالے سے ایک موضوع ہے۔ کہانیوں کا تعلق اس لیے بچوں سے ہے کہ ان کے بارے میں اکثر کہا جاتا ہے کہ مجرد باتیں ان کی سمجھ میں نہیں آتیں اس لیے وہ زیادہ ٹھوس تفاصیل میں کھو جاتے ہیں۔ ہر کسی کو خبر ہے کہ ان کہانیوں کے ذریعے اخلاقی سبق سکھائے جاتے ہیں مگر اہم بات یہ بھی ہے کہ

ہم کہانیوں کے ذریعے اپنے خیالات، اپنی امیدیں اپنے مستقبل کے نقشے بچوں تک منتقل کرتے ہیں۔ بچوں کے بغیر مستقبل کا کوئی مفہوم نہیں اور ہم مستقبل کی سرمایہ کاری ان میں کرتے ہیں۔ پرانے یونانی جانتے تھے کہ کوئی جہاں چاہے جائے اس سے فرق نہیں پڑتا کیونکہ آخر وہ ایک کہانی لائے گا۔ اور یہ کوئی حادثہ نہیں کہ ہومر کے بعد کے زمانے میں سب سے بڑا نیم صنمیاتی قسم کا داستان گو ہیروڈوٹس تھا۔ تاہم اگر ایک غیر مذہبی بلکہ کافرانہ انداز سے دیکھیں تو یونانی تہذیب پر اس وقت زوال آنا شروع ہوا جب تھسیڈائیڈس نے تاریخی ریکارڈ درست کرنے کا آغاز کیا۔ اس نے ہیروڈوٹس کی تخیلاتی جولانیوں کو زیر کرنا شروع کر دیا۔ یعنی تاریخ کو بزعم خود حقائق کے مطابق لکھنا شروع کیا۔ ہیروڈوٹس نے دوسرے ملکوں کے بارے میں انتہائی پست درجے کی تفصیل لکھی۔ اس بے بنیاد تفصیل کو یورپ نے محض اس لیے اپنے ادب کا بہت بڑا حصہ بنایا کہ اس طرح دوسری تہذیبیں گھٹیا درجے کی ثابت ہوتی ہیں اور ان لوگوں کے بارے میں اس نکتہ نظر کو تقویت ملتی کہ یہ لوگ وحشی قسم کے ہیں اور ابھی قدامت کے زمرے میں آتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہیروڈوٹس کی تحریریں متعلقہ شعبہ کا بھی حصہ بننے کے اہل قرار دی گئیں۔ ہیروڈوٹس نے شمالی افریقہ کے لوگوں کے بارے میں لکھا کہ وہاں ایسے لوگ رہتے ہیں جن کے سر نہیں ہوتے یا ان کے سر کتوں والے ہوتے ہیں اور ان کی آنکھیں ان کے سینوں میں ہوتی ہیں۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ کالے لوگوں کا نطفہ کالا ہوتا ہے۔ چنانچہ یورپ نے دوسرے لوگوں یعنی غیروں کے بارے میں ہیروڈوٹس کی یہ باتیں مستند اور سچ مان لیں۔ (۲۰) دوسری طرف تھسیڈائڈس کی اصولی سیاست سے اندھی وابستگی کے باعث جذباتیت کو مسترد کرنے کے عمل کو مستقبل کے لیے ایک زیادہ قابل اعتماد اشارہ سمجھا گیا اسے طاقت کے استعمال کے حوالے سے بھی قبول کیا گیا۔ یورپی تہذیب کی خواہش ہے کہ وہ ان بیانات (لٹریچر) کو زیادہ سے زیادہ سائنسی بنائے جس کا واضح نتیجہ یہ بھی ہے کہ اس کی کہانی کہنے کی صلاحیت بتدریج کم ہو رہی ہے۔ ان دو باتوں کی بھی ایک لمبی تاریخ ہے۔

مستقبل کے بارے میں نچلی سطح پر نجومی اور دست شناس ماہر مانے جاتے تھے بلکہ بلند سطح پر یہی کام خوابوں میں رہنے والے دانشوروں اور پیغمبروں نے سنبھال لیا۔ خیالی دنیا میں رہنے والے دانشوروں نے اپنی اپنی خوابوں کی جنت مستقبل میں نہیں ماضی میں بسائی

جسے وہ ایسا سنہری زمانہ قرار دیتے تھے کہ جس میں امن وامان بھی تھا اور جب انصاف کا اتنا آسانی سے مذاق نہیں اڑایا جاتا تھا یعنی انصاف عام تھا۔ ایچ جی ویلز' یوجین زامیاتین، آلڈس ہکسلے، جارج آرویل اور ان سے کم تر متعدد لکھنے والوں نے بیسویں صدی میں بھی خواب کی دنیا کی روائت جاری رکھی۔ پھر اس میں اچانک شدید کمی آئی اور خوابی دنیا یعنی یوٹوپیا کا معاملہ سائنسی افسانہ لکھنے والوں اور ان کے مداحین کے حوالے کر دیا گیا، ان کے مداحین یہ بات کرنے پر تلے ہوئے ہیں کہ امریکہ کے پاس مریخ جیسے سیاروں میں بسنے والوں کے بارے میں علم ہے مگر وہ اسے بالارادہ خفیہ رکھ رہا ہے۔ امریکہ ایک ایسا ملک ہے جس کی بنیاد ہی مستقبل پر پڑی ہوئی ہے۔ جہاں ماضی کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ اس لیے وہاں ریکارڈ قائم کرنے والے امریکیوں کو ایک دم تاریخی بنا دیا جاتا ہے۔ حالانکہ ریکارڈ تو زیادہ دیر قائم نہیں رہتے۔ پیش گوئی کی روایت کو تو زیادہ مؤثر طریقے سے حدود باہر کر دیا گیا ہے کیونکہ ایک طرف تاریخ کا غلبہ ہے اور دوسری طرف یہ کہا گیا کہ یہ دراصل باقیات ہے قرون وسطیٰ کی ادہام پرستی کی اور الکیمیا اور کالے جادو کی یادگار۔ انگریزی بولنے والے مغرب میں (شاعر) بلیک پیغمبروں کے سلسلے کی آخری کڑی لگتا ہے گو سارا مغرب ہی پیغمبری انداز سے ناآشنا رہا۔ وجہ یہی نہیں کہ فصاحت و بلاغت ختم ہوگئی بلکہ یہ بھی کہ دیہی علاقوں میں بڑی تبدیلی آئی، چھپے لفظ یعنی پریس کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوئی، یادداشت پر بھروسہ کی روائت گھٹ گئی اور کلاسیکل قسم کے سفر اور سفر نامے غائب ہوگئے۔ ہوسکتا ہے کہ مارکس کو اور فرائڈ کو اپنے استحقاق کی بنا پر پیغمبر سمجھا جائے مگر وہ بذات خود ایسی عملی صورتوں کی تخلیق ہیں جن میں اختلاف صرف انہی کے محاورہ اور زبان میں ممکن تھا کسی دوسری زبان یا پیرائے میں ناممکن تھا۔ اس طرح کسی ایسی تنقید کو قبول نہیں کیا جاتا جو تاریخ پر مبنی نہ ہو اور اگر اٹھایا گیا معاملہ غیر تاریخی ہو تو پھر اٹھانے والے کے بارے میں یہی کہا جائے گا کہ وہ عہد قدیم کی باقیات ہے جو وقت کی منجمد ڈیوڑھی میں اب تک سبزی خور گردہ کے ساتھ رہ رہا ہے۔

بہت سے لوگوں کے لیے یقیناً یہ حیرت کی بات ہے کہ مستقبل پھر سامنے آ رہا ہے۔ عوامی سطح خصوصاً امریکہ میں عوامی سطح پر مستقبل کا حوالہ سیاستدانوں کے پند و نصائح میں ملتا ہے، ان ہدایات میں ملتا ہے جو وہ ہمیں دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ہمارے بچوں کے

بچوں کے لیے کیا شے اچھی ہے۔ دراصل اس طرح وہ ہمارے بچوں اور پھر ان کے بچوں کے لیے ایک تابناک مستقبل کا یقین دلاتے ہیں جو حیاتیاتی ہتھیاروں، زہریلی گیسوں سے آزاد ہو حالانکہ یہی ہتھیار اور گیس کلنٹن نے عراق میں کارپٹ (فرشی) بمباری میں استعمال کی۔ اور کلنٹن کے جانشین نے اس کی تصدیق کی کہ ہمارے بچوں کا مستقبل آزاد اور تشدد سے پاک ہونا چاہیے جس طرح نوآبادیات کے زمانے میں انگریز خواتین کی عزت کی خاطر ان کے مردوں کو دنیا میں قتل عام کرنے کا حق حاصل ہو گیا تھا بالکل اسی طرح "ہمارے بچوں کا مستقبل" کے نعرے کے ذریعے، اختلاف یا مشکلات پیدا کرنے والی (۲۲) دنیا کو پابند کرنے کے لیے اس پر پابندیاں لگانے کا لائسنس حاصل ہو گیا ہے۔
بہر طور اب امریکہ میں یہ رجحان ہے کہ مستقبل سازی کا کام پالیسی سازوں، انتظام کے ماہرین، ٹیکنوکریٹس اور کمپیوٹر کے احمقوں کو دے دیا جائے اور دنیا بھر میں مستقبل کے مسئلے پر تقلید امریکہ کی ہی کی جا رہی ہے۔ اس نقشے میں ہمیں سوچنے سمجھنے کا زیادہ تردد نہیں کرنا پڑے گا کہ ہم سب دنیا کی بڑی ویب اور انٹرنیٹ کے ذریعے جڑے رہیں گے۔ ہمیں یہ یقین دلایا جا رہا ہے کہ ٹیبل ٹاک اور باہمی قابل فہم گفتگو کی جگہ چیٹ اور روم اور سائبر کیفے لے لیں گے اور برادریوں کی یہ تقسیم قومی ریاست کی موت کا نقارہ ثابت ہو گی۔ (۲۳)
یہ درست کہ ہم ایک دوسرے سے مسلسل رابطے میں آ جائیں گے کہ ٹیلی گراف (تار) کی ایجاد پر تھوریو نے تبصرہ کیا تھا کہ کیا ہمارے پاس ایک دوسرے سے بات کرنے کے لیے کچھ رہ بھی جائے گا کہ نہیں؟۔ ای ایم فارسٹر نے نوآبادیات کی ناکامیوں کا مقدس حل یہ بتایا تھا کہ مشرق اور مغرب کو قریب لایا جائے۔ "صرف ان کو جوڑو" (۲۴) فاسٹر نے تو اس پاگل پن کو بھی خدائی دین بنا دیا کہ مرد ہی عورتوں اور بچوں کی عزت و حرمت کی حفاظت کرنے کے اہل ہیں۔ لیکن رابطے اور جوڑ کی جدید صورت دراصل برادری کے ایک خاص طرزِ احساس کی صورت گری ہے جو اب ہمیشہ کے لیے کم ہو چکی ہے۔ رابطے اور جوڑ کی اس ذرا نرم سی صورت کے باعث دنیا زیادہ کثرت الوجودی' زیادہ ٹھوس اور مضبوط ہو جائے گی اور اس علم کے غالب زمروں اور ثقافتی تنوع میں یکسانیت نفوذ پذیر نہیں ہو گی۔ اگر ہم دوغلے پن کی سیاسی معاشیات پر زیادہ متوجہ ہوتے تو ہم بہت جلد یہ بات مان لیتے کہ بین الثقافت نے ہمیشہ انتہائی ناقص اور پر پیچ حالات میں فروغ پایا ہے۔ مثلاً کثرت

اور تنوع کے خاتمے اور ثقافتی یکتائی میں۔ یقیناً ہم رابطے میں تو آ گئے ہیں مگر مغرب کے غالب کلچر کے دھاگوں اور لائف لائنز کے واسطے سے، یہی کچھ مغرب نے تہہ کر کے دوسروں کی تلی پر رکھا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر مستقبل کو ٹیکنیکل منصوبہ سازوں اور کمپیوٹر کے ماہرین پر چھوڑ دیا جائے تو ہمیں نتائج وہی حاصل ہوں گے جو نیوٹران بم کے خالقوں نے سوچ رکھے ہیں۔ یہ بم زندگی کے تو تمام آثار مٹا دیتا ہے مگر عمارتوں کو صحیح وسلامت رہنے دیتا ہے۔ انسان ایک ناقابل اعتبار جانور ہے۔ اس لیے مستقبل کے بہت سے منصوبہ ساز' حضرت انسان کو ہی ایک بے خطا خاکہ تیار کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ اب یہ دعویٰ (بلا شرکتے نہیں) کر دیا گیا ہے کہ آدمی نے قدرت، عورت اور بچوں پر حاکمیت قائم کر لی ہے اس لیے یورپی اخلاق کی روح یہ ہے کہ ہمت کرو اور مستقبل پر بھی حاکمیت حاصل کر لو اور یہ بہت ضروری ہے۔ چنانچہ ہر دوسری شے کی طرح اب مستقبل بھی مطالعہ کا ایک موضوع یا شعبہ بن گیا ہے۔ اگرچہ مستقبل کے مطالعہ کا روائتی عملی شعبہ جات سے بالکل واجبی سا تعلق ہے تاہم دیکھنا یہ ہے کہ اس مطالعے کے رنگ ڈھنگ کیسے ہیں۔ مستقبلیوں کی اپنی جماعتیں اور تنظیمیں ہیں ان کے سالانہ اجتماع ہوتے ہیں۔ ان کے اپنے تحقیقی اور مواصلاتی ادارے اور وسیلے ہیں۔ ان کا پھیلاؤ ساری دنیا خصوصاً ترقی یافتہ مغربی اقوام تک جہاں بعض یونیورسٹیوں میں مستقبل کے مطالعہ کے لیے شعبے بھی قائم ہو چکے ہیں۔ (۲۵)

اگرچہ بعض شعبوں میں مستقبلیات کو ابھی علمی مرتبہ حاصل کرنا ہے کیونکہ وہاں اس علم کو فی الحال ستارہ شناسی، علم الاعداد، دست شناسی اور دوسرے ادہام سے وابستہ کیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود مستقبل کا مطالعہ ایک بڑا کاروبار بنتا نظر آ رہا ہے۔ اب جبکہ باقی دنیا نے تندی کی اخلاقیات کو قبول کر لیا ہے اور ملکوں نے آئی ایم ایف (بین الاقوامی مالیاتی ادارہ) کی طرف سے ترتیب نو کے فیصلوں کو مان لیا ہے، تو جو صورتیں مغربی ممالک میں عروج پر ہیں ان صورتوں نے ترقی پذیر ممالک کا بھی رخ کر لیا ہے۔ ہندوستان جسے ملک میں کوئی دو دہائی قبل تجارت سکھانے کے سکولوں کا قیام عجیب سا لگتا تھا اور جہاں تجارت کی کوئی زیادہ قدر ومنزلت نہ تھی، اب اسی ہندوستان ہی میں سب سے اعلےٰ ڈگری ایم بی

اے (ماسٹر آف بزنس ایڈمنسٹریشن) کی مانی جاتی ہے۔ اب اسی ملک میں سوٹ بوٹ میں ملبوس مالی منصوبہ ساز، مشیرِ انتظامیہ کے ماہرین اور کمپیوٹر کے ماہرین نے اپنے سارے ہتھیاروں کا استعمال مغرب سے سیکھا ہے۔ (یہ دراصل ایک پرانی رسم کی نئی صورت ہے، وشوا کرما پوجا کہا جاتا تھا اور یہ ہندوؤں کی مذہبی رسم تھی جس میں ان ہتھیاروں کی پوجا کی جاتی تھی جو خدا (خالق) نے دنیا بناتے وقت استعمال کیے تھے) یہ ماہرین اس ہوٹل لابی کلچر میں شریک ہوتے ہیں جس کا ذکر جیمز کلفورڈ نے کیا ہے۔ یہ اپنے سیمیناروں اور لنچ پارٹیوں میں ہندوستان (اور پوری تیسری دنیا) کے لیے اسی قسم کا مستقبل بنانے کی سازش کرتے ہیں جو آج اہل مغرب کا (حال) ہے۔ اگر ہم پیش گوئی کرنے والوں، منصوبہ سازوں اور ٹیکنوکریٹ ماہرین پر یقین کرلیں تو پھر غیر مغربی دنیا کے بہت بڑے حصے کا کوئی مستقبل ہے ہی نہیں۔ اس دنیا کو دوسروں کی زندگی گزارنی ہوگی، دوسروں کے خواب دیکھنے ہوں گے، کسی اور کی کھال میں رہنا ہوگا اور کسی دوسرے کا سامان تجارت بننا ہوگا۔

جہاں تک مستقبل کا تعلق ہے بندہ بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کرسکتا ہے کہ یہ بھی دراصل کاروبار کی ایک صورت ہے۔ بہت ہی قلیل وقت کے لیے احساس ہوا تھا کہ سوویت یونین اور مشرقی یورپ میں کمیونزم کے خاتمے کے بعد یہ کاروبار بھی ختم ہو جائے گا۔ علم البشریات، علم الشرقیات اور تاریخی مطالعے کو مغرب نے دنیا کو نوآبادیات بنانے میں کٹھ پتلی کی طرح استعمال کیا مگر اب ان تینوں علوم کی افادیت ختم ہوچکی ہے اس طرح یہ شعبے ختم ہو جانے چاہئیں۔ دوسرے شعبے مثلاً سیاسیات کو سرد جنگ کے دوران فروغ حاصل ہوا اور اس کے فعال لوگ اب بھی بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں جو امریکہ کی صارفی خواہشوں، سیاسی مفاد پرستی اور کمیونزم کے خلاف جنگ میں پیادہ سپاہیوں کی طرح خدمات سرانجام دیتے رہے۔ چنانچہ اگر ایسا نہ ہوا ہوتا جیسا ہوگیا تو یہ شعبہ بھی ختم ہو چکا ہوتا۔ کوئی اور مخلوق ان جیسی نہیں ہے۔ بجز اس کے جو اپنی ہی جنس کی تباہی پر تلی رہی ہو (اس کے علاوہ چند ایک وہ مخلوقات جنہیں اپنی بقا کا اختیار نہیں دیا گیا اور ان کی بقا نسل انسانی ہی کی مرہون منت ہے) مزید یہ کہ اگر مغرب کے آدمی کو اسباب کی از سر نو ترتیب دینے کی توفیق نہ ہوتی تو اس کا علم محدود ہوتا۔ جیسا کہ میں پچھلے باب میں کہہ چکا ہوں کہ ان تمام قابل اعتراض شعبوں نے ایک عرصے سے دوبارہ جنم لیا اور پھر لازمۂ حیات بن گئے۔ علوم

شرقیہ کی مثال لیں اس کو نئی شکل دی گئی اور علاقے کے مطالعے (ایریا سٹڈی) کا نام دیا گیا۔ یہ شعبہ قومی سلامتی کے لیے (۲۶) بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس شعبہ میں نسلی گروپوں اور اقلیتوں کے کئی طرح کے مطالعے بھی شامل ہو گئے۔ یہ اپنی کایا پلٹنے کی نئی صورت ہے دوسروں سے واقفیت پیدا کرنا' بہت سے کھانوں کے نمونے بنانا اور عالمی موسیقی کی ایک لائبریری بنانا ایک ایسا عمل ہے جس کو مغرب والے بین الثقافتی مظہر سمجھتے ہیں۔ اور سمجھا جاتا ہے کہ یہ عمل دراصل مغرب کی علم کی پیاس اور جستجو کی صلاحیت رکھنے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مگر اس کا نام نہاد امریکی ذہن کے کھلے ہونے یا بند ہونے سے کوئی تعلق نہیں (۲۷)

تو پھر اب سیاسی امور کے امریکی سائنسدانوں کا کیا کریں جو امریکی تعلیمی اداروں میں ملازم ہیں اور جو بڑی بے حیائی کے ساتھ خارجہ پالیسی اور دفاع کے امور پر موج اڑاتے رہے ہیں۔ یا ان معاشی ماہرین کا کیا کہنا جن کی تعریفیں لاطینی امریکہ اور ایشیا کی آمرانہ حکومتیں کرتی رہیں؟ دانایانِ معاشیات کی بلی کی طرح کئی زندگیاں ہوتی ہیں جب سابق روسی بلاک نے یورپ امریکہ کے حریص کارپوریٹ والوں کے لیے اپنے دروازے وا کر دیئے تو ان معاشی ماہرین کو وہاں نئے گاہک مل گئے۔ ایشیا میں جن ممالک کی معیشت شیر کی طرح جوان ہوئی تھی اس میں کمزوری اور بڑھاپے کے آثار نظر آنے لگے۔ کہا گیا ان کا انتظام خراب ہو گیا ہے مغربی معاشی ماہرین نے کہا کہ مشرقی معاشی شیر والے ملک ایک نادیدہ ہاتھ کو نہ دیکھ سکتے ہیں نہ اس کی کارستانیوں کو سمجھ سکتے ہیں۔ امریکہ کے سرمایہ دار ایک بار امریکی خواب کی پائیداری کا مظہر بن کر ابھر سکتے ہیں۔ دولت کے لحاظ سے فرش سے عرش تک پہنچنے کے واقعات کا احیا کر دیا گیا۔ تاہم جو کنگال سے کروڑ پتی بننے کے قصے ہیں صرف امریکیوں کے ہی نہیں اس کی دوسرے ملکوں میں بھی بہت مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً ہندوستان میں ایک دلت (اچھوت) کا صدر بن جانا یا حال ہی میں ایک معمولی کسان کا وزیراعظم بن جانا۔ معیشت دان کو آج تک ایسا کھلا میدان نہیں ملا جیسا اب ملا ہے اور طفیل اس کے کہ ساری ترقی پذیر دنیا معاشی آزادہ روی اور نج کاری پر تل گئی ہے اور یونیورسٹی کے معیشت دان کو بڑی آسانی سے کارپوریٹ کا معیشت دان بنا دیا جاتا ہے۔

دنیا میں اس طرح فاصلے سکڑنے کے باعث کہا جاتا ہے کہ دنیا ایک عالمی گاؤں بن

جائے گی اور یہ بات سرمایہ داروں اور معیشت دانوں دونوں کو بڑی بھلی لگتی ہے' کانوں میں رس گھولتی ہے۔ عالمگیریت کا مطلب ہے ترقی پذیر ممالک کو پھر نوآبادیات بنانا۔ بعض نوآبادیات اُس زمانے میں بھی یورپی طاقتوں کے لیے کوئی زیادہ مالی منافع بخش نہ تھیں۔ مگر اب اُس زمانے کی نامکمل نوآبادیات اب مکمل نوآبادیات ہوں گی۔ اس زمانے میں طاقت کا انحصار بڑے ننگے انداز میں کیا جاتا تھا۔ میدان جنگ میں میکسم توپوں کے ذریعے فتح حاصل کی جاتی تھی، دیہات کو بے رحمی سے گولوں کا نشانہ بنایا جاتا تھا اس کے بعد غلبہ حاصل ہوتا تھا مگر اب کے غلبے کی صورت میکڈونلڈ اور کوکا کولا کی شیرینی کے ذریعے ہوگی یعنی میٹھی موت۔ میکڈونلڈ والوں نے تو دنیا کو یقین دلا دیا ہے کہ وہ بین المللی (ملٹی نیشنل) نہیں ہے بلکہ بین الثقافتی کارپوریشن ہے۔ ہندوستان میں اس کے برگروں میں گائے بھینس کا گوشت نہیں ڈالا جاتا۔ اسرائیل میں بگ میک پنیر کے بغیر ہوتے ہیں یعنی ان ملکوں کے کھانے کے قوانین کے مطابق بیف اور پنیر کو قلم زد کر دیا جاتا ہے۔ پیرس میں میکڈونلڈز کے مینو میں وائن (شراب) کا بھی اندراج ہوتا ہے مگر بچوں کا خیال کرنے والے امریکہ میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا (۲۸) کون کہہ سکتا ہے کہ میکڈونلڈ زحساس' گرم جوش بلکہ مقامی روایات کے پاسدار نہیں؟ گائیوں کو ذبح کرنے سے پہلے موٹا تازہ کرنا ضروری ہے۔"

مگر عالمگیریت کا خاتمہ یہاں تو ہرگز نہیں ہوتا۔ اگرچہ عالمگیریت کے زیر سایہ مستقبل کی صورت ایسی لگتی ہے کہ ثقافتی انتخاب یا آپریشن کے مواقع کم ہو جائیں گے۔ پولنگ سٹیشنوں پر جمہوری رائے شماری تقریباً بے معنی ہو جائے گی۔ تیسری دنیا بدحال ہوتی جائے گی اور جن لوگوں کو دوسرے یا غیر کے بارے میں زیادہ شعور نہیں ان کے دل و دماغ میں مغربی ذہنیت رس بس جائے گی اور جن کی ان سے نہیں بنے گی وہ تشدد پر اتر آئیں گے۔ تاہم سب سے زیادہ نقصان کا خدشہ اور جس کی خاطر یہ کتاب لکھی جا رہی ہے وہ ہے خود علم کا مستقبل۔ بہر طور مباحثہ زیادہ تر ثقافتی حوالوں سے ہوتا ہے۔ چند سال بیشتر سیاسیات کے سائنٹیسٹ سیموئیل ہنٹنگٹن نے یہ بات کہی تھی کہ مستقبل میں لڑائیاں تہذیبوں کے درمیان فالٹ لائن پر ہوں گی۔ اس کے خیال میں مستقبل میں سب سے بڑی لڑائی میں ایک طرف مغربی تہذیب فریق ہوگی اور دوسری طرف چینی قوم پرست اور

مسلمان جنوبی متحد ہو کر یا الگ الگ۔ (۲۹) یہ بدیہی بات ہے کہ مغربی تہذیب کو فرض کیا جاتا ہے کہ وہ فطری طور پر ذوالحال ہیں۔ یعنی یورپ اور تہذیب دوش بدوش بالازم وملزوم ہیں جیسے ایک مسلمان اور ایک جنوبی کے بارے میں تصور کیا جاتا ہے کہ دونوں ذوالحال ہیں یعنی اس اتحاد پر خوش ہیں۔ لیکن شائد ہمیں مغربی اور جنوبی کو ذوالحال (ایک ہی حال میں) رکھنا چاہیے اور پھر دونوں کو مسلم تہذیب کے مقابلے پر) اگر ہنٹنگٹن یہ تھیسس پیش کرتا ہے تو یہ ہرگز حیرت کا سبب نہیں ہے کیونکہ یہ وہ شخص ہے جس نے ویت نام میں امریکہ کی جنگ کی پرزور حمایت کی اور پھر یہ مشورہ دیتا رہا کہ ویت نام پر ایٹم بم گرا دینا چاہیے (۳۰) ہنٹنگٹن سرد جنگ کا زبردست حامی اور نظریہ باز بن گیا پھر اس کے بعد اس کی ضرورت بطور کرائے کے سپاہی کے بڑی بڑھ گئی وہ اسی قسم کی سفارشات آمرانہ حکومتوں سے کرتا رہا کہ کس طرح وہ مزید آمرانہ خواص پیدا کر سکتی ہیں اور کس طرح وہ جمہوریت کے مستقبل کے لیے (کیل کانٹے سے) لیس ہو سکتی ہے۔ سرد جنگ ختم ہوئی تو اسے خدشہ ہوا کہ اس کا کاروبار ہی ٹھپ نہ ہو جائے اور اس کے پاس صرف ہارورڈ کی ایک اسامی رہ جائے۔ اس لیے ہنٹنگٹن کو اپنا آپ نئے سرے سے دریافت کرنا پڑا اور نئی ہزاری قریب آ رہی تھی اس لیے اس نے ایک خاص انداز سے خود کو دریافت کیا۔ چنانچہ اس نے سپنگلر کے فلسفے کے مطابق مستقبل کی تصویر کھینچی۔

ہنٹنگٹن کا تھیسس بڑا سادہ سا ہے۔ ماضی میں عالمی کشمکش اور ٹکراؤ زیادہ تر سیاسی اور معاشی نوعیت کے ہوتے تھے لیکن نیا تنازع زیادہ تر ثقافتی ہوگا۔ اس نے سات تہذیبوں کا نام لیا مغربی، کنفیوشئنس، جاپانی، اسلامی، ہندو، سلیوک آرتھوڈاکس، لاطینی امریکی اور ممکنہ حد تک افریقی۔ ان کی ترتیب کے بارے میں بندے کو شک گزرتا ہے کہ نہ جانے کس حساب سے یہ ترتیب دی گئی ہے۔ ہنٹنگٹن کا خیال ہے کہ لازمی امر ہے کہ یہ تہذیبیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں گی۔ مغربی تہذیب کے عناصر فردیت پسندی، آزادی، دستوریت، انسانی حقوق، مساوات، شخصی آزادی، قانون کی حکمرانی، جمہوریت، آزاد منڈی اور ریاست اور مذہب کی علیحدگی، دوسری تہذیبوں میں ان عناصر کی صرف ذرہ بھر گنجائش ہے۔ یہ اختلافات صدیوں پر پھیلے ہوئے ہیں اور موجود رہیں گے۔ سیاسی حکومتوں اور سیاسی نظریات کے اختلاف سے بھی زیادہ سخت اور طویل المعیاد یہ اختلافات ہوں

گے۔ بہت سے ترقی یافتہ ممالک جدید بھی ہو چکے ہیں وہ ایسی ٹیکنالوجی اور انتظام سے کام لے کر اپنے لوگوں کا معیار زندگی بڑھا بھی لیں، اور عالمی منڈی میں مقابلہ بھی کر سکیں گے مگر وہ مغربی رنگ نہیں اختیار کر سکیں گے اور یہ توقع کم ہی کرنا چاہیے کہ وہ سمجھوتے کر لیں گے مثلاً ان کی روحِ اجتماعیت (جیسے چین اور جاپان میں ہے) اور مغربی نفس میں پیوستہ فردیت پسندی میں قربت اور صلح ناممکن ہے۔ ہنٹنگٹن بدیہی طور پر یہ سمجھتا ہے کہ یہ مبینہ اختلافات، کشمکش اور جھگڑوں کی بنیاد بنیں گے اور جیسے جیسے علاقائی معاشی، معاملات سر اٹھائیں گے۔ یہ تنازعے بڑھتے جائیں گے۔ دوسرے لفظوں میں ان میں سے بہت سی تہذیبوں نے یا تو اپنے اپنے تجارتی بلاک بنا لیے ہیں یا بنا رہی ہیں اور دنیا میں دوسرے بلاکوں کے اندر اتنی تجارت نہیں بڑھ رہی جتنی ان الگ بلاکوں کے اندر بڑھ رہی ہے، پھر غیر متوقع طور پر ہنٹنگٹن اپنے تھیسس کو دہراتا ہے کہ یہ عالمی کشمکش معاشی مسابقت پر ہوگی جیسے دنیا کو علم نہیں کہ مستقبل کے بارے میں باتیں کرنے والے بے شمار لوگ یہ بات بہت عرصہ پہلے واضح کر چکے ہیں (آدمی کو بعض پیش گوئیوں میں یہ خواہش بھی نظر آتی ہے کہ تجارتی جنگوں سے کچھ زیادہ ٹھوس قسم کے نتائج برآمد ہوں، لڑائی مغرب کے فائدے میں رہی ہے۔ اس صدی (بیسویں صدی) کے نصف میں جرمنی کی ایک نادر مثال ہے کہ وہ قوم جنگی بنیاد پر مستحکم کی گئی اور یہی فوجی اور صنعتی کامپلیکس ہے جس نے ہمارے زمانے میں امریکہ کو ایک بڑی طاقت بنا دیا ہے) (۳۱) ہنٹنگٹن کا مؤقف یہ ہے کہ مغرب کی طرف سے کوشش ہوتی ہے کہ اپنی اقدار غیر مغربی تہذیبوں پر لاگو کرے تو اس کی مزاحمت اور مقابلہ کیا جانا ہے۔ کیونکہ غیر مغربی تہذیبیں صرف جامد اشیا نہیں بلکہ تاریخ کو حرکت دیتی ہیں اور تاریخ کی صورت گری بھی کرتی ہیں۔ اس لیے ان سے متشددانہ مزاحمت ہی کی توقع ہو سکتی ہے۔ یہ تہذیبوں کا ٹکراؤ عالمگیر سیاست پر غالب ہوگا اور مستقبل کی صورت گری کرے گا۔

ہنٹنگٹن کا خیال ہے کہ دنیا میں اس قسم کے تہذیبی ٹکراؤ ہو رہے ہیں مگر اس کے تھیسس کا نشانہ یا نتیجہ یہ ہے کہ مغرب کی خود اپنے اندر کشمکش کی توقع کرنی چاہیے اور ساتھ ساتھ دو اور فریقوں یعنی چین اور مسلم دنیا سے بھی۔ چین اور مسلم دنیا میں مغرب کے اثرات کے خلاف مسلسل مزاحمت کرنے کی صلاحیت ہے۔ اسلام کا رویہ ان سب معاملات

کے بارے میں بڑا جارحانہ ہے جن سے مغرب زندگی پاتا ہے، ہنٹنگٹن سے پہلے اس کے ایک ساتھی اور مشرقی علوم کے ماہر برنارڈ لیوی نے بھی اس بارے میں لکھا ہے گو وہ مشہور کم ہے۔ اس کی تحریر کے حوالے سے وہ بھی یقین کر لیتا ہے کہ مسلمان نہ تو ریاست اور نہ مذہب کو الگ الگ کر سکتے ہیں نہ ہی کافروں کے سامنے جھکیں گے۔ بات یہ نہیں کہ سامراج اور غلبہ بذات خود مسلمانوں کے لیے ناقابل قبول ہے بلکہ لیوی کے الفاظ میں ''مسلمانوں کے لیے ایک ناقابل قبول برائی یہ ہے کہ وہ ایمان والوں پر کافروں کے غلبے کو نہیں مانتے'' (۳۲) ہنٹنگٹن کا نسخہ ہے ''اسلام کی سرحدیں خونیں ہیں'' مسلمانوں کے غصے کی بنیاد ہے اس کی تمنا ہے جو ناکام بنادی گئی ہے دوسرے اسلام پر عیسائیت کی بالادستی ہے وہ اس بالادستی کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف چین میں ایک نخوت پائی جاتی ہے اور وہ خودنگر بھی ہے۔ اب چین بحرالکاہل پر اپنی بالادستی قائم کرنے کے لیے تیار ہے۔ چین میں صدیوں سے آمرانہ حکومتوں نے لوگوں کے حقوق دبائے ہیں اور اب وہ مغربی جمہوریتوں کو قابل نفرت دشمن سمجھتا ہے۔

بات واضح ہے کہ ہنٹنگٹن قومی ریاست اور تہذیب کے درمیان ابتدائی اور بنیادی فرق کو نہیں سمجھ سکا نہ ہی ان نتائج کا اندازہ کر سکتا ہے جو سیاست میں کچھ اور عناصر داخل کرنے سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ کشمیر کا تنازعہ برصغیر میں تاریخی ہندو مسلمان تصادم کی باقیات بن جاتا ہے اور چونکہ ''ہندو'' اور ''مسلم'' دو تہذیبیں ہیں اس لیے قومی ریاستوں میں کشمکش ہے اور یہ قومی ریاستیں ایک نوآبادیاتی طاقت کے نافذ کردہ جابرانہ سیاسی نظام کے تحت اپنی اپنی شناخت کی تجسیم کے حوالے سے وجود میں آئی تھیں اور یہی تہذیبوں کے درمیان تنازع ہے۔ دیکھئے برصغیر ہندوستان میں اسلام اور ہندومت کے درمیان کون سا ''تاریخی'' تصادم ہوا، کیا یہ تاریخ ہمیں 1947 تک پیچھے لے جاتی ہے، یا انیسویں صدی کے شروع میں جب مورخ گیان پانڈے کے الفاظ میں ''فرقہ ورانہ فسادات کی تحریروں'' کا آغاز ہوا یا آٹھویں صدی میں جب ہندوستان میں اسلام شروع ہوا؟ (ہنٹنگٹن بلاشبہ اسی پر یقین کرتا ہے)۔ تصادم کا یہ افسانہ تو ہندوستان کے ماضی کی مذہبی بقائے باہمی یا مذہبی رواداری اور ہندو مسلم کے باہمی اشتراک سے جو دقیع صورت پیدا ہوئی ان سب کا مذاق اڑاتا نظر آتا ہے اور تو اور نوآبادیاتی عہد میں بھی جو تحریریں وجود میں آئیں ان میں

بتایا گیا کہ ہندوستانیوں کے اندر مسلم ہندو رواج اس طرح باہم پیوست ہو گئے تھے کہ ان میں کوئی گرہ کوئی سلوٹ کوئی سلائی نظر تک نہ آتی تھی یعنی ان میں کوئی فرق یا امتیاز نہیں پایا جاتا تھا۔ ہنٹنگٹن کسی ہندوستانی تہذیب کو نہیں مانتا حالانکہ یورپی عیسائی تہذیب کے مقابلے میں ہندستانی تہذیب میں زیادہ کثیر الوجودیت اور تنوع پایا جاتا ہے، یورپ میں ماضی میں بڑے بڑے خونیں مذہبی جھگڑے ہوئے، ہنٹنگٹن یورپ کے ان مذہبی تنازعوں اور تجربوں کو اٹھا کر دوسرے علاقوں اور قوموں پر چسپاں کر دیتا ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی فرض کر لیتا ہے کہ یورپ کے سوا ان علاقوں میں نہ تو اعلیٰ درجے کے ادارے اور سماجی تنظیمیں تھیں نہ ہی اپنی ذات کا لچکدار تصور تھا۔ یہاں ہنٹنگٹن کا یہ تصور بالکل ہی قدیم اور بوسیدہ ہے کہ مذہب کو ہر صورت تہذیبوں کی فالٹ لائن ہونا چاہیے اب یورپ بے شک کتنا ہی زور مارے اس کے ہاں تو ریاست اور مذہب الگ الگ ہیں، دوسری تہذیبوں میں تو بعض ضروری اور بنیادی عناصر اور ان کی جڑیں ہی مذہب میں پیوستہ ہیں۔ یوں مغرب مکانیت سے جلا پاتا ہے مگر مشرق مکانیت کو ترک کرتا ہے۔ اس طرح ہمارے پاس کنفیوشیئس کی تہذیب ہے چین کی تہذیب نہیں۔ ہندو نہ کہ ہندوستانی تہذیب اور سلاوک آرتھوڈاکس نہ کہ یوریشین تہذیب۔ ہنٹنگٹن کے جوہر وہ چیز ہیں جن سے قومی کردار سازی کی صنعت کے علمبرداروں نے چند دہائیاں قبل زندگی اور موت کا سامان لیا تھا۔

اگر ہنٹنگٹن ہندوستانی کی جگہ حتمی طور پر متبادل ہندو کو سمجھتا ہے اور فرض کرتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو (مسلم عقائد کے مستند نمونے مشرق وسطیٰ میں سمجھے جاتے ہیں) مسلمان ہونے سے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں اور ان کے ہندوستانی ہونے کا بھی کوئی بڑا مطلب نہیں تو اس سے کم تر بات اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ کہ مغرب والے یہی سمجھیں کہ انسانی حقوق اور قانون کی حکمرانی صرف اور صرف ان سے مخصوص ہے اور یہ مال صرف ان کے گودام میں پایا جاتا ہے۔ اس سے ہم آگے بڑھیں تو وہ مکروہ منظر آتے ہیں جو امریکہ کی اس وقت کی وزیر خارجہ میڈیلین البرائٹ کی رپورٹ میں نظر آتے ہیں۔ اس نے اپنے

1997 کے دورہ میں ویت نامیوں کو لیکچر دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ انسانی حقوق کا کوئی احترام نہیں کرتے اسی لیکچر کے بارے میں یہ رپورٹ ہے۔ جبکہ امریکہ نے ان (حقوق) کو ویت نام کے اندر تباہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور باقی دنیا جو کچھ کہہ رہی تھی اس کی ذرہ برابر پرواہ نہیں کی۔ اس رویے کے باعث پھر اور فاش اور فحش اقدامات کیے گئے۔ ان میں وہ قانون ہے جو 11 ستمبر 2001 کو امریکی قلعے پر دہشت گردوں کے حملے سے پہلے بنایا گیا۔ جس کے تحت ویت نام (۳۵) میں انسانی حقوق اور جمہوریت کے فروغ کے لیے رکھے گئے بیس لاکھ ڈالر کی مدد منسوخ کر دی گئی۔ جدید زمانے میں نسل کشی اور قتل عام کا اہتمام کرنے والے بلکہ ہماری اپنی خونی بیسویں صدی میں ایسی ہی ہولناک وارداتوں کے ذمہ دار مغرب نے اپنی تقلید میں دوسرے لوگوں اور ملکوں کو بھی اسی قسم کے بہیمانہ اقدامات کرنے پر اکسایا۔

اب تو مغرب کی ان معاملات میں منافقت بھی ریکارڈ ہو چکی ہے اور اس نے جو ناقابل بیان ظلم وستم توڑے ہیں نہ ان پر پردہ ڈالا جا سکتا ہے نہ ان سے انکار کیا جا سکتا ہے تو اب انہوں نے مغرب کے اقدامات کو باقی دنیا کے اقدامات سے مختلف ثابت کرنے کے لیے ایک خاص قسم کی مغربی اور امریکی منطق وضع کر لی ہے۔ یہ معاملہ بڑا تشویش ناک ہے مگر اس کا نوٹس کم لیا گیا ہے لیکن دراصل یہ دنیا کے مستقبل کو ایک بار پھر غلام (نو آبادیاتی) بنانے کی حیلہ گری ہے اور ضروری ہے کہ اس کی چھان پھٹک کی جائے۔ برنارڈ لیوی نے مغرب کے خلاف الزامات کو معروف قرار دیتے ہوئے انہیں (مغرب کو) مخاطب کر کے کہا کہ "ہمارے پاس سوائے اس کے اور کوئی راستہ نہیں کہ نہ صرف امریکی یا مغربی کی حیثیت سے بلکہ نسل انسانی کے جزو کی حیثیت سے اقبال جرم کر لیں"۔ یہ لفظی روپ تو بے تاثیر سا ہے اسی لئے لیوی ایک اور سطح پر ایک تقابل پیش کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ مغرب میں عورت کے ساتھ انتہائی غیر مساوی اور ظالمانہ سلوک کیا گیا، جو کسی صورت بھی کثرت ازدواج یا داشتائیں رکھنے سے بہتر نہیں کیونکہ کثرت ازدواج اور داشتاؤں کا سلسلہ تو اس خطہ زمین پر عالمی نوعیت کا ہے"۔ یہ دلیل پوری طرح تو دل کو نہیں لگتی اور یقیناً یہ

متنازعہ بھی ہے اس لیے لیوی اس سے بھی آگے بڑھ کر بڑی دلیل دیتا ہے۔ غلامی جیسے مخصوص ادارے کی مزید خاصیت یہ ہے کہ امریکہ میں آخرکار اسے ختم کر دیا گیا۔ یعنی معصومیت سے آغاز کیا مگر پھر وہ جو فطری نہیں تھا یعنی مغرب نے ایسی غلامی کو قبول کیا پھر غلامی کو سب سے پہلے ختم کیا۔ پہلے اپنے اندر پھر دنیا میں جہاں کہیں ان کا اثر رسوخ تھا دونوں صورتوں میں سامراجیت کے ذریعے یعنی پہلے غلامی کو دنیا کے ان حصوں میں شروع کیا جہاں غلامی اور اس کی روائت تھی ہی نہیں اور پھر ان کا اپنا مفاد سامنے آیا تو اس کے خلاف پابندی عائد کر دی۔ لیوی کی نظر میں یہ طرفہ تماشا ہے۔ بظاہر ندعا یہ ہے کہ چونکہ سامراج نے غلامی ختم کی اس لیے شائد ہم اس کو بحال یہ کر دیں تو ہوسکتا ہے کہ سامراج سے کوئی اور نیکی بھی ہو جائے۔(۳۷) اس طرح مغرب دوسری تہذیبوں سے ممیز یوں ہوتا ہے کہ اس نے کسی حد تک نسل پرستی، جنسیت اور غلامی جیسے تاریخی امراض کو تسلیم کیا، ان کو نام دیا اور کسی حد تک کامیابی سے کوشش کی کہ ان کا علاج کرے، یہی مغرب کی مخصوص صفت (۳۸) ہے۔تو ہمیں بلاشک یہ یقین دلایا جا رہا ہے کہ مغرب کی کم ازکم اس خوبی کو مان لیں کہ وہ اپنے گناہوں کی معافی مانگ لیتا ہے۔

اگرچہ امریکی اور مغربی استثنائیت کا مدعا ہی ہنٹنگٹن کا مقصود ہے مگر وہ اس کے ساتھ ساتھ ان خرابیوں کو بھی الم نشرح کرنے کی تدبیر کرتا ہے جو مغرب کی تقلید کرتے ہوئے باقی دنیا میں پیدا ہوں گی۔ یہ بات نہیں کہ اصولی طور پر مغرب کی تقلید نہیں کی جانی چاہیے ہمیں تو زیادہ سے زیادہ خوبی پیدا کرنے کی خواہش ہونی چاہیے۔ تاہم مقامی باشندے تو نقالی کرتے ہیں مگر غیر مغربی دنیا کو تقلید کا اچھا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ اگر کہیں آفافیت ہوتی ہے تو یہ آفافیت مغرب کے نمونے پر ہی ہوسکتی ہے۔ مگر یہ کس قسم کی آفافیت ہے کہ خود کو جمہوریت قانونی حقوق، روح آزادی اور آزادی اور خوشی کے حق سے وابستہ کرنے کی بجائے ہمیں امریکہ سے یعنی پیپسی، میڈونا، اور میکڈونلڈز مختصراً یہ کہ امریکی پاپ کلچر اور اشیائے صارفین سے وابستہ کیا جائے۔ ہنٹنگٹن بڑی دلسوزی کے ساتھ بتاتا ہے کہ مغربی ثقافت کا جوہر میگنا میک نہیں میگنا کارٹا ہے۔ شکیپیئر کی انگریزی اور کم مصفا امداد اور دونوں کا تال میل مغرب کی لاتعداد کامیابیوں کو کم معیار بنا دیتا ہے۔ مگر بات اتنی ہی تو نہیں اگر مغرب اپنی برائیوں (لیوی کے الفاظ میں استعماریت) کو خوبیوں میں بدل دیتا ہے

تو ہنٹنگٹن اس کی مخالف صورت کو دیکھتا ہے یعنی غیر مغربی لوگوں یا ملک کی اچھائی کو برائی میں بدل دیتے ہیں۔ ہنٹنگٹن نے یہ نتیجہ اس لیے نکالا کہ بعض جدیدیت کو تو قبول کرتے ہیں مگر مغربیت کو نہیں اگر یہ قبولیت بھی معمولی سی ہو اور صرف اپنے فائدے تک تو پھر اس بات پر غور کریں کہ جب غیر مغربی معاشرے مغربی طرز کے انتخابات قبول کرتے ہیں تو اس کے نتیجے میں مغرب مخالف تحریکیں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ پھر ایشیائی اور افریقی آمر جمہوریت کے ذریعے ہی آمریت قائم کر لیتے ہیں۔ جمہوریت معاشرے کو کشادہ کی بجائے زیادہ علاقائی یا تنگ نظر بنا دیتی ہے۔ تو پھر ہنٹنگٹن کے خیالات کے مطابق مغربی آفاقیت کی بجائے مستقبل پر مغربی استثنائیت کا سایہ ہوگا۔

جو علم اور علمی ادارے ایسے کچے خیالات پر داد کے ڈونگرے برسائیں جیسے ہنٹنگٹن کی تحریروں کے نصیب میں آئے اس علم اور ان علمی اداروں کے بارے میں افسوس ناک تبصرہ ہی ہو سکتا ہے۔ اگر مستقبل کو مغربی استثنائیت اور مغربی آفاقیت کی آویزش کے حوالے سے ہی دیکھنا ہے تو پھر واحد مستقبل اس بات کا ہوگا کہ ان کمزور اور علیل قسم کی صورتوں کو ہی رد کر دیا جائے۔ چونکہ مغرب نے اختلافی مستقبل کے سارے راستے بند کر دیئے ہیں اس لیے یہ استرداد زیادہ آسان ہے۔ کوئی اختلاف جو مغرب والوں کی سمجھ میں نہیں آتا یا اس کے اپنے معاشرتی اصولوں کے مطابق نہیں اسے اختلافی نہیں لیا جاتا ہے۔ جبکہ مغرب نے حال ہی میں مابعد نوآبادیات یا مابعد جدیدیت کے نام پر اختلافی نوعیت کے علوم کا ڈھانچہ بالارادہ بنایا ہے۔ اس کے بارے میں جو بھی اختلافی رائے آتی ہے اسے رومانس، دیسی، قدامت اور قبائلیت کی طرف مراجعت قرار دیا جاتا ہے۔ (۳۹) مستقبل کے بارے میں ہمارا خیال تو ماہرین کی طرف سے پیش کردہ غالب خیالات کے تابع خیال کیا جاتا ہے چنانچہ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اس وقت تک بہتر مستقبل کی صورت نظر نہیں آسکتی جب تک علوم کے غالب ڈھانچے کو نوآبادیاتی غلامی سے آزاد نہیں کرایا جاتا اس کے لیے سب سے پہلے تو بیسویں صدی کی یونیورسٹی، اس کے علمی شعبوں (اور حال میں متعارف کرائے گئے اور بزعم خود انتہائی نیک نیتی سے متعارف کرائے گئے) بین الثقافتی مضامین کو سب سے پہلے نشانہ بنانا پڑے گا۔ ہماری تازہ تازہ حاصل کردہ دانائی اور علم کا پہلا تقاضہ ہوگا کہ جب ماہرین کو ان کے مقبوضات سے بے دخل

کیا جائے گا تو پھر مستقبل ایک مصفا ماحول، نوع بنوع صورت اور صحت کے ساتھ دکھائی دینے لگے گا۔

لامحدود کھیل... اختلاف گاندھی کی طرز پر

موہن داس گاندھی (مہاتما) ایک ایسے شخص تھے جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو ایک ہی ممتاز تہذیب کے حامل قرار دیتے تھے اور اس بین الثقافتی رویے کے لیے انہوں نے اپنی جان دے دی۔ گاندھی 20 جنوری 1948 کو ایک ہندو جنونی گاڈسے کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ گاڈسے کا خیال تھا کہ گاندھی نے ہندو قوم کو کمزور کیا ہے اور پاکستان بنانے میں حصہ ڈالا ہے۔ گاندھی کا قتل ہوا تو پھر اس پہلے قتل کے بعد اسی قسم کے بہت سے قتل اور ہوئے (۴۰) گاڈسے صرف ایک جنونی ہندو نہیں تھا درصل وہ ہندوستانی معاشرے کی جدیدیت پسند اشرافیہ کا بزعم خود ترجمان تھا۔ اشرافیہ والے چاہتے تھے کہ غلامی کے خاتمے پر ہندوستان ایک مضبوط قومی ریاست کے طور پر ابھرے۔ ترقی کے عظیم منصوبوں کا آغاز کرے۔ دنیا میں اپنی حیثیت اور رائے منوائے، اپنی مرضی کو دوسرے ملکوں سے بھی یعنی علمی سطح پر بھی منوائے اور جدید سائنس یا علوم کی دانائی کو دل و جان سے قبول کرے۔ گاندھی کا اصرار تھا کہ پہلے اندر کی آواز سنو، اس کے ساتھ ساتھ ان کا روائتی سکہ بند سیاسی فکر و عمل سے الگ غیر روائتی طریقہ تھا اور وہ طاقت کی سیاست یا جھوٹی سیاست کے مخالف تھے۔ مزید یہ کہ جدید صنعتی تہذیب کے بھی بڑے نقاد تھے۔ اس لیے ان کے مخالفین جو دراصل اس وقت کی سیاسی رائے کے تمام پہلوؤں کے نمائندہ تھے، بڑے شش و پنج میں پڑ گئے۔ (۴۱) گاندھی کے بارے میں صرف چرچل نے ہی نہیں کہا تھا کہ "وہ نیم عریاں فقیر ہے" بلکہ جدیدیت کے علمبرداروں کو بھی گاندھی کی غریبی کو باوقار بنانے کی ادا پسند نہ تھی اور وہ گاندھی کو مستقبل کے عظیم ہندوستان کی راہ میں ایک رکاوٹ گردانتے تھے۔ چنانچہ گاڈسے نے ان کو مار دیا بلکہ ان کے دوسرے مخالف یا چپ تھے یا اقبالی گواہ (۴۲) یعنی گاڈسے کے عمل کے حامی۔

گاندھی کے قتل بعد بابائے قوم کو رسمی عزت اور خراج عقیدت پیش کیا گیا، اب اسی قسم کی رسمیں مقررہ موقعوں پر ادا کی جاتی ہیں اور ہر گزرتے سال گاندھی کی سمادھی پر پھولوں کے ہار

چڑھانے کا مطلب ہے کہ اب وہ زمانہ قریب آ رہا ہے جب قومی ریاست کی زندگی سے گاندھی کے اثرات ختم ہو جائیں گے۔ جس شخص نے ساری زندگی بڑی محنت کی وہ ایک قومی دن اور قومی چھٹی کا بہانہ بن گیا۔ تاہم گاندھی کا سایہ نہ ہٹایا جا سکا۔ بوڑھے شخص نے رخصت ہونے سے انکار کر دیا وہ آج بھی اتنا ہی متحرک اور حساس ہے جتنا کہ وہ اپنی زندگی میں تھا۔ دنیا نے ہندوستان میں اگر دلچسپی لی تو مہاتما گاندھی کے صدقے۔ جب مارٹن لوتھر کنگ جونیئر ہندوستان آئے تو اس لیے کہ انہیں گاندھی کے عدم تشدد کے اصول بہت پسند تھے اور یہ کہ آزادی کی جدوجہد میں عدم تشدد کی پالیسی کے مطابق گاندھی کی جدوجہد اور اس کا پھل انہیں بڑے اہم دکھائی دیئے۔ آج کے سیاسی فعال اور نو آبادیاتی مخالف راہ نما نوآبادیات کے خلاف جدوجہد میں مہاتما گاندھی کی جنوبی افریقہ اور ہندوستان میں کی گئی جدوجہد سے فیض پاتے ہیں۔ مغرب میں سبزی خوری کی جو زبردست تحریک چلی ہے اس کے پیچھے بھی گاندھی کی تحریروں اور گاندھی کے سبزی کے بارے میں رویے ہی کارفرما ہیں۔ پھر ہندوستان اور بیرون ہندوستان ماحولیات کے بارے میں سرگرم لوگوں نے بھی گاندھی کی بے تحاشا صرف، لالچ اور سرمایہ دارانہ استحصال پر دوررس تنقید سے تحریک حاصل کی۔

اگرچہ بہت سے لوگ چاہتے تھے کہ گاندھی ذہنوں سے اتر جائیں مگر ہندوستان نے غیر جانبدارانہ تحریک میں شرکت اور فروغ سے گاندھی کی روائت کو زندہ کیا۔ جواہر لال نہرو نے روسی بلاک اور امریکہ کی سرکردگی میں نیٹو دونوں کی مخالفت کی اور بہت سے تنازعوں کے حل کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ نہرو نے بھی گاندھی کی طرح مذاکرات پر زیادہ زور دیا۔ گاندھی کی عدم تشدد کی روائت ہندوستان سے تقاضا کرتی تھی کہ یہ خارجہ امور میں بھی اسی روائت کی پاسداری کرے گا اور دنیا کو بتائے گا کہ ہندوستان گاندھی جیسے لوگ پیدا کرنے کا واقعی حقدار تھا۔ مگر ایک صفری (لاحاصل) سیاست والی دنیا میں ہندوستان کے لیے گاندھی کے خیالات کے مطابق عمل کرنا مشکل ہوا اور اس کا اظہار اس وقت ہوا جب ہندوستان نے ایٹمی ہتھیاروں کا تجربہ کیا۔ ہندوستان کی وزیراعظم اندرا گاندھی نے 1973 میں اعلان کیا کہ ہندوستان نے بھی پرامن ایٹمی ہتھیار بنا لیا ہے۔ مگر ''پرامن'' اور ''ہتھیار'' ان دو لفظوں کے درمیان لفظ ''ایٹمی'' رکھنے سے مدعا کیا ہے؟ ہندوستان کی خارجہ اور دفاعی انتظامیہ کے شکرے حاکم یقیناً بڑے خوش تھے مگر یہ سارا کام جس خاموشی اور راز داری سے کیا گیا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گاندھی کا حلقہ اثر ابھی پوری طرح ٹوٹا نہیں۔

مئی 1998 میں گاندھی کے قتل کے پچاسویں سال ہندوستان کی قومی ریاست نے گاندھی کے سائے کو بھی ہمیشہ کے لیے قبر میں سلا دیا اور جو کام گاڈسے نے ادھورا چھوڑا تھا وہ مکمل کر دیا۔ اس مہینے ہندوستان نے پانچ ایٹمی دھماکے کیے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کی آخرکار اپنی ایک پرانی خواہش پوری ہوئی اور اس نے ہندوستانی سیاست میں عروج کو چھو لیا اور اب وہ ہندوستان کو عالمی سیاست میں ایک بلند مقام دلانا چاہتی تھی۔ اس تنظیم میں ایسے لوگ بھی رکن ہیں جو مہاتما گاندھی کے قتل میں ملوث تھے۔ ان سے پہلی حکومت بھی یہی چاہتی تھی اور کچھ عرصہ سے ہندوستان مستقبل میں اپنے لیے سلامتی کونسل کی مستقل نشست کے حصول کے لیے بات چیت میں مصروف تھا۔ اس کا موقف یہ تھا کہ وہ ایشیا اور بحرالکاہل میں اہم کھلاڑی بن جائے۔ بہت سے ہندوستانی سائنسدانوں اور مبصروں کا خیال تھا کہ ہندوستان کو سلامتی کونسل کا ممبر بنانے کے لیے یہی کافی ہے کہ اس کی آبادی ایک ارب کے قریب ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ بعض کا موقف تھا کہ سائنس اور دوسرے علوم میں بھی ہندوستانیوں نے بڑا نام پیدا کر لیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ وہ پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، اس بنا پر بھی اسے رکنیت ملی چاہیے۔ ایک تیسری دلیل یہ تھی کہ ایک ''چوہیا سی قوم'' کو بھی ممبر بنا لیا جائے تو کیا حرج ہے یہ لفظ ناخوشگوار ہے مگر ایک گھمنڈی سے امریکی ماہر امور خارجہ نے یہ زبان عام استعمال کر کے خود کو بڑی تہذیب کا بندہ سمجھا۔ ہندوستان کے کسی سرکاری افسر نے یہ نہیں سوچا کہ کیا سلامتی کونسل کی ہیئت تبدیل کیے بغیر امریکہ ہندوستان کو کونسل کا رکن بنانے پر راضی ہو جائے گا اور کونسل کی نئی ہیئت میں کیا امریکہ کو مساوی ارکان میں سب سے زیادہ حیثیت حاصل رہے گی؟ اور پھر کہیں یہ تو نہیں کہ جب تک ہندوستان سلامتی کونسل کا رکن ہوتا ہے اس وقت تک اقوام متحدہ کی یہ حیثیت ہی نہیں رہے گی یعنی ہندوستان کو اس وقت رکن بنایا جائے گا جب (دعوت کے) دسترخوان پر صرف بچی کھچی ریزہ ریزہ چیزیں ہی رہ گئی ہوں گی۔ ہندوستان میں عسکریت پسندوں کو صرف ایک حقیقت کا علم ہے اور اسی پر ہندوستان کے استحقاق کی بات کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ سلامتی کونسل کے پانچویں کے پانچوں مستقل رکن ایٹمی طاقتیں ہیں۔ اب ہندوستان بھی ایٹمی طاقت کے حوالے سے ان کا ہمعصر ہو گیا ہے۔ اس لیے اسے رکن ہونا چاہیے۔ اگر ہندوستان نے عالمی سیاست میں مقام حاصل کرنا ہے تو اسے ایٹمی کلب کی رکنیت حاصل کرنا ہوگی۔

ہمارے عہد کی ایک بہت بڑی ناکامی بلاشبہ اس وقت ثابت ہوگئی جب ہندوستان نے 1998 میں ایٹمی دھماکہ کیا۔ ناکامی یہ کہ کوئی بھی قوم جو بڑا کھیل کھیلنا چاہتی ہے وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتی کہ وہ قومی ریاست کے موجودہ نظام کی وحشیانہ اور خوف ناآشنائی کی بے سود سیاست سے علیحدہ ہو کر یہ کردار ادا کرسکتی ہے۔ ہندوستان کو قومی ریاست نے پچاس برس سے کچھ اوپر مدت ہوگئی ہے اور کئی صدیوں سے (ہندوستان) کبھی ایک سلطنت اور کبھی دوسری قلمرو کا حصہ رہا ہے لیکن اس کی تہذیب کی عمر پانچ ہزار سال ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے رکن اور دوسرے عسکریت پسند ہندو بڑے فخر سے خود کو شاندار ہندو تہذیب کے وارث بتاتے ہیں۔ وہ اس تہذیب کو ایک تاریخی حقیقت سمجھتے ہیں تاہم اس کی روح اور جوہر کو بالکل نہیں سمجھتے۔ انہیں کم ہی خبر ہے کہ تہذیب کا لفظ شہری اور شہریت سے نکلا ہے اور بلند بانگ ہندو کبھی بہترین ہندو نہیں ہوسکتا۔ بلکہ ہندو بھی نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان کی تہذیبی حیثیت سے سراسر آشنا سیاسی قیادت ہی سوچ سکتی تھی کہ اس کی قسمت میں جدید قومی ریاست کے نظام میں رہتے ہوئے بڑا کھلاڑی بننا ہو تو دوسرا کوئی بھی طریقہ یا ڈھنگ اختیار کیا گیا تو ہندوستان شہرت نہیں پا سکے گا اور مسلسل نظر انداز کیا جائے گا۔ چنانچہ جن کو ہماری تہذیب کے روحانی ورثے سے نفرت ہے صرف وہی مہاتما بدھ کے جنم دن پر ایٹمی بم کا دھماکہ کرنے کی گستاخی کر سکتے تھے اور پھر کامیاب دھماکہ کے بعد انہیں یہ پیغام ملا ''مہاتما بدھ مسکرا رہا ہے'' غالباً ان معاملات میں وہ اپنے سیاسی ہیروز (دلاوروں) کی تقلید کر رہے تھے جب دنیا میں پہلے ایٹم بم کا کامیاب تجربہ رابرٹ اوپن ہیمئر اور اس کے ساتھیوں نے کیا تو چرچل کو تار ملا۔ یہ لفظ درج تھے ''بچے با آسانی پیدا ہوئے'' (۴۳)

ہندوستان نے ایٹمی کلب کے بدوضع مکروصورت ادارے میں شامل ہونے کی کوشش کی جس سے مراد یہ تھی کہ وہ ان تمام قوانین کی پاسدار کرے گا جو کلب کے ارکان نے بنا رکھے ہیں۔ ہندوستان نے گاندھی کی موت کے صرف پچاس برس بعد بم چلا دیا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ عہد حاضر میں جھوٹی سیاست کے فیصلوں سے اختلاف کرنے کی صفت سے ہندوستان تیزی سے محروم ہوتا جا رہا ہے جبکہ اختلاف کی گنجائش پہلے ہی تیزی سے گھٹ رہی ہے۔ گاندھی نے ساری عمر انگریزوں اور اپنے مخالفوں سے رابطہ قائم رکھا مگر

اس نے اپنے نکتہ نظر کے حوالے سے اور اخلاقی اعتبار سے نہ خود سے نہ اپنے مخالفوں سے سودا کیا۔ اگر آزادی نا قابل تقسیم ہے یعنی اس پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا تو پھر آزادی کی جدوجہد سے دونوں فریقوں کو برابر کا فائدہ ہوگا۔ جیمز کارس کے الفاظ میں محدود کھیل (۴۴) کی اس دنیا سے گاندھی نے اصول کے تحت اختلاف کیا۔ ان کھیلوں میں ہمیشہ کوئی ہارتا ہے کوئی جیت جاتا ہے اور اگر بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان سے کوئی بھی نہیں جیتا بلکہ دونوں ہی ہارے ہیں تو ٹھیک ہے یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اسلحہ سازی کی صنعت، ملٹری انڈسٹریل کا مپلیکس اور قومی ریاست کا نظام ہی جنوبی ایشیا کی ایٹمائی گئی فضا میں جتیا ہے۔ گاندھی کا خاص انداز انکار یہ تھا کہ وہ بقول کارس لامحدود کھیل میں شامل ہوتے تھے جس کا مقصد جیتنا نہیں ہوتا (جیتنا تو محدود کھیل ہوتا ہے) بلکہ کھیل کو جاری رکھنا ہے اور انسان کی حیثیت سے ہم اخلاقی طور پر پابند ہیں کہ یہ بازی آخری وقت تک کھیلتے رہیں یعنی باہم مذاکرات کبھی ختم نہ ہوں۔ لامحدود کھیل میں قاعدے مقرر نہیں ہوتے اور اگر وہ طے بھی ہوں تو ان کی خلاف ورزی کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی برداشت کی جاتی ہے۔ اس فلسفیانہ پس منظر کے ساتھ ہی گاندھی کے طرزِ اختلاف کی گرامر بھی جڑی ہوئی ہے۔ چنانچہ ہندوستان کی آزادی کے بارے میں ایک بار بہت سی پارٹیاں مکالمے میں شریک تھیں کہ گاندھی ہفتے میں ایک دن چپ کا مکمل روزہ رکھتے۔ اس طرح مختلف آوازوں کی چوں چاں مکمل بند ہو جاتی اور اندر کی ٹھہری آوازیں سنائی دینے لگتیں۔ انگریزوں کی نظر میں گاندھی مشرقی طرز کے سیاستدان تھے۔ مگر انہوں نے سادھو سنت کا بھیس بدل رکھا تھا اور مشرقی سیاستدان کی یہ حرکت اگر نا معقول نہیں تھی تو غیر متوقع ضرور تھی۔ بہرطور یہ گاندھی کا خاص اظہار اور مواصلاتی عمل تھا اس طرح گاندھی نے ایک نادر قسم کے انکار کا ڈھنگ ایجاد کر لیا اور انکار کی ایک مصروفیت بھی نکال لی۔

جیسے جیسے ہم ہندوستان کی طرف سے عسکریت پسندانہ ایٹمی طاقت حاصل کرنے کی یلغار کے گہرے معانی پر غور کرتے ہیں تو ہم پر لازم آتا ہے کہ ہم اپنے وقتوں میں اختلاف کے امکانات کا جائزہ لیں تب بلاشک نظر بھی آئے گا کہ اختلاف کے امکانات بہت کم رہ گئے ہیں یعنی نوکالٹ کے نکتہ نظر سے۔ یہ نکتہ نظر ہے موجودہ جمہوری نظام میں جو اختلافات بظاہر نظر آتے ہیں دراصل اقتدار کے حصول کی حد تک ہیں مگر اقتدار بھی ایسے مضامین اور

معاملات کوجنم دیتا ہے جو بظاہراس کے خلاف ہوتے ہیں مگر حقیقتاً وہ اقتدار کے ڈھانچے کو پائیداری بخشتے ہیں۔ اختلاف کے پھلنے پھولنے کی اجازت صرف اس شرط پر دے جاتی ہے کہ یہ جس مقتدر ڈھانچے کی بظاہر مخالفت کرنا نظر آئے حقیقتاً اسی کی مضبوطی کا باعث بنے۔ فوکولٹ لکھتا ہے ''اقتدار صرف ایک شرط پر قبول ہے کہ وہ خود اس کا معتدبہ حصہ بن جائے۔ (۴۵) تو پھر بتائے کون سی زبان رہ گئی ہے جس میں اختلاف کا اظہار کیا جا سکے اور کوئی شخص اپنے اختلاف کو کس صورت جاری رکھے اور سیاسی عمل، معاشی طاقتوں اور علمی ڈھانچے سے کس طرح ممتاز یا الگ کر سکے گا جس نے اختلاف کو بھی ایک جنس یعنی قابل فروخت شے بنا دیا ہے؟

تہذیبی خلقیہ اور اختلاف کا مستقبل

میں نے کہا ہے کہ اس مستقبل کے بارے میں کس قسم کی فکر ونظر کی جائے جو ہماری نسل انسانی کے لیے اطمینان لے کر آئے، جہاں اختلاف اور انکار اس صورت میں موجود نہ ہو جس میں اب موجود ہوتا ہے جو دراصل نظام کی ستم رانیوں کی خفیہ خفیہ حمائت بھی کرنا ہے بلکہ صحیح معنوں میں اس میں موجود ہوتا ہے، مناسب ہوگا کہ ہم گاندھی کی تعلیمات، تحریروں اور اعمال پر جو بھی تھوڑا سا غور کریں۔ اس راہ پر چلنے اور غور وفکر میں بھی بعض انتہائی کٹھن اور ناممکن الحل مشکلات ہیں۔ گاندھی کے نام سے کوئی پیچیدہ نظریاتی معاملات وابستہ نہیں۔ انہوں نے صرف ایک اصول اور طریقہ بنایا ہے اور وہ ہے مزاحمت بغیر تشدد کے یعنی ستیہ گرہ، گاندھی نے خود بھی اپنے بارے میں یہی تاثر دیا کہ انہیں دانش یا فکر و احساس والا آدمی نہیں بلکہ عمل کا آدمی سمجھا جائے۔ انہوں نے واضح اعلان کیا تھا کہ زندگی ہی ان کا پیغام ہے۔ (۴۶) اور ان کی تحریریں بھی ان کی چتا میں جلا دی جائیں۔ (۴۷) لیکن اس طرح تو ان دانشوروں کے نزدیک بھی گاندھی کا (۴۸) کوئی فائدہ یا استعمال نہیں جو مابعد نوآبادیات نظریہ سازی کرتے ہیں اور جن سے ہم یہ توقع کرتے تھے کہ وہ زیادہ سنجیدگی کے ساتھ علم کے ڈھانچے میں انکار کو کچھ نہ کچھ فروغ دیں گے مگر یہ حیرت کی بات نہیں کہ مزاحمت سے جڑے ہوئے دانشوروں کے علاوہ یونیورسٹیوں میں کارپوریٹ (طریقہ انظام) کے شعبہ کے بڑھتے ہوئے اثرات کے باوجود خود کو موجود کے خلاف

اختلافی آواز اٹھانے کے واحد دعویدار عالموں کی اکثریت بھی جمال پسند ہی نکلی انہوں نے عملاً انکار اور اختلاف کے نام پر ایک دروازہ کھولا جو بذات خود عدم اختلاف کا ہے۔

ان دنوں جن عالموں کو عروج ملا ہوا ہے انہوں نے گاندھی کے لیے کوئی وقت نہیں نکالا۔ دوسری طرف گاندھی کے مداحین کے پاس عالم کے بارے میں گاندھی کے نکتہ نظر کا بہت ہی محدود تصور ہے۔ ہوسکتا ہے کہ گاندھی کوئی بڑے نظریہ ساز نہ ہوں۔ اگرچہ اس بیان پر بھی اختلاف ہوسکتا ہے مگر شاید ہی کوئی ایک آدھ موضوع ایسا ہوگا جس پر گاندھی نے کچھ نہ کہا ہو۔ پھر جن کی دلچسپی مخصوص اور جزوی ہے ان کو گاندھی کی جلد سمجھ آجاتی ہے اور تو اور مارکسٹوں نے بھی مشکل وقت میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی پر گاندھی کی بہت سی باتوں کو استعمال کیا ہے مگر مارکسٹوں کے اپنے فلسفیانہ رجحانات کو دیکھیں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انہوں نے سائنس، صنعت کاری اور جدیدیت پر گاندھی کے افکار کو اک بوڑھے کھوسٹ کے خیالات کے طور پر رد کر دیا۔ عدم تشدد کے مدعیان اور فروغ چاہنے والوں کا گاندھی کے بارے میں رویہ ذرا مختلف اور اجتماعی ہے۔ انہوں نے گاندھی کو جس انداز میں سمجھا ہے وہ ذرا پیچیدہ سا معاملہ ہے۔ انہوں نے گاندھی کے عدم تشدد کے بارے میں افکار اور پھر ان کے اطلاق کے درمیان فاصلے کو بھی دیکھا ہے اور جو تشدد صنعت کاری، ترقی، زمین کی بے حرمتی اور عورت کی بے وقعتی کے حوالے سے ہو رہا ہے اس کو بھی گاندھی کے آئینہ افکار میں دیکھا اور سمجھا ہے۔ مگر انہوں نے ان سب میں سے سیاست کو نکال دیا ہے یعنی میرے خیال میں ان کی گاندھی کے افکار کی تعبیر بڑی جامد قسم کی ہے۔

رسماً گاندھی کو معقول فرد سمجھا جاتا ہے جو کبھی کبھی مظلوم کے حقوق اور انسانی حق کے کمزور علمبردار کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ مگر ان کی نظر میں گاندھی کے باقی اور بہت سے پہلو نہیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ دراصل ہمیشہ اختلاف کرنے والے تھے۔ یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے معاشرہ ترک (ترک دنیا) نہیں کیا تھا کیونکہ یہ نہ ان کا مذہبی اور نہ ہی سیاسی طریق تھا اور آرویل نے بڑی چابکدستی سے گاندھی کے بارے میں کہا کہ گاندھی کے بعد ولی یا راہب کی زندگی کسی عبادت گاہ کی بجائے سیاسی کچی بستیوں (۴۹) میں گزرے گی۔ شائد اختلاف (عدم اتفاق، منظوری یا اتفاق کے برعکس) کا ایک عجیب سا رشتہ اور تعلق عدم تشدد سے ہے۔ اس کو بھی ہمارے عہد میں شدید

قابل نفرت منفی صورت دی گئی۔ بس چند بزعم خود انقلابی تشدد کی بجائے عدم تشدد کو بہتر سمجھتے ہیں۔ یہ صورت تو ان دانشوروں کی طرف اشارہ کرتی ہے جو اس ''اختلاف'' کو بھی خاطر میں نہیں لاتے جس کا ذکر ریمنڈ ولیمز نے اپنی مشہور کتاب کی ورڈز میں (50) یوں کیا ہے کہ اس کا ذکر ہی نہیں کیا اور عدم تشدد کا بھی ذکر نہیں کیا۔ البتہ اس نے جو ضروری الفاظ کی فہرست دی ہے اس میں تشدد کو شامل کیا گیا ہے۔ جس عالم نے گاندھی کی تحریریں دیکھی ہیں وہ یہ نہیں بھول سکتا کہ گاندھی نے تشدد اور عدم تشدد کے درمیان انتہائی غیر معمولی اور نازک حد فاصل کھینچی ہے۔ انہوں نے تشدد کے بارے میں تفصیل بھی تشدد سے پاک یعنی کھردرے پن سے پاک رکھی ہے۔ پھر ایک کمزور کے عدم تشدد اور ایک طاقتور کے عدم تشدد کا اور بعض عدم تشدد کی متشددانہ صورتوں کا مقابلہ کیا ہے۔ (۵۱) مارکسی نقاد مابعد نو آبادیات کے نظریہ ساز اور مابعد سٹرکچرلٹس، سوانح نگار کم ہی ہوتے ہیں، دوسری طرف معروف ہے کہ گاندھی کی زندگی ان کے خیالات سے زیادہ پرمایہ ہے۔ چنانچہ ان کے خیالات کی تعبیرات کا کام گاندھی کے (عموماً عام سے) (۵۲) سوانح نگاروں کے کندھوں پر آتا ہے۔ امریکہ اور برطانیہ کی یونیورسٹیوں میں کچھ اختلاف کرنے والے اساتذہ پیدا ہوئے جن کے بارے میں قدامت پسند اساتذہ نے درسگاہوں کے اندر اور ذرائع ابلاغ میں ان کی انقلابیت اور فکری اضافیت پر تنقید کی ہے ان کو علم کی فکری سیاست کو نجات دلانے والے مشعل بردار کے طور پر پیش کرنا ہمارے عہد کے معمولی معمولی مذاق ہیں۔

میری عرض داشت یہ ہے کہ گاندھی کئی لحاظ سے ہمیں مستقبل کے راستے دکھاتے ہیں۔ مگر ستم ظریفی دیکھئے کہ گاندھی کو کچھ قدیم ناپسندیدہ روایات کا ماننے والا سمجھ کر رد کیا جاتا ہے۔ میں یہاں صرف تین صورتیں پیش کرتا ہوں۔ پہلا یہ کہ انہوں نے اپنی موت سے چند روز پہلے جو نسخہ دیا وہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ مستقبل کے بارے میں غور وفکر صرف پیش گوئیاں کرنے والوں، معیشت دانوں اور انتظامی ماہرین پر نہیں چھوڑا جاسکتا اور مستقبل کے بارے میں سوچ بچار کو حال کا حوالہ چاہیے۔

جب آپ کسی شک میں پڑ جائیں یا آپ کی ذات ہی آپ پر حاوی ہونے لگے یعنی خود کو ہی سب کچھ سمجھنے لگیں تو ذہن میں کسی ایسے کمزور اور غریب ترین شخص کا چہرہ لائیں جسے آپ نے کہیں دیکھا ہو۔ پھر اپنے آپ سے سوال کریں کہ آپ جو کچھ کرنے والے

ہیں اس کا کوئی فائدہ اس شخص کو ہو گا کہ نہیں؟ اس کو اس سے کوئی فائدہ ہو گا؟ کیا اس طرح اس کو لاکھوں بھوکوں اور روحانی لحاظ سے تشنہ کام لوگوں کو سوراج (آزادی) مل جائے گا؟ پھر آپ محسوس کریں گے کہ آپ کے شک بھی رفع ہو رہے ہیں اور آپ کی ذات بھی گداز ہوتی جا رہی ہے۔(۵۳)

دوسرے گاندھی کا یہ پکا خیال تھا کہ آزادی ناقابل تقسیم ہے۔ جب تک دوسرے آزاد نہیں کوئی بھی حقیقتاً آزاد نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان کی آزادی کی جنگ میں انہوں نے یہ اصول راہنما بنا لیا تھا کہ جب تک انگریز خود کو اپنے آپ سے آزاد نہیں کرا سکتے اس وقت تک ہندوستانیوں کی نجات یا آزادی بھی نامکمل ہو گی۔ انگریزوں نے پہلے خود کو مؤثر طریقے سے اپنا غلام اپنا تابع بنایا اور پھر اس کے بعد دوسروں کو غلام بنایا اور پھر ہندوستانیوں کے درمیان انہیں شدید بے کلی اور بے چینی کا تجربہ ان ہندوستانیوں کی وجہ سے ہوا جن کے اندر انہیں (انگریزوں کو) اپنا مصفا سراپا نظر آیا۔ تاریخ کا وہ حصہ جس سے انہوں نے خود کو الگ کر لیا ہے (۵۴)۔ ایک واجد علی شاہ نے کہا کہ حاکم، عیاش، رقاص، شاعر حتیٰ کہ زنانہ (۵۵) بھی ہو سکتا ہے۔ ایک گاندھی نے کہا کہ مزاحمت، تشدد اور جوش مردانگی کے بغیر بھی ہو سکتا ہے۔ انگریز عدالت اور اخبار کو اپنی ایجاد اور اپنی علیت سمجھتے تھے اور غلام بنائے گئے لوگ ان دونوں شعبوں میں حاکموں کو بہت سا سبق سکھا سکتے ہیں۔ اس طرح گاندھی کہتے ہیں کہ بعض اوقات ظالم جابر کو نجات حاصل کرنے کے لیے اپنے شکار لوگوں کے مقابلے میں زیادہ صبر اور طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمیں اپنے مستقبل کے بارے میں یہ کوشش کرنا ہو گی کہ اس میں مخصوص اخلاقیات بھی موجود ہو اور پھر اگر ہم انکار کرنے کے لیے سازگار حالات پیدا نہیں کرتے تو پھر ہمارا انکار بھی نامکمل ہو گا اور پھر یہی نہیں بلکہ اس کے ذریعے انکار کے لیے بہتر ماحول بھی پیدا کرنا ہے۔ قوی معاشرہ کے اندر اختلاف کرنے والوں نے برطانیہ اور ہندوستان دونوں کی نجات کے لیے ایک کردار ادا کیا وہ ان کے قدرتی ساتھی تھے جنہیں پسماندہ کہہ کر مردود کیا گیا۔ اور اختلاف میں مساوی حقوق اور مساوی مواقع کی صورت پیدا ہوتی ہے۔

تیسرے جیسا کہ گاندھی کی اپنی زندگی سے عیاں ہے ہمارا حق یا سچ کا تصور، جدلیاتی، تفسیری تشریحی اور مکالماتی ہو۔ گاندھی کی سبزی خوری کی عادت نے بہت لوگوں کو متاثر کیا

اور تحریک دی۔ اسی طرح انہوں نے تمام زندہ اشیا یعنی مخلوق کو احترام دیا اس لحاظ سے وہ ہندوستان میں ماحولیات والوں کی نظر میں محترم ہو گئے۔ جرمنی کے گرینوں اور قدیم (deep) ماحول پسندوں کو بھی متاثر کیا۔ ڈیپ ایکالوجسٹ کو وہ کبھی کبھی پسند ضرور کرتے مگر ماحول کو خود پر سوار نہیں کر لیا تھا۔ انہیں ہمارے بہت سے ان لوگوں کی مردم بیزاری پر بہت دکھ ہوتا جو خود کو ماحول دوست کہلاتے ہیں۔ ہر چند گاندھی کی تحریروں میں لفظ ماحول آیا ہی نہیں لیکن جو زندہ مخلوق ان کے قریب آئی انہوں نے اس پر پوری توجہ دی اور پھر انہوں نے چیزوں کو استعمال کے بعد دوسری شکل میں قابل استعمال بنانے کا کام اس وقت کیا جب ابھی صنعتی قوموں کے ثروت مند لوگوں کے دماغ اور لغات میں تعمیر نو کا خیال نہیں آیا تھا۔ گاندھی کو جانوروں سے بڑی محبت تھی مگر وہ پالتو جانور رکھنے کے مخالف تھے۔ وہ جانوروں کے حقوق کے علمبرداروں سے یہ بھی پوچھتے کہ وہ فر (جانوروں کی کھال) پہننے والی عورتوں کی طرف کیوں راغب ہوتے ہیں جبکہ بذات خود ایک اشارہ ہے جانوروں کے خلاف مہلک کارروائی کا۔ ان خواتین کے بارے میں گاندھی سخت اور درشت لہجہ بھی اختیار کر سکتے تھے جبکہ گاندھی کے پیروکار یہ ماننے کو تیار نہیں ہوتے کہ وہ کسی سے درشت بھی ہو سکتے تھے۔

تضاد یہ ہے کہ گاندھی قوم پرست تحریک کے لیڈر تھے مگر انہوں نے قومی ریاست سے کوئی وابستگی نہیں دکھائی۔ اگست 1947 کو دہلی میں اقتدار ہندوستانیوں کو منتقل کیا جا رہا تھا جبکہ باقی سارے ملک میں انگریزوں سے آزادی کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ مگر آزادی کا بڑا معمار گاندھی دہلی سے دور دراز کلکتہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں امن قائم کرنے میں مصروف تھا۔ جدید ہندوستان میں گاندھی یقیناً پہلے (اور ہو سکتا ہے آخری) سیاسی لیڈر تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ جو اقتدار موجود ہے اس سے لاتعلق رہنا چاہیے اور یہ کہ اقتدار کے بغیر بھی بندہ مقتدر ہو سکتا ہے۔ انہوں نے جو سیاسی مذاکرات کیے وہ بھی کسی فوری سیاسی چالبازی کا نتیجہ نہ تھے نہ ہی مدعا یہ تھا کہ اک ہاتھ لے اور دوسرے ہاتھ دے۔ حالانکہ عہد حاضر میں یہ آخری صورت ہی سیاسی لیڈروں کی باعزت کامیابی سمجھی جاتی ہے تو گاندھی دراصل یہ مذاکرات بھی ایک قسم کا تحفہ سمجھتے تھے جو دوسرے فریق کو دیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے مقدس مقامات پر خلافت کی بحالی کی تحریک شروع ہوئی جبکہ برطانیہ خلافت

عثمانیہ کو ختم کر رہا تھا تو گاندھی نے تحریک خلافت کی حمایت کر دی اور یہ حمایت بے لوث بے معاوضہ تھی۔ اس کے عوض انہوں نے مسلمانوں سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ وہ گائے کے ذبیحہ پر پابندی لگا دیں انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں بھی اس لیے نہیں کیں کہ وہ ذاتی طور پر عدم تشدد کے حامی اور تشدد کے خلاف تھے نہ ہی اس سیاسی بنا پر کہ ہندو مسلم اکٹھے ہوں گے تو انگریزوں کے خلاف زیادہ مؤثر جدوجہد کر سکیں گے۔ ان کا مسلک یہ تھا کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہیں اگر یہ دو عقیدے الگ ہوئے تو ہندوستانی تہذیب کے ٹکڑے ہو جائیں گے۔

گاندھی کی غیر معمولی طاقت اور ہندوستانی معاشرے کے رنگا رنگ حصوں میں ان کے لیے ابھی نادر کشش کا سرچشمہ تلاش کرنے کے لیے لازم ہے کہ ہندوستانی تہذیب کی صنمیاتی تعمیر و تشکیل کی طرف رجوع کریں۔ جدیدیت پسندوں اور عقلیت پسندوں نے صنمیات کو بے حقیقت بنا دیا ہے۔ اس کے مقابلے میں سائنس اور تاریخ کو کھڑا کیا، اور ہمارے عہد کی بدترین برائیوں کا ذمہ دار اسے ہی قرار دیا۔ (مثلاً آریائی نسل کا افسانہ، سفید فام لوگوں کی برتری کا قصہ، یہ دونوں بدقسمتی سے بتاتے ہیں کہ کس طرح مکمل طور پر تخریبی طریقے اختیار کر کے تاریخ اور سائنس کے بل بوتے پر مجہول اور جعلی نظریات وضع کیے گئے) اور یہ صنمیات ہی تھی جس نے اپنے اگلے پچھلے دروازے کھلے رکھ کر کوئی حتمی حکم نہیں لگایا جیسا کہ ہمارے عہد کے علوم کی صورت ایسی ہرگز نہیں۔ کارس نے لکھا کہ صنمیات یا اساطیر کے بارے میں بہت سی تفسیریں ہوتی ہیں مگر وہ کسی کو قبول نہیں کرتی۔ جہاں تفسیر ناقابل بیان کو جذب کر کے قابل بیان بنا دے اساطیر وہاں دوبارہ خاموشی طاری کر دیتی ہے اور پھر اصل بیان شروع کرنا ممکن ہو جاتا۔ (۵۷) اسی طرح تہذیب کا خیال بھی اپنے بہت سے امکانات کو ختم کر چکا ہے۔ گاندھی ہندوستانی تہذب کے اندر دھنسے ہوئے تھے یعنی ہندوستانی دیہاتیوں کی مذہبی رسم و رواج سے لے کر مہا بھارت کی گہرائیوں تک بھرپور واقفیت رکھتے تھے۔ اچھے مردوں اور عورتوں کی طرح انہوں نے اپنی تہذیبی کمیوں کو بھی آئینہ دکھایا۔ گاندھی کے نقادوں کا کہنا تھا کہ جب وہ خود اپنے گھر کی مناسب دیکھ بھال نہیں کر سکتے تو پھر انہیں قوم کی طرف سے بولنے یا قوم کو تلقین کرنے کا کیا حق ہے۔ ان دنوں ان کا بڑا بیٹا ان کے تحکمانہ انداز کے باعث ان کے خلاف ہو گیا تھا۔ ہندوستان میں

سیاست کے ساتھ کسی عمل کی وابستگی کبھی نہیں رہی مگر گاندھی نے یہ کوشش کی اور قوم کو چرخا کاتنے کی ہدایت کی۔ گاندھی نے ہندوستانی تہذیب کی روحانی پیچیدگی اور بھرپور ثقافتی روئیدگی کی نمائندگی رامنامہارشی رام کرشن اور رابندر ناتھ ٹیگور کی طرح کی۔ انہوں نے ہندوستانی تہذیب کے ان پہلوؤں کو اجاگر کیا جن کا گاندھی بھرپور طریق سے اظہار کرنے کے قابل نہ تھے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ ہم گاندھی سے ہٹ کر اس عظیم تہذیب کے خلقیہ کی طرف متوجہ ہوں۔ گاندھی اسی تہذیب کے تو بڑے ترجمان تھے۔

اگر کوئی قومی ریاست پر تنقید کے بارے میں ہمدرد بھی ہوگا تو لازمی نہیں کہ وہ کوئی تہذیبی زمرہ بندی کا حامی ہو۔ یورپی تحریروں اور تقریروں سے متعلق یورپی تاریخ کے ہر طالب علم کو علم ہے کہ تہذیب کے نام پر بڑا ناجائز فائدہ اٹھایا گیا یا استحصال کیا گیا۔ یہ بھی ایک اٹل بات ہے کہ بعض لوگ اپنے آپ کو دوسرے لوگوں سے برتر سمجھتے ہیں چنانچہ اسی تاثر کے تحت یورپ کی نوآبادیات پر حاکم لوگوں نے بے دین، وحشی یعنی نوآبادیات کے قدیم لوگوں کو مہذب بنانے کا کام شروع کیا، اس پر مزید تبصرے کی ضرورت ہی نہیں۔ ''مہذب بنانے کا مشن'' کی اصطلاح کوئی ٹھٹھا مزاح نہ تھا۔ صرف انیسویں صدی میں امریکہ کے معروف رسالہ ہفت روزہ ہارپر کی ورق گردانی کی ضرورت ہے جس کی پیشانی پر یہ علامتی تحریر بھی درج تھی۔ ''تہذیب کا جریدہ'' یعنی یہ سمجھانا مقصود تھا کہ کتنے بڑے بڑے عظیم معاشرے کوئی تہذیب نہیں رکھتے۔

ہنٹنگٹن نے دوبارہ اس اصطلاح کا احیا کیا ہے۔ مگر جیسا میں نے کہا کہ اس طرح یہ لفظ یا نظریہ ہنٹنگٹن کو بہتر تہذیبی مقام نہیں دلا سکتا اور اگر 11 ستمبر کے بعد امریکی سیاستدانوں کی ساری تقریریں کسی چیز کی غمازی کرتی ہیں تو وہ یہ ہے کہ تہذیب کے لفظ کو آزادی کی طاقتوں اور بدکاروں کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا رہے گا اور بدکاروں کی گوشمالی کے لیے بھی یہ لفظ جواز فراہم کرے گا۔ پھر بنجامن کے پندو نصائح کا خزانہ ہے جو ہمیں یاد دلاتا ہے کہ تہذیب کا کوئی بھی ایسا نسخہ نہیں جو بذات خود بربریت کا مسودہ نہ (۵۸) ہو یعنی ایک ہی کتاب تہذیب اور بربریت کو پیش کرتی ہے۔ اس کے باوجود تہذیب کے ساتھ جو چند ایک حدود اور ممانعتیں لگا دی گئی ہیں ایسی حدود ہم پر نافذ کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں۔ ہمیں اس تہذیب کے مذہبی اور کشادگی کے امکانات

کو دیکھنے کے لیے ان حدود کو توڑنا ہوگا۔ تاہم اس مفروضہ کا بھی کوئی مضبوط جواز نہیں ہے کہ جن اصطلاحات کے ذریعے مغربی تہذیب کی افہام و تفہیم ہوئی ہے انہی اصطلاحات کو دوسری تہذیب کو عمومی سطح پر سمجھنے کے لیے استعمال کیا جائے۔

لفظ تہذیب کے ساتھ جو مشکلات وابستہ ہیں ان کی بنا پر تہذیبی حساسیت اور بیانات کے بارے میں قیمتی جائزے دھندلانے نہیں چاہئیں بلکہ ہم کو حاصل ہونے چاہیں۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ ہندوستان کے ایٹمی بم کے دھماکے کے حامیوں کا کہنا تھا کہ ہندوستان کے ایٹمی پروگرام کے بارے میں ابہام پایا جاتا ہے۔ اس ابہام کو ختم کرنے کے لیے دھماکہ کرنا ضروری ہوگیا۔ جدید قومی ریاست کا گزارا ابہام سے ہوتا ہی نہیں اور یہ معاملات کو کھلا بھی نہیں رکھ سکتی۔ تہذیبیں اس معاملہ میں خاصی وسیع الظرف ہوتی ہیں اور اس کی بہت سی مثالیں ہندوستان سے ملتی ہیں، ہمارا خیال ہے کہ عورتوں اور مردوں سے متعلق علم کا معاملہ نیا نیا ہے اور ہم مذموم جنسی رسوم سے آزادی کے لیے یہ تازہ معاملہ سامنے لاتے ہیں مگر ہندوستانی رقص کی اوڈیسی روائت کے مطابق یہ تاثر عرصہ دراز سے مل رہا تھا کہ ایک مرد محسوس کرسکتا ہے کہ وہ اصلاً عورت ہے مگر اس کو مرد کا جسم دے دیا گیا ہے۔ ہندوستان کی شاعری اور مصوری کی بعض روایات کے مطابق بعض اوقات کرشن رادھا نظر آتا ہے اور بعض اوقات رادھا کرشن کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ میں نے ہیجڑوں (تیسری جنس) کے بارے میں بہت پہلے جو بات کی اسے ذہن میں لائیں اور ہیجڑے کو ایک قسم کے ابہام کا مظہر سمجھ سکتے ہیں۔ ابہام ہندوستانیوں کی اپنی آرا کی تفہیم اور خود فہمی کا انگ ہے۔ (۵۰) اقل شعوریت (شعور کی محدود صورت) کی اساطیر جدید ہندوستان کی دین نہیں بلکہ ایک ایسی تہذیب کی دین ہے جو ابہام اور بے یقینی کو برداشت کرسکتی ہے اس کے برعکس آج ہر ہندوستانی سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ کھل کر اعلان کرے کہ کیا وہ ہندو ہے یا مسلمان، ہندو ہے یا سکھ، سیکولر ہے یا مذہبی' جدید ہے یا قدامت پسند (۶۰) جدید قومی ریاست میں ہر قسم کی سرحدوں کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے۔ یہ سرحدیں جغرافیائی ثقافتی علمی بھی ہوسکتی ہیں۔ اپنے مستقبل کے بارے میں جب ہم اختلافی پہلو اٹھاتے ہیں تو ہمیں لازماً قومی ریاست سے وفاداری کو ترک کرنا ہوگا۔ اور گھر کے بارے میں کمزور قصہ بھی گم ہوتا ہے اور ہم تہذیب کے شباب کے روپ میں گم ہوجاتے ہیں۔

کوئی مستقبل بھی اس وقت تک خوشگوار نہیں ہو سکتا جب تک اس کی پوری چھان پھٹک نہیں ہوتی اور جب تک علم کے جدید نظام کے بخیے نہیں ادھیڑے جاتے کیونکہ اس نظام نے ہمیں توضیحی سطح پر تعبیروں کی ایسی صورتیں دی ہیں جن کی وساطت سے ہم اپنی زندگی اور دنیا کا مفہوم متعین کرتے ہیں۔ مغرب کے ترجمان عرصہ دراز سے یہ بہانہ یا دعوے کرتے آ رہے ہیں کہ ان کے پاس دنیا کے مسائل کا حل ہے۔ مگر انہوں نے تو دل و دماغ پر اس طرح قبضہ کر لیا ہے کہ جو سوالات بھی اٹھائے جاتے ہیں وہ انہی کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں اور جواب اور جواب دینے کا انداز بھی انہی کے منشا کے مطابق ہوتا ہے یہی ان کی اجارہ داری ہے۔

باب 7

بے انجام جنگ

علم اور تشدد نئے زمرے

اگر مہاتما گاندھی نے اپنا لائحہ عمل مرتب کرنے کا کام انگریزوں کو دیا ہوتا تو پھر ان کے لیے ''مزاحمت کا مسلح' جدوجہد یا پارلیمانی اور انگریزوں کے منظور شدہ طریق اختلاف کا راستہ جو بھی اختیار کیا جاتا وہ انگریزوں کی منشا اور طریق کے مطابق طے ہوتا۔ گاندھی کا تمام اخلاقی اور نمایاں طریق کار نوآبادیاتی نظام علم میں مقید ہو جاتا۔ یہ نظام ''من وتو'' اور نوآبادیاتی رعایا اور حاکموں کے مقام و مرتبہ کے بارے میں ایک اپنا ہی اخلاقی آفاق رکھتا ہے۔ ایسی صورت میں ہمیں تو ایک مختلف قسم کے گاندھی کی ضرورت ہوتی جو مختلف طریق سے معاملات کو جوڑتا (۶۱)

انہوں نے جدیدیت پر تنقید کی تو کہا گیا کہ یہ مغرب پر ناپختہ قسم کا حملہ ہے۔ صنعتی تہذیب پر شدید تنقید کی تو کہا گیا کہ لگتا ہے کوئی ظلمت پسند قدیم زرعی معاشرے کی طرف رجوع کر رہا ہے۔ پھر گاندھی نے جسمانی سطح پر جو مظاہرے کیے، ان کا ٹھٹھا اڑایا گیا کہ سوت کاتنا، روزے رکھنا یہ سب زنانہ کام ہیں اور یہ انتہائی بزدل نسل کی غیر مردانہ سیاست ہے۔ گاندھی نے سیاست میں مذہب کو مرکزی مقام دیا تو اسے یہ کہہ کر رد کر دیا گیا کہ یہ ہندوستانی ذہن کی کمزوری ہے کہ وہ مذہب سے ہٹ کر کچھ سوچ ہی نہیں سکتا۔ گاندھی پر انتہائی زہریلی تنقید کرنے والوں نے یہاں تک کہا کہ اصل میں گاندھی ہی بابائے پاکستان

ہیں۔ ان سے قطع نظر مارکسٹوں کشادگی پسندوں اور جدیدیت کے حامیوں نے گاندھی پر ہونے والی اس تنقید کے تدارک کی طرف توجہ ہی نہیں دی جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان مختلف انداز میں سوچنے والوں کے پاس بھی نجات دلوانے والی سیاست نہ ہے نہ ہوگی۔ گاندھی کی مثال سے یہ نکتہ ملتا ہے کہ مغرب کی آفاقیت کو دوسرے آفاقی دائروں کے آس پاس لایا جا سکتا ہے... ہاں دوسرے آفاقی دائرے نہ کہ خاصیت یا انفرادیت۔ اس ملاپ سے ہم اختلاف کی وہ صورتیں نکال سکتے ہیں جو واقعی جبر سے مکمل طور پر پاک ہوں۔ میں نے گاندھی کے بارے جو نظریہ قائم کیا اور اس میں وزن ہے تو پھر ہم پر واضح ہو: پیشتر اس کے کہ ہم اپنا مستقبل ''مہذب'' مغرب کے صاحبان اقتدار کے حوالے کر کے انہیں اپنے پاسدار بنا لیں، یہ جاننا ضروری ہے کہ کیا اہل مغرب کے تصور مستقبل میں محض سچ بات کرنے کی کوئی گنجائش کوئی لچک ہے کہ نہیں۔

11 ستمبر یا نائن الیون کے بارے میں جو اتنا کچھ لکھا گیا ہے جو اتنے ڈھیر لگ گئے ہیں ان میں کچھ باتیں ایسی بھی ہیں جن کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا گیا اور یہی صفت امریکہ کو سارے دنیا سے الگ اور ممتاز کرتی ہے۔ امریکی روایات کے مطابق وہاں مہینہ پہلے گنا جاتا ہے اور تاریخ بعد میں، امریکہ اس بات کی ایک بڑی مثال ہے کہ لوگ اس سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور اسی شدت سے نفرت بھی کرتے ہیں مگر محض اس وجہ سے ہی نہیں بلکہ اور وجوہ بھی ہیں کہ دنیا کے باقی ملکوں میں نائن الیون نائن الیون نہ ہوتا۔ کوئی بھی بجا طور پر یہ سمجھ سکتا ہے کہ چھوٹے یونٹ (دن) سے بڑے یونٹ (مہینے) اور مہینے کی طرف سے سال کی طرف جانا منطقی سی بات ہے۔ مگر قاری اس کتاب میں پہلے کی گئی بحث کے حوالے سے امریکہ کی الگ رگ کے تابع ہے۔ جو اس بات سے شروع ہوتی ہے: ان کے ہاں ایک خدائی انصاف یا طریقہ ہے جو امریکی تاریخ پر بھی سایہ فگن ہے اور بیس بال میں لیگ چیمپئن شپ کو ''بھی عالمی سلسلہ'' سے نوازا جاتا ہے۔ پھر اسی ''خدائی'' حوالے سے ان کے ہاں ایک خاص قسم کی ہٹ دھرمی بھی پائی جاتی ہے مثلاً وہ دوسری دنیا کی طرح میٹرک سسٹم اختیار کرنے سے انکاری ہیں اسی طرح تاریخ اور مہینے کے لحاظ سے بھی وہ دنیا کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں۔ امریکی الگ رگ کے مظاہرے تو ہم اور بھی دیکھیں گے۔ بات صرف اس حد تک محدود نہیں کہ امریکہ کو استثنائی صورت میں ہی دیکھا جائے یعنی

جیسے انسانیت کی عام سی تاریخ میں ایسے استثنائی معاملات ہوتے ہیں۔ یہ طریقہ امریکیوں نے اس لیے بھی اختیار کر رکھا ہے کہ وہ رائج عام فہم کو بھی رد کر دیتے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ وہ عام فہم یعنی حس عمومی کو ایک ایسے جابرانہ پیچیدہ نظام تنقید کا حصہ سمجھتے ہیں جو کسی قسم کی پرکھ کو بھی قبول نہیں کرتا بلکہ عام فہم کے علاقائی یا مخصوص تصورات کے نام پر جبکہ ابھی اس کے تصور کو کوئی نام بھی نہیں دیا گیا ہوتا۔ امریکہ کی علیحدہ رگ تو یہ بھی ہے کہ امریکہ اپنے آپ پر کی جانے والی تنقید کو بدنیتی اور عناد قرار دینے کا کھلا لائسنس دے دیتا ہے۔

11 ستمبر کے دہشت گردوں کے حملوں کے بارے میں بڑی تحقیق ہو چکی جس میں بلا شرکت غیرے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ حملوں کے لیے غیر معمولی قسم کا نقشہ یا منصوبہ تیار کیا گیا تھا جس پر پوری طرح عمل کے لیے چند ایک سال تیاری کی گئی ہوگی۔ اس منصوبے کو آخری شکل افغانستان کے پوست کے کھیتوں میں دی گئی ہوگی۔ گوریلا تربیتی کیمپ میں فرینکفرٹ یا ہائڈل برگ کی سی مسجد میں یا یورپ کی کسی بڑی یونیورسٹی کے انجینئر نگ کے شعبے کے سیمینار ہال میں' اس جرم میں عجیب وغریب قسم کے تنگ نظریے والے مدرسوں کے دہشت گرد طالب علم ملوث ہو ہی نہیں سکتے۔ لیکن جارج ڈبلیو بش کے الفاظ میں ان طالب علموں کو امریکہ سے نفرت کرنا سکھایا گیا ہے۔ ان طیارہ اغوا کرنے والوں نے پہلے تو امریکی ہوائی اڈوں کی سیکورٹی کو غچہ دیا۔ چار مختلف جہازوں میں سوار ہوئے باکس کٹر اور چاقو بھی ساتھ لے آئے اور پھر لمبے سفر کے لیے پٹرول سے بھرے تین جہاز اڑے۔ تاکہ جب یہ طیارے ٹکرائیں تو پٹرول کی وجہ سے نقصان زیادہ ہو پھر جہاز کے اندر تو تکار سے بچنے کے لیے سواریاں بھی کم تھیں، ان کا نشانہ تھے ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹا گان۔ یہ ساری کارروائی کس منطق کے تحت اتنی باریک بینی سے مربوط کی گئی ہوگی اور پھر آپس کے اشارے کنائے علامتوں کا ایسا اہتمام کیسے کیا گیا ہوگا؟ دو جہاز امریکن ائیر لائنز کے تھے، دوسرے دو یونائیٹڈ کے۔ دو کا نشانہ امریکہ کی معاشی طاقت کا علامتی مظہر ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے دو ٹاور تھے اور دو (اہم بجا طور پر فرض کر سکتے ہیں) کا نشانہ امریکی حکومت کی طاقت کی مظہر بڑی تنصیبات تھیں۔ (پینٹا گا ن میں صرف ایک جہاز گرا دوسرے جہاز کے مسافر غالباً اغوا کنندگان سے بھڑ گئے۔ اس لیے وہ ایک کھیت میں جا گرا۔ اس بات کا پتہ اس جہاز کے بلیک بکس سے چلا) موت کا ہولناک رقص کرتے ہوئے یہ جہاز امریکہ کے ملٹری انڈسٹریل کامپلیکس سے ٹکرانے گئے تھے۔

کوئی شخص وثوق سے یہ نہیں کہہ سکا کہ دہشت گردوں نے نائن الیون کا دن ہی کیوں منتخب کیا۔ دہشت گرد ایک اور زمرہ یا خانہ سے جس میں انہیں دہشت گرد کے طور پر ڈالا گیا، انہوں نے عام سے مسافروں کی طرح اپنا سفر شروع کیا اور پھر انہیں کہیں سفر کے دوران جا کر اغوا کنندگان قرار دیا گیا۔ اس کے بعد پھر انہیں خودکش دہشت گرد قرار دیا گیا۔ یقیناً وہ اتنے بے خبر نہ تھے، انہیں پتہ تھا کہ امریکہ میں نائن الیون 911 ایمرجنسی پولیس کا نمبر ہے جس پر پولیس سے ہنگامی اور فوری مدد طلب کی جاتی ہے۔(۱) دہشت گردوں نے نائن الیون کا دن منتخب کر کے پولیس کے الفاظ میں خودکشی اور قتل دونوں جرم کیے اور اس نمبر نائن الیون کو بھی بحران میں مبتلا کر دیا۔ میں نے بحران کا لفظ بالارادہ استعمال کیا ہے۔ بنجامن نے لکھا ہے کہ ''ہم مسلسل بحرانی کیفیت میں پھنسے ہیں'' (۲) یہ لفظ کتنا مناسب ہے۔ دہشت گردوں نے جو کارروائی دکھائی ہے وہ معمول کی انتہائی غیر معمولی اور غیر معمولی کی انتہائی معمولی صورت ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ بحران تو بلقان، انڈونیشیا، الجزائر، عراق، افغانستان، سوڈان، یوگنڈا، چیچنیا، اسرائیل، فلسطین، کشمیر، شمال مشرقی ہندوستان، ہیٹی، کولمبیا سبھی کو ہلا کر رکھ رہا تھا۔ مگر امریکہ کو یقین کامل تھا کہ امریکی مکمل امن و امان اور سلامتی کے ساتھ زندگی گزارتے رہیں گے یا کم از کم اس ملک کی ضرورت کے مطابق اس کے اندر حفاظتی انتظامات ہیں جہاں باہر سے کوئی یلغار نہیں ہوتی صرف کبھی کبھی ہائی سکولوں میں قاتلانہ فائرنگ ہو جاتی ہے۔ اور لوگ قتل ہو جاتے ہیں اور یہ تقریباً سارے ہی امریکی شہروں میں ہوتا ہے۔ امریکیوں نے کبھی کم ہی سوچا ہے کہ ان کی معمول کی معمولی زندگی کو دنیا کے نسبتاً کم بدقسمت لوگوں نے کتنا غیر معمولی بنا رکھا ہے۔ نہ ہی ان امریکیوں نے یہ سوچا ہے کہ ہر رات بم دھماکوں، دھماکوں کی چمک اور آتش زنی کی وارداتوں کے درمیان زندگی کس طور سے گزرتی ہے۔ چنانچہ ان کے لیے 11 ستمبر کتنی پسپائیوں کی علامت بن گیا ہے۔ ان میں ایک معمولی سی یہ بات بھی ہے کہ 911 تو ایمرجنسی کا ٹیلی فون نمبر ہے اور دراصل 11 ستمبر یعنی 911 کے ذریعے دہشت گردوں نے امریکیوں کو صرف خبردار کیا ہے، جگایا ہے یا شاید معاملہ یہ ہے کہ ہم نے یہ بڑے کام تشدد پسندوں کے نام تو کر دیے مگر ان کی آوازوں میں جو بے قراری اور بے تابی ہے اس پر اپنے کان بند کر لیے ہیں؟ یہ کس قسم کے لوگ ہیں، انہیں کیا بنا دیا گیا ہے؟ ہم نے یہ نہیں سوچا اور یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ خود اپنی ہی جان کیوں لے لیتے ہیں؟

ممکن ہے کہ دہشت پسند 11 ستمبر کی کارروائی کے حوالے سے دراصل اس سے پرانے واقعہ کے بارے میں زیادہ باخبر ہوں۔ 11 ستمبر یا 9 نومبر کے ان اعداد کو دنیا اجتماعی طور پر ایک خاص حوالے سے دیکھتی ہے۔ 1936 میں جرمنی میں یہودیوں کے خلاف دہشت ناک کارروائی شروع کی گئی تھی۔ بہانہ یہ تھا کہ پندرہ برس پہلے اسی روز وہ بغاوت ناکام ہوئی تھی جس کے باعث ہٹلر برسر اقتدار آیا اور اسی اندر پیرس میں ایک معمولی جرمن سفارت کار ایک یہودی کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اسی شام، پروپیگنڈہ کے وزیر گوبلز نے ہٹلر کو بتایا کہ جرمنی کے بعض علاقوں میں یہودیوں کے خلاف فساد شروع ہو گئے ہیں اور مبینہ طور پر ہٹلر نے کہا کہ فسادات کی حوصلہ شکنی نہ کی جائے (یعنی فسادات ہونے دیئے جائیں) رؤل ہلبرگ نے کہا ہے کہ اس بیان کا صرف ایک ہی مطلب ایک ہی تشریح ہوسکتی تھی جو نازی پس منظر میں متحرک تھے۔ ان کو اشارہ تھا کہ فسادات بڑھاؤ۔ یہودی تاجروں پر حملے کیے گئے۔ ان کے عبادت خانے جلا دیئے گئے۔ ان کو بتا دیا گیا کہ نہ ان کی زندگی اپنی زندگی ہے اور نہ ان کی جائداد ان کی جائداد ہے (۳) آج بعض لوگ ایسے بھی موجود ہیں جو یہ دلیل دیتے ہیں کہ اگر نازی پارٹی یہودیوں کو قربانی کا بکرا بنانے کے لیے خود ریشٹاگ کی آتشزدگی کا ڈرامہ رچا سکتی ہے تو پھر یہ بھی ناممکن نہیں کہ امریکہ نے بھی اپنے ہی شہریوں کے قتل کی اجازت دے دی ہو۔ (۴)

ہمارے لیے یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں اور نائن الیون کی دوسری تاریخ (جرمنی والی تاریخ) سے بن لادن واقف تھا؟۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان دونوں واقعات کے حوالے سے نشانہ سامی النسل لوگ ہی تھے۔ لیکن اگر اسامہ بن لادن تاریخ کے اسی زاویے سے معاملہ کو دیکھ رہا تھا تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ بن لادن کو فرینک سٹین والے بھوت سے تشبیہ دی گئی۔ اسامہ بن لادن جب افغانوں کے دفاع کے حق میں بہادرانہ کردار ادا کر رہا تھا تو مغرب نے اس کی بڑی تعریف کی اور اسے ''بدی کی سلطنت'' سوویت یونین کے خلاف ایک خاص قسم کی انفرادیت قرار دیا مگر بندہ یہی کہہ سکتا ہے کہ بن لادن نے مغرب والوں سے ایک شعبہ میں حصہ داری کی ہے یعنی تاریخ میں نام کرنے کی شدید خواہش یا بھوک۔ 12 اکتوبر کو موہن داس گاندھی کا یوم پیدائش تھا اسی روز امریکہ نے افغانستان پر جنگ ٹھونس دی۔ اسی روز بن لادن کا ٹیپ کیا ہوا پیغام نشر کیا جس میں اس نے کہا کہ

مسلمان پورے اسی برس تک خوف و ہراس میں زندگی گزارتے رہے ہیں۔ اشارہ واضح طور پر خلافت عثمانیہ کی طرف تھا جسے پہلی جنگ عظیم کے بعد توڑ دیا گیا اور سرکاری طور پر یہ کارروائی 1923 میں ہوئی۔ اسامہ بن لادن نے اسی روز یہ بھی کہا کہ امریکی فوجیوں نے مقدس سرزمین عرب کی اپنے نجس قدموں سے بے حرمتی کی ہے ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اسامہ بن لادن کئی ہزاری کے حوالے سے خلافت عثمانیہ کی بحالی کے بارے میں سوچ رہا ہو۔

اسلامی بنیاد پرستی: مگر نام میں کیا رکھا ہے؟

نازی کیلنڈر میں سب سے مقدس دن 9 نومبر (نائن الیون) ہے جب تھرڈ ریش کے اختتام کا آغاز ہو۔ اس دن کی دہشت گردی کو ایک نام دیا گیا۔ ''کرسٹل ناچ'' ... شب ماہتاب ... یا ریزہ ریزہ شکستہ شیشوں کی رات۔ ہم 11 ستمبر کی دہشت گردی کو کیا نام دیں؟ جیسے ہی یہ واقعہ ہوا تو امریکہ نے فوراً ہی دہشت گردی کے اس واقعے کو اسلامی بنیاد پرستی کے نام سے منسوب کر دیا اور ساری دنیا نے اس کی پیروی کی، پھر اس کے فوراً بعد ہی بش انتظامیہ کے بعض افراد نے بڑے زور شور سے اس بات پر زور دیا اور اب تک اس پر زور دے رہے ہیں کہ اسلام کا نائن الیون کے واقعات سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم سب نے جارج بش کے ہونٹوں، اعلیٰ امریکی افسروں اور متعدد برادریوں گروہوں کے نمائندوں سے متعدد بار یہ سنا کہ اسلام تو امن پسند مذہب ہے اور اسلام کے نام پر دہشت گردی کر کے ان لوگوں نے اسی مذہب کی بے حرمتی کی ہے جس پر خود ایمان رکھتے ہیں اور جس کی خدمت کرنے کے دعویدار بھی ہیں۔ دریں اثنا بش نے ''تہذیب'' کی طاقتوں اور ''آزادی کے دشمنوں'' کے درمیان گھرے اختلافات کی توضیع کی تو اس کے کئی روز بعد تک امریکہ کی گلیوں میں مسلمانوں (اور دوسروں پر بھی) حملے ہوتے رہے، گویا اس طرح بالاتر سفید فام لوگوں کو ہلاشیری دے دی گئی، پھر بش نے واشنگٹن (ڈی سی) میں اسلامی مرکز میں بھی حاضری دی۔

اس کے باوجود بہت سے لوگ اب بھی یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ''اسلامی بنیاد پرستی'' کے معنی کیا ہیں؟ پھر کچھ لوگوں نے اس زمرے یا اصطلاح کی صحت کے بارے میں شک کا

اظہار کیا۔ بعض اوقات یہ بھی بتایا گیا کہ اسلامی بنیاد پرستی کی اصطلاح ہی غلط یا بے معنی ہے کیونکہ ان کی نظر میں اسلام تو خود بنیاد پرست ہے۔ بہرحال جو لوگ یہ نظریہ رکھتے ہیں وہ اس کے بارے میں سرعام کم ہی بولتے ہیں۔ تاہم عمومی طور پر اس کا جو مطلب لیا جا رہا ہے اس کو اس کی خامیوں اور غلط فہمیوں یا الگ مطلب کے حوالے سے بھی دیکھا جانا چاہیے۔ نیو یارک ٹائمنر کے اداریہ نگاروں نے نائن الیون کے فوراً بعد لکھا کہ اس حملہ کی ایک وجہ یہ ہے کہ دہشت گرد مذہبی جنونی ہیں۔ دوسرے یہ کہ حملہ آور مغربی تہذیب اور اس کی اقدار کو ناپسند کرتے ہیں۔ اور پھر انہوں نے مزید اضافہ کیا کہ "عالمگیریت کی وجہ سے جو لوگ پیچھے رہ گئے ہیں یہ ان کا اظہار ناراضگی ہے" (۸) اس سے ہم یہ سمجھے ہیں کہ معاملہ صرف دہشت گردوں کا نہیں بلکہ عالمگیریت کے باعث محروم ہونے والے مشرق وسطیٰ، انڈونیشیا جنوبی ایشیا، وسطی ایشیا کے سارے مسلمانوں کا ہے کیونکہ انہیں عالمگیریت سے کوئی فائدہ نہیں ہوا بلکہ عالمگیریت اور عالمی ادارہ ماحولیات کی طرف سے ان ممالک کی اقتصادی بہتری کے نام پر انتظامی نوعیت کی پالیسیوں کے نفاذ کے باعث انہیں الٹا نقصان ہوا ہے۔ نیو یارک ٹائمنر جو شے ماننے سے ہچکچاتا ہے وہ عسکریت پسند ہندو سینہ ٹھوک کر کہتا ہے۔ چنانچہ ہندو اتحاد کی ایک تنظیم اسی قسم کا عالمی نقشہ بنائے بیٹھی ہے جیسا نقشہ ہندو غلبہ قائم کرنے کے مبلغین یعنی وشوا ہندو پریشد (وی ایچ پی) اور راشٹریہ سیویمسوک سنگھ (آر ایس ایس) نے بنا رکھا ہے اور اس کا اعلان 12 ستمبر کی ایک پریس ریلیز میں کیا گیا۔

> "اسلامی بنیاد پرستی ہمیشہ ہمیشہ ہماری دنیا کو بیماری کی طرح لگی رہے گی کیونکہ اس کی جڑیں خود اسلام کے اندر بڑی گہرائی تک موجود ہیں۔ اسلامی بربریت پسند گروہوں نے شمالی افریقہ، یورپ اور ہندوستان کے براعظموں کو جس طور فتح کیا اور لوٹ مچائی، وہ گروہ کسی قسم کی اسلامی بنیاد پرستی کے ماننے والے نہیں تھے بلکہ اسلام کے ماننے والے تھے" (۹)

سکاٹ لینڈ کے ایک شاعر رابرٹ برنز نے کہیں لکھا ہے کہ ہمارے لیے سب سے بڑا تحفہ یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس شکل میں دیکھیں جس صورت میں ہمیں دوسرے دیکھتے ہیں۔ دوسروں کی زندگی کے انداز ہمیں دہشت پسندانہ نظر آتے ہیں اور یہ مفروضہ بھی کہ

مسلمانوں کے نزدیک دہشت گردی بھی زندگی کا ایک ڈھنگ بن چکا ہے۔ یہ سب کچھ مغربی اخبارات (پریس) اور یونیورسٹیوں (علمی اداروں) کے اندر بہت اندر جا کر بیٹھ گیا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں ایک اندازِ فکر کے مشرقِ وسطیٰ، اسلام اور دہشت گردی کے آثار سبھی کو ''عرب ذہن'' کا شاخسانہ قرار دیتا ہے۔ 1973 میں ایک مطالبہ کیا گیا تھا۔ نائن الیون کے فوراً بعد اسے کئی کئی بار چھاپا گیا اور نارتھ کیرولینا کے جے ایف کے سپیشل دار فیئر سینٹر اور سکول کے مشرقِ وسطیٰ کے مطالعہ کے شعبہ کے ڈائریکٹر کے پیش لفظ کے ساتھ چھاپا گیا۔ اس میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے عرب مسلمانوں نے اس لیے جذباتی شدت پسندی کا مظاہرہ کیا کیونکہ وہ صحرا کی سخت آب و ہوا میں رہتے ہیں۔ یہ مطالعہ رافیل پٹائی نے کیا۔ لکھا ہے ''عرب کی نظر میں انسان کی فطرت یہ ہے کہ کوئی بھی انسان اپنے آپ پر مسلسل ایک سا قابو نہیں رکھ سکتا۔ چنانچہ عرب یہ سوچتا ہے کہ اگر ذات پر قابو نہیں رہتا تو یہ کوئی ایسی انہونی بات نہیں ہے اور تب اسے یہ حق ہے کہ اگر اس کے مخاصمانہ جذبے کو ابھار دیا جائے تو پھر وہ کسی ایک غیر یا سبھی غیروں کو نتیجے کی پرواہ کیے بغیر اپنا نشانہ بنالے'' (۱۰) یہ اس کتاب کا حصہ ہے جس کی نائن الیون کے دو مہینے بعد نومبر 2001 میں واشنگٹن پوسٹ نے بڑی تعریف کی تھی اور کہا گیا تھا ''اس کتاب کا سچ بہت دیر زندہ رہے گا'' بعض لوگ یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ ہر چند پٹائی کے پڑھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر عرب' مسلمانوں اور اسلام کے بارے میں مغرب کا نکتہ نظر جاننے کے لیے اس کی تو کوئی خاص اہمیت اور حقیقت ہی نہیں۔ اس کی ذات بڑی چھوٹی ہے ہاں اسلام کے بارے میں کسی تحریر میں یہ ہونا لازم ہے کہ اسلام کی پیدائش کی سرزمین عرب کے مقابلے میں دوسرے ملکوں میں بسنے والے مسلمانوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے اور اسلام جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا کے تصور عالم اور خلاق سماجی اور ثقافتی تعلقات میں حصہ دار بن کر آیا۔ عرب ذہن کو سمجھنے کے لیے اگر ہم پرنسٹن انسٹی ٹیوٹ فار ایڈوانسڈ سٹڈی کے معروف عالم برنارڈ لیوی کے خیالات سے رجوع کریں۔ میرے خیال میں کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ مشرقِ وسطیٰ کے بارے میں برنارڈ لیوی کے خیالات بڑے مستند سمجھے جاتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ امریکی سامعین کے سامنے وہ مشرقِ وسطیٰ کی ترجمانی کر رہا ہے۔ کوئی پندرہ برس پہلے برنارڈ لیوی نے ''مسلم غصے یا ناراضگی کی جڑیں'' (۱۱) کے عنوان

کے تحت اپنے خیالات پیش کیے تھے جو بعید الفہم تھے۔ پٹائی نے عرب ذہن کے بارے میں جو نقشہ پیش کیا تھا وہ پھر بھی زیادہ روشن اور واضح تھا۔ لیوی نے فتویٰ دیا تھا کہ مسلمان جدید دنیا میں رہنے کے اہل ہی نہیں ان کے سیاسی اور سماجی ادارے بوسیدہ ہیں۔ انہوں نے اقتدار کھویا اور اس کھوئے اقتدار کے بعد سنبھل نہ سکے۔ اور پھر ان کے عالمی سیاسی سرگرمی کے محور سے نکل جانے کے باعث یہ صورت ہوگئی ہے۔ یقین کریں وہ علم الکلام کا پہلا مغربی عالم نہیں تھا جس نے اسلام کو ظلمت پسندوں کا دین قرار دیا اور جنہوں نے اس دین کو بڑے بے ڈھنگے انداز میں جدیدیت کا حصہ بنانے کی کوشش کی۔ کسی کو بھی یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ برنارڈ لیوی کے ان خیالات کو امریکہ کے بااثر اور تعلیم یافتہ لوگوں میں وسیع پیمانے پر رسائی حاصل نہیں ہے۔ فرانسس فوکویاما کو مستقبل کی آواز اور پیش گو سمجھا جاتا ہے جس کی بنا پر وہ کچھ عرصہ پہلے تک واشنگٹن کو بڑا عزیز تھا۔ اس نے ستمبر گیارہ کی واردات کے بعد بڑے یقین سے کہا تھا کہ ''اسلام واحد ثقافت ہے جو وقتاً فوقتاً مگر باقاعدگی کے ساتھ اسامہ بن لادن جیسے لوگ اور طالبان جیسے گروپ پیدا کرتی رہتی ہے۔ جو جدیدیت کو کلی طور پر مسترد کر دیتے ہیں۔'' مزید یہ کہ ''موجودہ تمام ثقافتی نظاموں میں سے عالم اسلام میں جمہوری ملکوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔'' اسے یقین ہے کہ ''پسماندہ ممالک کی راہ میں کوئی ایسی رکاوٹ نہیں ہے کہ وہ اس بلندی پر نہ پہنچ سکیں جس پر آزاد منڈی کی معاشیات والے ممالک نے قبضہ کر رکھا ہے اور فوکویاما کا خیال ہے کہ مسلمانوں کو اس ضمن میں یعنی چوٹی تک پہنچنے والوں میں شامل نہیں سمجھنا چاہیے۔ (۱۲)

آوازوں کے اس کورس میں اب بھورے آدمیوں کی آوازیں بھی شامل ہونا شروع ہوگئی ہیں۔ نیوز ویک انٹرنیشنل کے ہندوستانی نژاد ایڈیٹر فرید ذکریا نے لیوی کے مضمون مسلمانوں کے غصے کی جڑیں کے حوالے سے اپنے مضمون ''غصے کی جڑیں'' میں لکھا ہے کہ اسلامی بنیاد پرستی فاشزم، نازی ازم حتیٰ کہ امریکہ کی پاپولزم جیسی جنس ہے۔ مسلم معاشروں کے بارے میں اس قسم کی یک طرفہ لن ترانی بغیر کسی ایسے ثبوت اور شہادت کے کی جاتی ہے جو مغربی صحافت کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے۔ اور پھر انہیں نہ تو جوابی تنقید نہ ہی گوشمالی کا خوف ہوتا ہے۔ ذکریا کا یہ بھی کہنا ہے کہ ایک تو بے روزگار نوجوانوں میں غصہ اور مایوسی پائی جاتی ہے دوسری طرف بنیاد پرست تنظیمیں مختلف سماجی، ثقافتی اور سیاسی اداروں میں انہیں ملازمتیں فراہم

کرتی ہیں جو ریاست فراہم نہیں کر سکتی۔ ان دو وجوہ کی بنا پر ''عہد وسطیٰ کے یہ لوگ'' نوجوانوں کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ (۱۴) کہا جاتا ہے کہ سعودی عرب' پاکستان اور افغانستان کے مدرسوں سے ہزاروں لاکھوں بچے اسلامی تاریخ کی انتہائی تنگ نظر تعبیر سے لیس جدید دنیا کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے نکل آتے ہیں۔ ڈونلڈ رمز فیلڈ کو اس کی جارحیت کی بنا پر امریکی انتظامیہ نے نوکر شاہی کا جنگ باز بنا دیا ہے جو اپنی بہادری اور بقا کی صلاحیت کے باعث گزشتہ پانچ دہائیوں میں سیاسی طوفانوں کا بڑی پامردی سے مقابلہ کر رہا ہے۔ اس نے 2003 میں عراق کی جنگ کی صورت حال کے بارے میں سوال اٹھایا۔ سوال یہ ہے کہ مدرسے اور انقلابی قسم کے مذہبی راہنما جتنی تعداد میں ہمارے خلاف دہشت گردوں کو بھرتی کرنے، تربیت دینے اور کھڑا کرنے میں کامیاب ہو رہے کیا ہم اتنی ہی تعداد میں انہیں قتل کر رہے ہیں یا روک رہے ہیں یا انہیں راغب کر رہے ہیں کہ وہ یہ طریقہ اختیار نہ کریں؟ (۱۵) مدرسہ کا لفظ ہی ساری صورت حال بیان کر دیتا ہے۔ اس کے لیے مزید تفصیل یا تشریح کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس طرح مدرسہ کے حوالے سے متذکرہ الزام ہی عالمی بنک کی 2005 کی رپورٹ کے حوالے سے بے معنی ہو جاتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ پاکستان میں صرف ایک فیصد طالب علم مدرسوں سے تعلیم حاصل کرتے ہیں اور دھیان رہے کہ عالمی بنک ایسی تنظیم نہیں جس پر یہ الزام لگایا جا سکے کہ وہ جنوب (پسماندہ ممالک) کا ہمدرد ہے۔ اس رپورٹ کے مرتب کرنے والوں نے 1998 کی مردم شماری اور 1991 سے 2001 تک کی بار بار کی خانہ شماری سے یہ اعداد و شمار حاصل کیے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ پاکستان اور افغانستان کی سرحد پر ایسا علاقہ ہے جہاں مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد بہت ہی زیادہ بتائی جاتی مگر وہاں پر بھی مدرسوں کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کی کل تعداد 7.5 (ساڑھے سات فیصد) ہے۔ روایت میں کہا گیا ہے کہ اخبارات اور اداروں کی طرف سے جو اعداد و شمار دیئے جاتے ہیں ان کی تصدیق، دوسرے قابل اعتبار ذریعوں سے کبھی نہیں جاتی اس لیے رپورٹ کرنے والوں نے ان اعداد و شمار کے بارے میں کہا کہ یہ بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیے جاتے ہیں۔ (۱۶) ذکریا نے نائن الیون کے حملے کے فوراً بعد تحریر لکھی اس لیے اس سے کچھ رعایت کی جا سکتی ہے کہ اسے تفتیشی صحافت کا کچھ زیادہ علم نہ تھا۔ 11 ستمبر والے کمشن نے تین سال بعد 2004 میں رپورٹ دی تھی اس کے باوجود

اس میں پھر اس بات پر اصرار کیا گیا کہ پاکستان میں لاکھوں ایسے خصوصاً غریب خاندان ہیں جو اپنے بچوں کو پڑھنے کے لیے مدرسوں میں بھیجتے ہیں۔ (۱۷) ان کی نظر میں مدرسہ سے مراد یہ ہے کہ جب لوگوں کے سارے وسائل ختم ہو جاتے ہیں۔ راہیں بند ہو جاتی ہیں تو وہ پھر بچے اس صحرا میں بھیج دیتے ہیں جہاں دہشت گردی کو زبردست فروغ ملتا ہے۔

سلمان رشدی کا تو بس اتنا سا تجزیہ تذکرہ ہی غیر ضروری ہے۔ رشدی حال ہی میں امریکہ آیا ہے۔ چنانچہ خود کو نیویارک کا باسی سمجھتے ہوئے اور خمینی کے فتوی کے حوالے سے اپنے تجربے کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس نے کہا کہ امریکہ پر بائیں بازو کی طرف سے ایسی سخت تنقید نہیں ہونی چاہیے تھی خصوصاً جب یہ ملک خود انتہائی سوگ کی کیفیت میں ہے۔ اس مرحلے پر امریکہ کے بارے یہ بھی نہیں کہنا چاہیے کہ شائد خود امریکی پالیسیوں نے بھی دہشت کی ثقافت کو فروغ دیا ہو۔ (مجھے خبر نہیں کہ کبھی رشدی نے ان لاکھوں لوگوں کے بارے میں گرم جوشی کا اظہار کیا ہو جو نوآبادیاتی نظام اور مغرب کی توسیع پسندی کی جنگوں کے نشانہ نہ بنے اور پھر انہیں یہ بھی کہا گیا کہ چونکہ وہ اپنے آمر حکمرانوں کے خلاف لڑنے کے لیے تیار نہ تھے اس لیے انہوں نے دراصل خود اپنے آپ پر ظلم کیا ہے) بنیاد پرستوں کو غلط ثابت کرنے کے لیے رشدی بڑے زور کے ساتھ کہتا ہے۔ ''جو کچھ حقیقت ہے ہمیں اس پر سمجھوتہ کر لینا چاہیے مثلاً سرعام بوسہ بازی، سؤر کے گوشت کے سینڈوچ، اختلاف، انتہا درجے کی مخالفت، لٹریچر، فراخ دلی.... فلمیں، موسیقی، آزادی خیال، حسن اور محبت''۔ رشدی کو خیال ہے کہ ان باتوں سے یہ نہ سمجھا جائے کہ رشدی کچھ زیادہ ہی حواس باختہ ہو گیا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا ''دنیا کے وسائل کی مساوی تقسیم بھی ضروری ہے۔'' (۱۶) رشدی نے سؤر کے گوشت کے سینڈوچ کے بارے میں بڑی رغبت کا اظہار کر کے اس بات کا بھی ثبوت دیا ہے کہ وہ ثقافتی اعتبار سے مسلمانوں سے کس قدر کٹا ہوا ہے۔ اور اس کے ساتھ اس کی نظر میں اسلام کا مقام یہ ہے کہ بہت سے مسلمانوں کے نزدیک اسلام صرف وہ خطبہ ہے جو ان کے پسندیدہ مولوی دیتے ہیں، دوسرے جدید معاشرے سے عمومی نفرت یعنی اس حوالے سے موسیقی انکار خدا اور جنس اور یہ نفرت (اور خوف) کہ ان کے اردگرد جو کچھ ہے اس پر بھی ان لوگوں کا قبضہ ہو جائے گا جو مغرب کے رنگ میں رنگے ہوئے یعنی ان کے اردگرد آزادگان کا گھیرا تنگ ہو جائے گا، یہ ساری بات رشدی نے نیویارک ٹائمز میں اپنے ایک ایڈیٹوریل میں لکھی، نیویارک ٹائمز کو بھی ایک دم رشدی پر بڑا

پیار آ گیا ہے۔ شیطانی آیات (سیٹینک ورسز) کے مصنف رشدی نے واضح طور پر کہا کہ 11 ستمبر سارا کیا دھرا اسلام کا ہے۔ اور ذمہ داری ایک ایسے اسلام پر ہے جو جدید سانچے میں ڈھلنے میں ناکام ہو گیا ہے۔ رشدی ایک ایسے شخص کے انداز میں لکھتا ہے جو الزام سے بری ہو گیا ہو اور اس کی عزت بحال ہو گئی ہو۔ لکھتا ہے اگر دہشت گردی کو ختم کرنا ہے تو عالم اسلام کو لازماً سیکولر اور انسانیت پسند اصول اپنانے ہوں گے انہی اصولوں پر جدیدیت قائم ہے۔ ایسا کیے بغیر مسلمان ملکوں کی آزادی محض ایک دور افتادہ خواب ہی رہے گی"۔ (۱۹)

بعض صاحب حیثیت بھورے رنگ مسلمانوں نے جب یہ کہنا شروع کیا کہ نائن الیون کے حملے اسلام ہی کا شاخسانہ ہیں تو اس سے طاقتور سفید فام بندے کو یہ کہنے کا حوصلہ مل گیا کہ اسلام اور دہشت گردی کا بڑا گہرا رشتہ ہے۔ یہ ایک دوسرے کے شانہ بشانہ ہیں اور اس سے انکار کرنا ایک فریب اور دھوکا ہے۔ ذکریا اور رشدی نے جس قسم کے جذبات کا اظہار کیا ہے انہیں نوآبادیات کے عہد کے بے خبر قسم کے نوآبادیاتی باشندے کی ہوائی بات نہیں سمجھنا چاہیے۔ بلکہ ہندوستانی معاشرے کے پڑھے لکھے، درمیان طبقے اور شہروں کے لوگ ان کے کہے کو بڑی حد تک سچ سمجھتے ہیں اسی طرح وہ ہندوستانی بھی جو بیرون ہند مختلف علاقوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ (۲۰) میں نے پہلے بھی عرض کیا کہ ان لوگوں کے اس قسم کے جذبات کے ساتھ مغرب والے بڑے ہمدرد پائے جاتے ہیں۔ اور یوں یہ تصور کیا جاتا ہے کہ یہ ثقافت (اسلام) ہی دہشت گردی کا منبع ہے۔ ہم سب نے سن رکھا ہے کہ اسلام میں عورتوں کی بڑی بے قدری ہے۔ جس کے وحدانیت کے بے لچک تصور والے جنونی لوگ پیدا کیے اور خود یہ ثقافت بھی بے آب و گیاہ ماحول کی پیداوار اور مدرسوں کی پرداختہ ہے۔ چنانچہ اس طرح وہ لوگ بھی جو دہشت گردی میں صرف بنیاد پرستوں کو ملوث کرنا چاہتے تھے آخر اسلام کو ملوث کر دیتے ہیں۔ اب یہ بات بڑی واضح صورت میں نظر آ رہی ہے کہ محض پند و نصائح اور لیپا پوتی سے اسلام کو بری الذمہ نہیں قرار دلوایا جا سکتا۔ اسلام کو اسلامی بنیاد پرستی سے جس انداز سے ملایا جا رہا ہے یہ بڑا اہم مسئلہ ہے اور اس کا یہ حل نہیں کہ اس کے لیے صرف لفظ استعمال کیے جائیں۔ یا دنیا بھر کے مذاہب کی آفاقی خوبیوں اور صفات پر بڑی لمبی چوڑی جذباتی تقریریں کی جائیں اور اسلام کا سچا اور پرامن چہرا پیش کیا جائے یا یہ کہا جاتا ہے کہ مغرب نے اسلام کے جہاد کو بنیادی

طور پر صحیح طرح سے سمجھا ہی نہیں ہے۔ ہندوستان کے مسلمان ادیب اور سیاست دان رفیق ذکریا جو نیوز ویک کے فرید ذکریا کے والد ہیں) ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ متشرقین میں اکثر یہ کہا جاتا تھا کہ ''اصلاح شدہ اسلام اسلام نہیں'' رہتا (۲۲) اس پس منظر میں اسلام اور عیسائیت میں خرابی تعلقات کی ایک پوری لمبی چوڑی تاریخ ہے۔ چنانچہ جو لوگ چاہتے ہیں کہ ان دونوں کے ماننے والوں میں ٹکراؤ ہو وہ بھی سمجھتے ہیں کہ جدید مغرب کے لیے اسلام ایک بڑا درد سر ہے۔ بش بے خبر آدمی ہے اور اس کے بے خبر ہونے کے بارے میں کسی بڑی دلیل کی ضرورت نہیں، چنانچہ 11 ستمبر کے واقعہ کے تھوڑے عرصے بعد ہی اس نے یہ کہا کہ ''دہشت گردی کے خلاف'' مقدس جنگ کرنا پڑے گی۔ بش کے مشیروں کو اس لفظ ''کروسیڈ'' میں چھپے بے شمار خطرات کا انداز ہی نہیں تھا۔ اس کے لیے دوسرا کوئی لفظ استعمال کیا جانا تھا جس طرح دہشت گردی کے خلاف کارروائی کو''لامحدود انصاف'' کہا گیا پھر لامحدود انصاف کی جگہ لفظ''بقائے آزادی کے لیے'' استعمال کیا جانے لگا۔ یہ تبدیلی اس وقت کی گئی جب انہیں بتایا گیا کہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ آخری انصاف یا لامحدود انصاف صرف اللہ کرے گا۔ دہشت گردی کے حوالے سے جس قدر گفتگو ہو رہی ہے اور جس نوع کے الفاظ استعمال کیے جا رہے ہیں، ان کے معنوں میں کچھ نقائص بھی ہیں اسی طرح اسلامی بنیاد پرستی اور اسلام ان دو لفظوں کے واقعی دو الگ الگ مفہوم دینے کے لیے بڑی زبردستی اخلاقی اور تجزیاتی کوشش کرنا پڑے گی ورنہ ان دونوں لفظوں سے صرف اور صرف ایک ہی مطلب لیا جائے گا۔ تاہم اس وقت جو فضا ہے اس میں یہ امید نہیں کہ مجوزہ کوشش کامیاب ہو سکے۔

یہ بات بھی ہے کہ امریکی سرکاری افسروں نے اسلام کے نام پر دہشت گردی کرنے اور اسلام کے درمیان خط امتیاز کھینچنے کی کوئی بہتر اور معقول کوشش نہیں کی بلکہ بعض سیاسی فائدے کی خاطر ان کو الگ الگ کیا ہے۔ امریکی انتظامیہ دہشت گردوں کے خلاف لڑنے والی ایک مخلوط شکل بنا رہی تھی اور ہر کسی کو یقین تھا کہ اس لڑائی میں ''مسلم قوموں'' کو بھی ساتھ لے کر چلنا ہے... اب سوال یہ ہے کہ جب اس مخلوط اتحاد میں زیادہ تر مغربی یورپی ممالک آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور شمالی امریکہ کے عیسائی شامل ہیں تو کیا ہم ان کے لیے لفظ عیسائی قوم یا قومیں بھی استعمال کرتے ہیں؟ اور اس مخلوط صورت کا مدعا یہ ہے کہ بن لادن اور القاعدہ کو عدالت انصاف میں لایا جائے؟ تاہم جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ امریکہ کا'

انقلابی ایران، طالبان اور انقلاب پسند مسلح گروہوں حزب اللہ اور حماس کے خلاف جارحانہ رویہ بھی اس کی اسلامی بنیاد پرستی کے خلاف جنگ ہی کا ایک حصہ ہے اور پھر یہ بات سامنے آتی ہے کہ عراق کی خلیج کی جنگ کے دوران تباہی، عراق پر ظالمانہ پابندیوں کے اطلاق کے باعث دس لاکھ عراقیوں کی موت کے علاوہ بوسنیا کے مسلمانوں کی حالت زار سے امریکی لاپرواہی سے صرف ایک ہی مطلب اخذ کیا جا سکتا ہے کہ امریکہ دراصل سارے عالم اسلام سے برسر پیکار ہے۔ آخری تجزیہ کریں تو لگتا ہے کہ مغرب دہشت گردی کی ساری ذمہ داری مسلم اقوام پر ڈالنا چاہتا ہے اور پھر اسلام کے اندر بھی بعض رجحانات اسی نوعیت کے ہیں اس پس منظر میں تہذیبوں کے ٹکراؤ کی جو بات برنارڈ لیوی نے کی (شیموری تو سمویئل ہنٹنگٹن کی ہوئی) اس کو گیارہ ستمبر کے بعد غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی۔ (۲۳) ہوسکتا ہے کہ ہنٹنگٹن اور اس جیسے سوچنے والے طالبان اور القاعدہ کو کسی بھی تہذیب کا نمائندہ نہ سمجھیں مگر اس کے برعکس وہ اسلامی بنیاد پرستی کو اسلام ہی کی ایک صورت سمجھتے ہیں۔ مبصرین نے اکثر لکھا کہ دہشت گردی کرنے والے اپنے آپ کو اعلیٰ درجے کا مسلمان سمجھتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ جہاد کر رہے ہیں اگر اس میں کام آئے تو شہید ہوئے اور سیدھے جنت میں جائیں گے جہاں بے حساب شراب اور غزال چشم دوشیزائیں ملیں گی۔

بنیاد پرستی: خاندانی مشابہتیں

تہذیبوں کے ٹکراؤ (1993) کے ابتدائی عذر لنگ یا گریز میں ہنٹنگٹن نے چینی اور اسلامی دو تہذیبوں کا نام لیا جن کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ مغرب کو انہی سے بھڑنا پڑے گا۔ اس وقت امریکہ پہلے ہی عراق سے ٹکرا چکا تھا۔ افغانستان میں اسلامی قوتوں کا ابھار بھی بڑا واضح تھا اور 1979 میں آئت اللہ خمینی کی قیادت میں آنے والے ایرانی انقلاب کے بھی ہنٹنگٹن کو ایسے آثار نظر آنے لگے جن سے اس نے نتیجہ نکالا کہ مغرب اور عالم اسلام کے درمیان تعلقات اچھے نہیں ہوں گے۔ امریکہ کو پہلے ہی دہشت گردی کے خطرے محسوس ہو رہے تھے۔ اس لیے امریکہ اور عالم اسلام کا معاملہ خبروں کا موضوع بنا رہے گا جبکہ چین کی تیز معاشی ترقی کے باعث باقی دنیا آہستہ آہستہ اس سے خطرہ محسوس کر رہی ہے۔ اور چین عالمگیر جدیدیت میں ایک دوسرے انداز میں شامل ہو رہا ہے۔ اس طرح دو متبادل صورتیں سامنے آئیں۔ ہنٹنگٹن کو اپنا تفصیلی موقف پیش کیے دس سال سے

اوپر ہو گئے۔ اینگلو امریکی اخباروں نے اس عرصہ میں یہی کہا کہ جہاں تک چین کا تعلق ہے اس سے مغرب کا ٹکراؤ معاشی میدان (فالٹ لائن) میں ہوگا اور پھر جب ان کی نظر عالم اسلام خصوصاً مشرق وسطیٰ کی طرف گئی تو وہاں انہیں تصادم سیاسی بنیادوں پر ہوتا نظر آیا۔

ذرائع ابلاغ میں موجود ھنٹنگٹن کے پیروکاروں نے عالم اسلام کے بارے میں یہ طرح اٹھائی کہ وہاں پہلے تو ان دو گروہوں کے درمیان خانہ جنگی ہو گی جن میں سے ایک جدیدیت میں یقین رکھتا ہے اور اسلام کو جدید مغربی معیار کے مطابق ترقی پسند بنانا چاہتا ہے جبکہ دوسرا قرونِ وسطیٰ کا پرستار ہے اور جو یہ سمجھتا ہے کہ جس صورت میں اسے ابتدائی زمانے میں عروج حاصل ہوا تھا اور جس میں خلافت عثمانیہ جیسی عظیم الشان سلطنت وجود میں آئی تھی وہی صورت اب بھی اختیار کی جائے۔ (۲۵) جدیدیت پسند اسلام میں رہتے ہوئے مغربی انداز کے نمائندہ ہیں اور انتہا پسند مسلمان ان کے سخت خلاف ہیں مگر وقتاً فوقتاً ان کا نشانہ مغرب بنتا ہے جو ان کی نظر میں جدیدیت پسندوں کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔ یہ جدیدیت پسند دراصل دہشت گردوں کا ہی دبا ہوا نصف حصہ ہیں اور شائد اسی لیے اس کے بارے میں اتنی نفرت کی جاتی ہے۔ مگر امریکی مبصرین، دانشوروں اور کمانڈر انچیف کو اس تجزیہ سے ہٹ کر ایک اور طرح کا خبط ہے۔ ان کے نزدیک زیادہ واضح تصور ''بدکار'' کا ہے یا وہ کھلے اور کشادہ معاشروں کے حامی لوگوں کے ان مخالفین کے خلاف ہیں جو 'تہذیب' کی بجائے انتظام اور خلفشار پھیلانے پر مائل ہیں۔ (۲۶) تاہم اس کے اخلاقی پہلو پر شک نہیں کیا جا سکتا اور یہ ضروری ہے کہ بد اور ظلمت پسندوں کے ساتھ ہونے والی جنگ میں ''آزادی'' کے علمبرداروں کی حمائت کی جائے۔ ہندوستان میں تھامس فریڈ مین کے ماننے والوں کی فوج ظفر موج ہے اس کے الفاظ میں صورت یہ ہے ''اس خانہ جنگی میں ہمیں اچھے لوگوں کو مضبوط کرنا چاہیے۔ (۲۸)

میں نے اور میرے علاوہ متعدد دوسرے لوگوں نے دیکھا کہ دہشت گردی کے معاملات کو کس طرح جنگ میں بدل دیا گیا اور پھر جب جنگی زبان سے بھی رجوع کیا جائے گا تو اس میں سے کیسے کیسے حوالوں سے کیسے کیسے مطلب نکلیں گے اور بلاشبہ یہ سارے مطلب کسی نہ کسی حوالے سے ان معاملات سے جڑے ہوں گے۔ مثلاً اسلام کے اندر خانہ جنگی، اسلام اور مغرب کے درمیان جنگ اور مختلف ''طرز حیات'' کے درمیان جنگ۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ بہت سے نوجوان مسلمان مردوں نے دہشت گردی کو طرز

حیات بنا لیا ہے مگر یہ مفہوم ہی دراصل ''امریکی طرزِ حیات'' کے مقابلے میں بنایا گیا ہے۔ اور پھر اس میں بھی بڑی حساس درجہ بندی اور مشکل معنویت کی ضرورت ہے۔ 11 ستمبر کی شام بش نے اپنے خطاب میں لگی لپٹی رکھے بغیر کہا تھا اور ہمیں یاد ہونا چاہیے کہ ''ہمارے ہم وطنو، شہریو دہشت گردوں کی بالارادہ تباہ کن کارروائیوں کے ذریعے دراصل ہمارے طرز حیات اور ہماری آزادی پر حملہ کیا گیا ہے (طرز حیات پر زور) (۲۹) چند روز بعد بش نے ایف بی آئی (فیڈرل بیورو آف انویسٹی گیشن) کے نمائندہ کو بتایا کہ ''امریکہ دنیا کا سب سے زیادہ آزاد ملک ہے'' اس کا خاص مطلب ہے جس سے مراد یہ ہے کہ امریکہ ایک ایسی ریاست ہے جو ایسی بنیادی اقدار پر استوار کی گئی ہے جو نفرت، تشدد، قاتلوں اور برائی کو مسترد کرتی ہے'' (۳۰) چار ہفتے بعد امریکہ نے افغانستان کے خلاف فضائی جنگ شروع کر دی تھی، ٹونی بلیئر ابھی تک معصوم امریکیوں کے قتل پر دکھ کا اظہار کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ یہ ''حملہ ہماری آزادی اور ہمارے طرزِ زندگی پر ہوا ہے'' (۳۱)

برائے دلیل امریکی طرزِ حیات کوئی ایک نہیں ہے مگر ذرائع ابلاغ (پریس اور وژول میڈیا) پر اگر سرسری سی نظر ڈالی جائے تو پتہ چلے گا کہ امریکی مبصرین کی بھاری اکثریت نے یہی کہا کہ امریکہ آزادی، جمہوریت اور جذبہ ہمدردی کی ابدی اقدار کا پاسدار ہے۔ ان اقدار کے بغیر کسی بھی شخص کو مہذب نہیں کہا جا سکتا۔ 11 ستمبر کے بعد مہینوں تک بش نے اپنی ریڈیو تقریروں، سی آئی اے کے سامنے اور بزنس مینوں کے فوروں کے سامنے تقریروں میں مسلسل انہی الفاظ کی جگالی کی اور کہا کہ مہذب دنیا اور آزادی حملے کا نشانہ ہیں۔ امریکہ ایک اچھا اور ہمدرد ملک ہے۔ امریکیوں کی اپنی اخلاقی اقدار ہیں امریکی انسانی زندگی کے تقدس کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ جبکہ ان کے مخالفین بے چہرہ بزدل اور بدکار غاروں میں چھپ کر ''نئی قسم کی جنگ'' لڑ رہے ہیں۔

ایک بہت بڑا سوال پیدا ہوا کہ ''آخر دہشت گرد امریکہ سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں''؟ اور کانگرس کے سامنے بش نے جواب دیا ''انہیں ہماری آزادیوں... ہماری مذہبی آزادی، تقریر کی آزادی، ہماری ووٹ دینے اور اجتماع کی آزادی اور باہمی اختلاف کی آزادی... سے نفرت ہے۔ اب ہم یہ پوچھ سکتے ہیں کہ کانگرس کے 430 منتخب ارکان میں سے صرف ایک رکن (باویرالی ری پبلکن ڈی سی اے) نے اس وقت مخالفت میں ووٹ ڈالا جب کانگرس کی طرف سے صدر کو جنگ کرنے کے مکمل اختیارات دیئے جا رہے تھے۔

ہم یہ بھی پوچھ سکتے ہیں کہ کیوں صرف ایک سینیٹر (جوزف بڈن ڈی ڈی ای) نے بعد میں صرف تجویز دی (مثبت انداز میں مطالبہ نہیں کیا) کہ جنگ زدہ ملکوں میں امریکہ کی طرف سے بمباری کی کارروائی پر امریکہ پر معمول کی تنقید ہو سکتی ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ ہم جدید ٹیکنالوجی کی بنا پر دھونس دھاندلی کر رہے ہیں'' صرف اتنی سی بات کہنے پر سینیٹر کو اپنے دوستوں کی لعن طعن سننا پڑی۔ اسے کہا گیا کہ اس کی باتیں ''بے حرمتی اور جہالت'' کے برابر ہیں۔ (۳۲) بالکل اسی لہر میں ولیم بینٹ نے مابعد جدیدیت کے ماننے والوں، ضافیت پسندوں اور امن پسندوں اور دوسرے ایسے ہی لوگوں پر جو جدید عہد کے امریکی سامراج پر تنقید کرتے ہیں گوشمالی کرتے ہوئے اپنے قارئین کو یقین دلایا ہے کہ امریکہ کی بنیادی انسانی حقوق اور جمہوریت کی حمائت اور پاسداری دنیا کے لیے ہمارا تحفہ ہے۔''اور یہ کہ امریکہ کو اس لیے سزا نہیں دی گئی کہ امریکہ بڑا ہے بلکہ اس لیے کہ ہم اچھے ہیں'' (۳۳) بس، بینٹ اور ان جیسے بہت سے لوگ امریکہ کی خود پرستانہ صالحیت کا بڑا چرچا کرتے ہیں۔ پھر جب وہ اس صالحیت کو امریکی غلبہ کی خاطر نظریاتی رنگ دے دیتے ہیں تو دنیا میں بہت سے لوگ یہ مطلب نکالتے ہیں کہ اس طرح امریکہ کو دراصل خود دہشت گردی کرنے کا لائسنس دے دیا گیا ہے۔

اگر امریکی طرز حیات کے بارے میں یہ انتہائی بیمار قسم کی جذباتیت کچھ لوگوں کے لیے خفت کا باعث ہے تو اس کے مقابلے میں خود کو صحافیوں اور مقبول چیزیں لکھنے والوں سے بلند تر سمجھنے والے مبصرین نے معاملات کو ذرا زیادہ ہی پیچیدہ اور مشکل صورت میں پیش کیا ہے، مثلاً امریکہ میں تاریخی تحقیقات کو بہتر بنانے کے لیے عوامی اور پیشہ ورانہ حوالے سے بنائی گئی معروف ادارے کی امریکی ہسٹاریکل ایسوی ایشن کے سابق صدر (1997) جائس ایپلبائی نے ایک اداریہ لکھا جس میں بتایا گیا کہ خرد افروزی یا روشن ضمیری کی وراثت کی وجہ سے جدید مغرب کا راستہ ان لوگوں سے جدا ہو گیا ہے جو ظلمت پسند اور متشدد ہو گئے ہیں۔ امریکی انقلاب کی دانش ورانہ تاریخ کا بار بار غیر معمولی اعتماد کے ساتھ کہنا ہے کہ تین سو سال پہلے مسلم ثقافت، مغربی ثقافت تو نہیں تھی۔ یعنی یہ الگ الگ ثقافتیں تھیں۔ مسلم ثقافت شخصی آزادی اور انفرادی مفادات پر مبنی معیشت کے سخت خلاف ہے۔ (۳۴) بعض عالموں کا خیال ہے کہ موجودہ عالم اسلام دراصل قرون وسطٰی کے یورپ کی زندہ تصویر ہے۔ مگر ایپل بائی بڑی کرم فرمائی کرتے ہوئے مسلمانوں، یورپیوں اور

امریکیوں کا مقابلہ کر کے ثانی الذکر فریقوں کی بے عزتی نہیں کرنا چاہتا۔ اس ضمن میں تعبیر تفسیر کے لیے کوئی زیادہ مواد تو ہے ہی نہیں اور پیغام سمجھیں بہت ہی صاف اور واضح ہے۔ دہشت گرد اور ان کا مسلم بھائی آزاد منڈی اور کھردری فرد پرستی یا انفرادیت سے شدید نفرت کرتے ہیں اور امریکہ ان دونوں کا واحد نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا مسلمانوں کو امریکی طرز حیات سے اور زیادہ دور لے جانے کی گنجائش باقی ہے؟

مشرقیات کے ماہرین کا ہمیشہ یہی خیال رہا کہ غیر مغربی دنیا میں فرد اور اس کی اجتماعی سرگرمیوں کا کوئی الگ سے تصور ہی نہیں ہے۔ ان سرگرمیوں میں شامل ہیں مذہبی امور، ذات پات، قبائلی وفاداریاں وغیرہ وغیرہ۔ نسبتاً کم مہذب معاشروں میں اپنی اجتماعی سرگرمیوں کا تصور ہے۔ جہاں آزاد منڈی کا بھی کوئی تصور نہیں ہے۔ اچھا اگر کوئی احمقانہ طور پر یہ قیاس آرائی کرے کہ مخالف تاریخوں کو سمجھنے کے لیے بین الثقافتی راستہ بڑا مفید ہو سکتا ہے تو اپیل بائی کے پاس اس کا بھی ایک جواب ہے۔ تمام سماجی تنظیموں (معاشروں) میں جنسی تعلقات بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ مگر (مسلمانوں میں) ان تعلقات کے اصول ہی سراسر مختلف ہیں۔ یہ انتہائی خوشگوار صورت کو جعل سازی سے ایک ایسی حقیقت کے طور پر پیش کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مغرب کے مرد و زن جس طور جنس سے لطف اندوز ہوتے ہیں، مسلم معاشرے اسے زیادہ جانتے ہی نہیں، نہ ہی مسلمانوں اور مغرب میں خاندان، ولدیت اور مامتا کے ایسے تصورات ہیں جو ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوں۔ اسلامی معاشروں میں رومانس کی لفاظی یا لفظالی ہی نہیں اور وہ باہمی جنسی تعلقات میں عورت کو باعزت مرتبہ بھی نہیں دیتے کہ کہیں انہیں یہ احساس نہ ہو کہ مردوں کی خوشی کے لیے ایک آلہ ہی نہیں ہیں بلکہ ان کی اس سے بھی بڑھ کر ایک حیثیت ہے۔ حیرت ہے کہ یہ سارے نتائج اس عالم نے اتنی آسانی سے اخذ کیے جس نے اپنی زندگی کا خاصا بڑا حصہ تھامس جیفرسن پر تحقیق کے لیے وقف کر دیا۔ جیفرسن اکثر اپنی باندی یا کنیز سیلی ہیمنگز کے ساتھ ہم بستر ہوتا مگر اس کے بچوں کو حرامزادے بنا دیتا جیفرسن ان کے وجود سے بھی انکاری رہا (۳۵) تو کیا ہمیں یہ عالم بتائے گا کہ وہ غیر مغربی دنیا میں لوگوں اور معاشروں کو کون سے اصولوں اور معیاروں سے ماپتا ہے اور یہ بھی کہ وہ آج جن کو دنیا بھر کے لیے مثالی جنسی تعلقات کی مثال بنا کر پیش کرتا ہے ان کی پیمائش کس معیار سے کرتا ہے۔ وہ دن کوئی زیادہ دور نہیں جب یہی مغربی ماہرین مسلمانوں اور ہم مغرب میں بسنے والے جدید

لوگوں کو بتائیں گے کہ ہماری تو جسمانی ساخت (اناٹومی) ہی مختلف ہے۔ گیارہ ستمبر کے حادثہ کے فوراً بعد امریکیوں نے عربوں، سکھوں، ہندوؤں، افغانوں، مسلمانوں، پاکستانیوں اور ایرانیوں پر جو حملے کیے، ان سے انداز لگائیں کہ بعض امریکیوں کا رویہ کیا تھا یعنی یہ کہ ''جو ہم سے مختلف نظر آتے ہیں وہ مختلف ہی ہیں (غیر ہی ہیں) اور یہی امریکی اس خرد افروزی سے پیدا کیے گئے واہمے کو گلیوں میں عملی شکل دے رہے تھے۔ کیا ہمیں نہیں پوچھنا چاہیے کہ کیا یہی امریکی طرز حیات ہے؟''

11 ستمبر کے دہشت گردوں کے حملے کا امریکی طرز حیات سے کیا تعلق ہے؟ ان کے بارے میں خیال آرائی کوئی ایسی بے کار بات نہیں۔ ان کا جائزہ ارون دھتی رائے کے دو نپے تلے مضامین میں سے پہلے مضمون کے حوالے سے لیں جس میں اس نے امریکی ریاست کی سراسر زیادتی اور تجاوز کے بارے میں اور افغانستان پر بمباری کو اخلاقیات کے حوالے سے تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ رائے نے امریکہ میں نسل کشی کے دیرینہ رویے اور ارادے کی تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے اس کے موجودہ رویے پر نکتہ چینی کی جو بڑی دلچسپ ہے، ایسی ہی دلچسپ جیسے امریکہ کی خارجہ پالیسی پر جب آزاد پسند بائیں بازو والے اعتراض کیا کرتے تھے تو امریکہ مکمل تجاہل عارفانہ سے کام لیا کرتا تھا۔ اسی طرح جہاں بھر میں امریکہ کے خلاف پھیلی نفرت کے بارے میں بھی سوال کیے جاتے اور اب تو بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ سارے سوالات ''عالمی ضمیر'' کا حصہ بن چکے ہیں۔ رائے نے تو واضح طور پر یہ بھی کہا کہ امریکہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان حملوں کو ''امریکی طرز حیات'' پر حملے قرار دے۔ اس کے خیال میں امریکہ کے پاس اس کا کوئی جواز نہیں اور امریکہ کی یہ حرکت ناقابل معافی ہے۔ رائے نے لکھا کہ جب فضا غصے اور غم سے بھری ہو تو اس ''قسم کا خیال پیش کرنا'' بڑا آسان ہوتا ہے لیکن وہ قارئین سے کہتی ہے کہ وہ اس تاثر کو مسترد کریں اور اس بات پر غور کریں کہ حملے کے لیے امریکہ کی معاشی خوشحالی اور فوجی طاقت کے دو مظہر ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹا گان... ہی کیوں منتخب کیے گئے۔ اور لبرٹی کا مجسمہ کیوں نہیں چنا گیا؟ اگر بندے کے ذہن میں آفاقیت کی کوئی صورت ہے تو پھر یہ خیال کیوں نہیں کہ امریکہ کی چاہیے جو بھی غلطیاں ہوں، ان سے قطع نظر لبرٹی کا مجسمہ دنیا بھر کے لوگوں کے لیے ہر زمانے اور ہر قسم کے حالات میں ہمیشہ روشن رہنے والا راہنما شعلہ رہا۔

بہر طور اگر امریکہ کی تجارت واقعی تجارت ہی ہے اور فوج کے سلسلے امریکہ معاشرے

کے تمام سیاسی، سماجی، سول اداروں سے ملے ہوئے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ رائے کا ہاتھ امریکہ کی نبض پر نہیں ہے۔ اس کے ذہن میں ایک مضبوط خیال تو ہے کہ امریکی لوگوں کی آواز سنی ہی نہیں جاتی کیونکہ وہ فوجی اداروں کے جال میں دب کر رہ جاتی ہے۔ جیسے فوجی خبریں اور سلسلے (فائدے) ہزاروں امریکی لوگوں اور برادریوں تک نہ پہنچے ہوں۔ حالانکہ اگر ایک طیارہ بردار بحری جہاز یا جنگی جہاز واپس امریکہ آ جائے تو یہ خبر شام کے اخباروں میں چھپ جاتی ہے۔ اسی طرح امریکہ کے بعض ذرائع ابلاغ یہ کہتے رہتے ہیں کہ امریکی یونیورسٹیوں میں کمیونزم فروغ پا رہا ہے۔ اور وہاں پر غیر محب وطن نظریے پرورش پا رہے ہیں مگر انہی یونیورسٹیوں کے زیر اہتمام امریکی اور اسرائیلی فوجی افسروں اور ماہرین کو اس موضوع پر لیکچر دینے کے لیے عموماً بلایا جاتا ہے کہ دہشت گردی کا مقابلہ کس طرح کیا جائے۔ اسی طرح زیادہ معروف حلقوں کی طرف سے فوجی معاہدوں اور ٹھیکوں، اڈے برقرار رکھنے اور دفاع سے متعلق تحقیقات پر زیادہ توجہ دینے کے لیے کانگرس میں باقاعدہ لابی کی جاتی ہے۔ رائے یقیناً اچھی طرح جانتی ہے کہ زرد ربن اور جھنڈوں (فلیگز) کے اتنا زیادہ خفیف کرنے والے مظاہرے کیوں ہوتے ہیں جبکہ دوسرے کسی ملک میں ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ (۳۷) تاہم پینٹاگان سے جس قسم کے اشارے دیئے جاتے ہیں رائے کو ان کا تعلق ان مظاہروں کے ساتھ نظر نہیں آتا۔ رائے کہتی ہے امریکہ کے عوام کو معلوم ہونا چاہیے کہ دنیا کے لوگ ان سے نہیں ان کی حکومت کی پالیسیوں سے نفرت کرتے ہیں۔ اور پھر اس بات کو اس طرح ثابت کرتی ہے کہ دنیا بھر میں امریکہ کے اعلیٰ درجے کے موسیقاروں، ادیبوں، ایکٹروں اور کھلاڑیوں کو بے پناہ خیر مقدمی داد ملتی ہے۔ اگر عوام اور امریکی حکومت میں اتنا زیادہ فاصلہ ہے تو پھر امریکی جمہوریت کو ایک جھوٹی کارروائی سمجھ کر برطرف کر دینا چاہیے۔ اس جھوٹی ڈرامہ بازی کو ثابت کرنے کے لیے 2000 کے امریکی صدارتی انتخابات کو پیش کیا جا سکتا ہے مگر اس مثال کو نہ تو امریکی حکومت اور نہ ہی امریکی عوام ایک معتبر مثال کے طور پر قبول کریں گے۔ اردن دھتی رائے کی طرح یہ خیال کرنا کہ امریکہ میں ایسی حکومت ہے جو عوام کے احساسات کے برعکس چلتی ہے وہ غلطی سے یہ فرض کر لے کہ اس کے عوام اگرچہ بے خبر اور فریب خوردہ ہیں لیکن اپنے لیڈروں کے مقابلے میں زیادہ سیانے ہیں۔ تو ایسی صورت سے تو نمائندگی کا تصور ہی ملیا میٹ ہو جاتا ہے حالانکہ تمام جمہوریتوں کی رسمی وجہ وجود تو یہی اصول نمائندگی ہے۔ امریکہ میں

چونکہ لیڈر منتخب کیے جاتے ہیں اس لیے بندہ یہ نہیں سوچ سکتا کہ یہ انتخابی مشق کتنی ہی بے حقیقت اور بے معنی کیوں نہ ہو اس سے عزت ماب ڈیموکریٹس اور ری پبلکن لوگ منتخب تو ہوتے ہیں۔

رائے کی دلیلوں میں تنوع ہوتا ہے اور اس کا جواب عموماً حکومت امریکہ کے نقادوں کی طرف سے دیا جاتا ہے یا ان میں تال میل ہوتا ہے تو ان میں سے غالباً اخلاقی طور پر عوام اور سول سوسائٹی کو خارج کر دیا جاتا ہے۔ میں نے یہ بات اتفاقاً نوٹ کی کہ امریکیوں کے ترجمان بڑی تعداد میں ہیں۔ چنانچہ دنیا میں کوئی ایسا ملک نہیں جس کی حکومت اور اس کے نقاد جعلی طریقے سے یہ نہ دکھائیں کہ وہ عوام کے نام پر مسلسل مکالمے میں رہتے ہیں۔ ہندوستان میں وزیراعظم یا صدر "قوم" سے خطاب کرتا ہے امریکہ میں صدر امریکی عوام سے خطاب کرتا ہے۔ یہ امریکی عوام ہی بذات خود مہذب اقدار، انسانیت پسندی اور معقول رویوں کے منصف اور عدالت ہیں۔ دنیا کو بار بار یاد دلایا جاتا ہے کہ امریکی عوام آزادی، جمہوریت، انسانی وضع داری اور حسن سلوک اور تہذیب پر حملہ برداشت نہیں کریں گے اور یہ بات توجہ طلب ہے کہ بش نے 20 ستمبر کو کانگرس کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے آغاز ہی "امریکی عوام" کے لفظوں سے کیا اور کہا کہ وہ امریکی عوام کو پہلے ہی ریاستی حالات کے بارے میں ایک رپورٹ دے چکے ہیں۔ دراصل امریکی عوام بن لادن کا جواب ہیں اور عوام کی طرف سے بن لادن کے دہشت گردی کے اقدامات کا جواب بڑے حوصلے اور دردمندی سے دیا جاتا ہے۔ اس طرح تاثر دیا جاتا ہے کہ یونین (امریکہ) مضبوط ہے۔ 1960 سے اب تک امریکی ریاستی دہشت گردی کے بارے میں نوم چومسکی جیسا جہاں دیدہ ور نقاد بڑی جرات کے ساتھ سوال اٹھاتا ہے کہ کیا امریکی عوام سچ مچ جانتے ہیں کہ ان کی حکومت نے وسیع پیمانے پر انسانی حقوق کی خلاف ورزی میں اہم کردار ادا کیا، تو پھر ان کا احتجاج ہی حکومت کا پہیہ جام کر دینے کے لیے کافی ہے۔ (اگر چومسکی یہ جان سکتا ہے تو پھر اطلاعات کے اس انقلاب میں امریکی اپنی بے خبری اور جہل کا کمبل کیوں نہیں اتارتے)؟ یہ بات غیر ضروری نظر آتی ہے کہ رائے، چومسکی اور ان جیسے کئی اور قائل ہیں کہ امریکی معاشرے کو جمہوری تعلیاں ورثے میں ملی ہیں اور موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ امریکی ریاستی دہشت گردی سے پوری دنیا کو

شدید خطرہ ہے، بہرطور یہ لوگ ایک اور حقیقت نظر انداز کر رہے ہیں کہ مسلسل کئی انتخابات میں لوگوں نے فوجی مداخلت کی بھرپور حمائت کی۔ یہ حمائت خلیج کی جنگ پر بھی کی گئی اور 11 ستمبر کے بعد بھی۔ انتخابات عوام کے خیالات اور رجحانات کو جاننے کا کوئی معمولی ذریعہ نہیں ہوتے مگر انہیں پالیسی، طرز حکمرانی اور رائے سازی کی خاطر توڑ مروڑ کر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ بہت سے بائیں بازو والے بھی جب انتخابی نتائج ان کے مفاد میں ہوں تو انہیں قبول کر لیتے ہیں۔

دو ملکوں کی کہانی... امریکہ کا پھیرا اور افغانستان کی دریافت

پولیٹکل سائنس خاص طور پر امریکہ میں ایک ایسا شعبہ بن گیا ہے جس میں ریاضیاتی طریقے زیادہ شامل ہو گئے ہیں۔ لیکن سیاسی زندگی کو سمجھنے کے لیے ایک عرصے سے اس شعبے کے عالم بعض راہنماؤں اور ان کے پیروکاروں کے تصورات سے نتیجے اخذ کرتے آئے ہیں۔ مارچ 2004 میں میڈرڈ میں بم دھماکہ میں 200 جانیں تلف ہوئیں تو اس سے فوراً بعد ہی سپین کی حکومت نے اعلان کیا کہ وہ ''رضامند مخلوط کمان'' سے اپنی فوجیں واپس بلانے کا ارادہ رکھتی ہے ۔اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دہشت گردی کرنے والوں کو اس بات کی سمجھ ہے کہ کن مخصوص حالات میں ایک طاقت ایک راہنما کے پیچھے چلتی ہے اور پھر سیاسی لیڈر کو اپنے پیچھے چلانے لگتی ہے۔ دہشت گردی کی روائتی تاریخ یہ ہے کہ اس میں ایسا تشدد ہوتا ہے جو نہ صرف فوجیوں اور سرکاری ملازموں کو بلکہ عام لوگوں کو بھی بلا امتیاز شکار کرتا ہے۔ نشانہ نہ صرف سرکاری تنصیبات بنتی ہیں بلکہ سول سوسائٹی کے ستون بھی زد میں آ جاتے ہیں۔ امریکہ کے محکمہ دفاع کے نزدیک دہشت گردی کی تعریف ہے۔ ''سیاسی، مذہبی یا نظریاتی مقاصد کے حصول کے لیے افراد یا املاک کے خلاف، حکومت یا سول سوسائٹی کے خلاف غیر قانونی طور پر طاقت اور تشدد کا استعمال یا اس کے استعمال کی دھمکی'' (۳۸) اس ضمن میں کم از کم ایک عالم نے دیکھا کہ پینٹا گان نے دہشت گردی کی جو تعریف کی ہے اس میں سویلین کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی، نہ دہشت گردی کا شکار ہونے والوں کو اور نہ ہی ان کو جو ایک بڑی تبدیلی کے لیے اس کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اس نقطہ نظر سے بھی دیکھتا ہے کہ دراصل ایسی جنگ کی ''ترتیب جدید'' ہے جس میں اس مقصد

کے لیے بالا رادہ سویلین کو نشانہ بنایا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے لیڈروں کی حمائت چھوڑ دیں یا ایسی پالیسیاں ترک کر دی جائیں جو دہشت گردوں کی نظر میں قابل اعتراض ہوتی ہیں۔ (۳۹) تاہم یہ بات یقینی ہے کہ 11 ستمبر کے دہشت گرد امریکہ کی حکومت اور امریکی عوام کے درمیان جو نمایاں فرق ہے اس کو کم کرنا چاہتے تھے۔ امریکی معاشرے کے قدامت پسند عناصر شائد بائیں بازو والوں کے مقابلے میں اس حقیقت کو زیادہ اہمیت دیتے ہوں کہ یہ کوشش امریکی طرزِ حیات پر براہِ راست حملہ تھا۔ امریکی طرزِ حیات کے ایک عنصر کا یہ مفروضہ یہ تھا کہ یہاں ہر بندے کا حق ہے کہ وہ بلاخوف زندگی گزارے۔ بے شک ایک شخص کا پیدائشی حق ہے کہ وہ ایک بین الثقافتی معاشرے میں زیادہ سے زیادہ حفاظت میں ہو۔ دوسری طرف اسے اتنی آزادی ہو کہ وہ حکومت میں اپنے نمائندے کے ذریعے دوسروں پر تشدد کا خوف طاری کر سکے۔ امریکہ میں کس کے بارے میں فرض کریں کہ اسے اس عذاب کا احساس اور سمجھ ہے جس کا ذکر ارنسٹ جونز نے 1940 میں کیا جس میں متاثرہ بندہ جامد اور جذباتی فالج کا شکار ہوا۔ اس کے بعد اس کی ساری دماغی سرگرمی ختم کر کے اسے مار دیا گیا۔ پھر ان کا عذاب بھی ہے جو مسلسل کئی راتوں تک بموں، میزائلوں، کلسٹر بموں اور پچاس ہزار پاؤنڈ کے بارود کے دھماکے سنتے رہے۔ (۴۰)

اسامہ بن لادن جنگ امریکی عوام تک لے جانا چاہتا تھا۔ اور امریکی طرز حیات کی تخریب پر تلا ہوا تھا۔ اسامہ نے صرف یہ کہا تھا اس کی خواہش تھی کہ امریکہ شمال سے لے کر جنوب تک اور مغرب سے لے کر مشرق تک خوف سے لرزہ براندام ہو جائے اور اس کا مطلب صرف یہی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کے اقدامات سے امریکی طرز حیات اور مضبوط ہو جائے گا۔ اس معاملہ کو کسی بھی زاویے سے دیکھیں، طالبان کے زیر قبضہ افغانستان کے خلاف امریکہ نے جنگ شروع کی۔ عسکریت پسندوں کے خاتمے کے لیے فضا سے لوگوں پر اس قدر بھاری بمباری کی کہ اب وہاں لوگوں کے تن پر صرف کپڑے باقی رہ گئے ہیں اور وہ پابہ رکاب بیٹھے ہیں، پھر ڈھٹائی کے ساتھ بین الاقوامیت کا دعویٰ۔ فضا سے مونگ پھلی کے مکھن اور سٹرابیری جام کے ڈبے پھینکنے کا مکروہ عمل یا پھر ان قوموں کو موت اور تباہی کی ملفوف دھمکیاں جو دہشت گردی کے خلاف اتحاد کی نیم رضا مند فریق ہیں۔ لگتا ہے اسامہ بن لادن کو امریکی طرز حیات کے اس پہلو کا علم نہیں کہ وہ دہشت

گردی کے ساتھ ایک حرف تسلی بھی منسلک کر دے۔ بش اس بات پر بہت بولا ہے کہ یہ ایک ''نئی قسم کی جنگ'' ہے مگر افغانستان میں جو بمباری ہوئی اس میں تو کوئی نیا پن نہیں۔ یہ ملک (افغانستان) یورپی طاقتوں کو ایک طویل مدت تک تجربے کرنے کے لیے لیبارٹری کے طور پر مل گیا ہے اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسی افغانستان پر اب زیادہ جدید سامان سے بمباری ہو رہی ہے جس پر برطانیہ نے پہلی فضائی بمباری 1919 میں کی تھی۔ (۴۱) بش کی تکرار یہی رہی کہ غار میں چھپے اور نظر نہ آنے والے آدمی بہت بزدل ہیں کہ اپنے چہرے بھی نہیں دکھاتے لیکن پندرہ ہزار فٹ کی بلندی سے لوگوں پر بمباری کرنا بھی تو امریکی سپاہیوں کی مردانگی کا مظاہرہ نہیں ہے یہ امریکی ہی ہیں جن کی دوسری جنگ عظیم کے آخری دنوں سے لے کر اب تک یہ کوشش رہی ہے کہ امریکہ کی دھمکیاں تو بڑی واضح نظر آئیں مگر امریکی فوجوں کے چہرے کم ہی نظر آئیں۔

یہ بلاشبہ ایک سچ ہے کہ 11 ستمبر کی دہشت گردی کی کارروائی بڑے اہتمام سے تیار کی گئی اور زیر عمل لائی گئی اور یہ سب کچھ ایک بہت ہی عقیدت و احترام سے بنائے گئے نقشے کی پوری تفصیلات کے مطابق کیا گیا۔ دہشت گردوں نے بڑی زبردست تزویراتی قوت کا مظاہرہ کیا ہے اور یہی وہ معبد خانہ ہے جہاں دنیا کی سب بڑی طاقتوں نے عبادت کی ہے یعنی دہشت گردوں نے کمال مہارت اور ذہانت سے ہتھیار استعمال کیے اور پھر ایک اور طرز حیات کی طرف اشارہ کیا جو امریکی بھی بخوبی سمجھتے ہیں اور اس کا اظہار علامتوں میں ہوتا ہے۔ امریکی طرز حیات کا جدیدیت کے آخری زمانے میں ایک مظہر یا علامت سپورٹس یوٹیلٹی وہیکل تھی جس کی فروخت کل کاروں وغیرہ کے مقابلے میں پچاس فیصد ہے۔ اس کار کے اشتہاروں میں دکھایا جاتا ہے کہ یہ بہت ہی اونچے نیچے روکھے سوکھے پہاڑوں پر چلتی ہے اور سیاح کو دور دراز علاقوں میں لے جاتی ہے۔ ڈرائیور کو گرینڈ کینئین کے ہوشربا مناظر دکھاتی ہے۔ ایس یو وی اکثر جنوبی کیلی فورنیا کی فری ویز پر بکثرت نظر آتی ہے عموماً اس میں ایک ہی بندہ سوار ہوتا ہے۔ یہ دوسری کاروں کو اڑا کر ایک طرف کر دیتی ہے۔ ڈرائیوروں کو خوفزدہ کر کے مطیع بھی کرتی ہے۔ ایس یو وی ہائی ویز اور سرفیس سٹریٹ کا جنگی ٹینک ہے۔ اس کا ٹریک ریکارڈ سیفٹی کے لحاظ سے بڑا ناقص ہے، اس کا سپورٹس سے کوئی تعلق نہیں اور اس کا واحد مصرف یہ ہے کہ یہ کارساز صنعت کے

خزانے بھرتی رہتی ہے۔ یہ صنعت اپنے جابرانہ انداز مسلسل بدلتی رہی ہے۔ فورڈ سے آغاز ہوا پھر زمین کے وسائل کر کے زیادہ استعمال کر کے مہنگے کام کیے گئے اور اس سارے عمل میں تخیل بھی محدود اور کارکردگی بھی شرمناک۔ ایس یووی اپنے نام سے ایک مظہر ہے علامت ہے غلبے کی دہشت کی۔ غلبہ کے حوالے سے نام میں بھی ایک طاقت ہوتی ہے اور پھر ہم اسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ سڑکوں کا بدمعاش بھوت (آر بی ایم روڈ بلی ماسٹر) ہے جس کی دو اور خصوصیات ہیں یعنی افادیت (کارگزاری) اور فراغت (سپورٹس) امریکی لغات میں ایس یووی ایک گیس نوش یا گیس خور شے ہے اور ایسے ملک میں جہاں سستی گیس کی مسلسل فراہمی اور حصول شہری کا عملاً ایک آئینی حق ہے۔

اس دیونما گاڑی کے حوالے سے ایک امریکی اس بات کو سچ سمجھتا ہے کہ دنیا بھر کی تیل کی سپلائی صرف اس کی خاطر ہے۔ یہ ہے امریکی طرز حیات اور اپنی وضع کی ایک دہشت ہے۔ وجہ صرف یہی نہیں کہ اس کی آبادی تو دنیا کی آبادی کا چار فیصد ہے لیکن امریکہ دنیا کے تیل اور دوسرے وسائل کا تیس فیصد صرف کرتا ہے۔ دنیا میں حال کے زمانوں میں مندرجہ ذیل رٹے رٹائے فقرے سے زیادہ کوئی فقرہ نہیں چلا کہ ''دنیا مسلسل تغیر پذیر ہے'' یا یہ کہ ''زندگی پھر کبھی ایسی نہ ہوگی'' مگر امریکی طرز حیات میں اتنی آسانی سے کوئی رخنہ نہیں پڑتا نہ تبدیلی آتی۔ ہے ایک امریکی اخبار میں چھپنے والے مضمون میں کہا گیا، نیویارک اور واشنگٹن کے قریب حملوں کے بعد کے مہینے اکتوبر میں ایس یووی اور وین کی فروخت میں اضافہ ہو گیا (۴۲) اکثر امریکیوں کو اندازہ نہیں کہ دہشت گردی، تیل کی کھپت اور امریکی استثنائیت میں باہمی طور پر کیا تعلق ہے۔ بندے کو صرف اتنا پتہ ہے کہ ایس یو دی امریکی سڑکوں کے لیے وہی کچھ حیثیت رکھتی ہے جو 1990 کی دہائی میں ایٹمی حملہ سے بچاؤ کے لیے بنائی گئی پناہ گاہوں کی تھی۔ یہ سراب کہ موت سے بچنے کے لیے ایک حفاظتی طریقہ ہے، کبھی آسانی سے ختم نہیں ہوگا۔

ایک انتہائی فضول ضیاع والا صارف قسم کھا کر مجرمانہ حد تک ضیاع کرتا ہے۔ امریکہ، صرفے کا یہ انداز اور نظریہ ساری دنیا کو برآمد کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ امریکیوں کی نظر میں قوم کی تعمیر کا مفہوم یہ ہے کہ لوگوں کو یعنی انسانوں کو صارفین میں بدل دیا جائے۔ اس کے علمی اداروں نے بھی صارف اور صرفے پر تنقید کی برآمد کا چارہ کر لیا ہے جس سے

بہت سے لوگوں کو یہ خیال گزرے گا کہ امریکہ یک سنگی (ایک ہی لاٹھ یا ڈھب) نہیں ہے۔ مگر یہ ہمارے لیے تعجب کی بات نہیں کیونکہ کبھی امریکہ ایک طرف دنیا میں سب سے زیادہ جنگی اسلحہ بناتا ہے اور برآمد کرتا ہے اور دوسری طرف یہی امریکہ دنیا میں امن کے قیام کے لیے سب سے بڑی طاقت ہے۔ ایک مرتبہ پھر ٹیکیٹیس کا موقولہ ''غالب طاقتوں نے ہمیشہ خود کو جنگ کرنے اور امن قائم کرنے کا دعویدار سمجھا ہے۔ ان کی قیام امن کی کوشش بھی دراصل دوسرے معنوں میں جنگ کا ہی روپ ہوتی ہے۔ یہاں گاندھی اور ایک صحافی کے درمیان ہونے والی گفتگو یاد آتی ہے۔ صحافی گاندھی سے ان کی صنعت کاری اور سائنسوں کی مخالفت کی وجوہ جاننا چاہتا تھا۔ گاندھی کا کہا ریکارڈ پر ہے کہ اگر انگلستان جیسے چھوٹے جزیرے نے اپنے لوگوں کی زندگی پر آسائش کرنے کے لیے اس وسیع سطح پر استحصال کیا تو میں یہ سوچ کر کانپ جاتا ہوں کہ اگر ہندوستان کے چند کروڑ... بلکہ اب ایک ارب... اسی قسم کا معیار زندگی بنانا چاہیں تو کتنا زیادہ استحصال کرنا پڑے گا۔ شائد اس دلیل کو اس بنا پر مسترد کر دیا جائے کہ یہ تو جدیدیت پر ایک رومانوی سی نکتہ چینی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ بش نے کیوٹو کے آب و ہوا کے معاہدہ کو رد کر دیا، پھر 11 ستمبر سے چند دن پہلے ٹوپن پر ہونے والی نسلی پرستی کے بارے میں کانفرنس کو مسترد کیا تو اس حوالے سے شائد ہم دو لعنتوں دہشت گردی اور صرفہ بے بہا اور دہشت گردی اور یک طرفہ کارروائی کے درمیان رشتہ کو نہ سمجھ سکیں۔ تو اس صورت میں دہشت گردی کے بارے میں یہی کہا اور سمجھا جائے گا کہ بعض ''جنوبی لوگ'' ''برا کام'' کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ ایندھن کو برباد کرنے والی امریکی ایس یو وی گاڑی سے چلتا اور امریکہ کے ایندھن پر اٹھنے والے بہت زیادہ خرچہ، مشرق وسطیٰ، جنگ خلیج، افغانستان میں جنگ کے شعلوں سے ہوتا ہوا اب عراق تک پہنچتا ہے اور یہاں سے وسطی ایشیا کے فی الحال غیر مستعمل ایندھنی ذخیروں تک پہنچتا ہے اور یہ سارا راستہ خون میں ڈوبا ہوا ہے۔ تیل جارج بش اور اسامہ بن لادن دونوں کی رگوں میں دوڑتا ہے۔ (۴۳) دونوں خوشحال گھرانوں کے چشم و چراغ ہیں دونوں کی اٹھان سینئر جارج بش کے پدرانہ سائے میں ہوئی۔ دراصل یہ امریکی طرز حیات اور دہشت گردی والے طریق حیات کی باہمی پرمسرت شادی ہے۔ بندہ صرف یہی خواہش کر سکتا ہے کہ اس انتہائی بدصورت ملاپ سے کوئی اولاد نہ پیدا ہو جائے۔

یہ قصہ تمام ہوا۔ اب واضح طور پر مان لیں کہ 11 ستمبر کو جو کچھ ہوا اسے دہشت گردی کے علاوہ اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ یہ کہنا تو یقیناً بہت بڑی سنگدلی ہوگی کہ امریکہ نے جو بویا وہی کاٹا تاہم انسانی جانوں کو اس لیے تلف یا صرف کیا گیا کہ ایک بڑی طاقت کو بتایا جائے کہ کائنات ایسے عجیب وغریب اور وسیع قوانین کے تابع ہے جن میں عوض معاوضہ کا قانون بھی ہے۔ یہ بات بھی تسلیم کر لینی چاہیے کہ دنیا کے بہت بڑے حصے میں لوگ سالوں اور صدیوں سے دہشت کے سائے میں رہ رہے ہیں۔ وارڈ چرچل نے ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں بموں کے حملے میں مرنے والوں کی جو صورت بیان ہے وہ اصلاً بڑی نامعقول اور احساس سے عاری نظر آتی ہے۔ مرنے والے اپنی اہمیت میں غرق تھے اپنے موبائل ٹیلی فون پر سودے بازی کرتے اور فوجی انڈسٹریل کامپلیکس کی سیاسی معیشت میں اپنے انداز میں حصہ لیتے، ان کے بارے میں چرول نے یہی لکھا کہ وہ اپنے اصل مقام کو مراجعت کر گئے اور نائن الیون کی دہشت گردی کے حوالے سے دہشت گردی کرنے والے کی اپنی حدود میں آ گئے (۴۴)۔ (کاروبار کے حوالے سے انہیں یہودی لقب دیا گیا اور اشارہ حرفی کے سیلولر کاسٹ کی طرف تھا) زیادہ دہشت گردی تو امریکہ اور تقریباً سارے ہی مہذب مغرب نے کی ہے مگر انہیں یہ اقبال اور اعتراف کرنے کی جرأت کبھی نہیں ہوئی کہ انہوں نے دوسرے ملک میں دہشت کی لمبی رات پیدا کر کے اپنے لیے ایک لمبی پرامن رات خریدی ہے۔ دہشت گردی نے انڈے بچے امریکی طرز حیات اور ''مغربی تہذیب'' کے اندر دیئے اور یہیں یہ پھلی پھولی۔ گاندھی نے ''مغربی تہذیب'' کے بارے میں کہا تھا''، یہ اچھا خیال ہوگا'۔ تعجب کی بات ہے کہ اس تاریخ (دہشت گردی) میں طالبان اور امریکہ دونوں برابر کے حصہ دار ہیں۔ یہ تفصیل یا موقف قبول کر لیا گیا ہے۔ کہ 1989 میں افغانستان سے روس کی واپسی کے بعد شدید قسم کی خانہ جنگی شروع ہوگئی تب طالبان نے ملک کو افراتفری، قتل وغارت اور خلفشار اور وحشیانہ خونریزی سے بچا لیا۔ طالبان نے یہ امن بھی دراصل دہشت گردی ہی کے ذریعے خریدا۔ لیکن دنیا کو اس طرف توجہ دینے کی ضرورت نہ تھی اور جب ادھر توجہ کی تو تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

11 ستمبر کے قصہ خصوصاً اس کے بعد کے واقعات میں زیادہ تر امریکہ ہی ملوث نظر آتا ہے۔ تاہم کچھ لوگوں کے لیے افغانستان کے بارے میں سوچنا بڑا مشکل اور تکلیف دہ ہے۔ تاریخ دراصل طاقتور اور کمزور نظر آنے والے اور نہ نظر آنے والے اور آواز والے اور

بے آواز کے درمیان ایک معاہدہ ہے۔ غیر مساوی، غیر ہموار اور تکلیف دہ، سچ ہے کہ بم چلانے والوں نے نہ تو فوری طور پر کوئی مطالبہ کیا، نہ ذمہ داری قبول کی اور نہ ہی ان کے اعمال سے یہ ہویدا ہوا کہ وہ بات چیت اور گفت وشنید کرنا چاہتے ہیں۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر بمباری سے صرف ایک بات ظاہر ہوتی ہے کہ انہوں نے طاقت کے ایوانوں میں غلغلہ ڈال دیا۔ (طاقت کی مابعد الطبعیات میں ایک شق) ان جڑواں میناروں کے بارے میں اکثر کہا جاتا ہے کہ وہ تاش کے پتوں کی طرح ڈھیر ہو گئے مگر بدھوں کی طرف سے ریتلے مذہبی نشان کی پیش کش اسی قسم کی سبق آموز مماثلت رکھتی ہے۔ یہ کھیل موجودگی اور غیر موجودگی کا، تعمیر اور تخریب کا اور عدم وجود اور وجود کا، ہر عمل میں سے بہت سے اعمال پیدا ہوتے ہیں۔ دہشت گردوں کو یہ تو پتہ تھا کہ ان کی کارروائی امریکہ اور اس کے دشمنوں/ طالبان کے درمیان عجیب وغریب تعلق پیدا کر دے گی۔ اس دہشت گردی سے افغانستان کو اور تو کیا ملتا مگر 11 ستمبر کی بمباری کے بعد زیادہ توجہ ادھر چلی گئی حالانکہ 2001 میں جب طالبان نے بامیان میں بدھ کے مجسموں کو اڑا دیا تھا تب افغانستان تھوڑی دیر کے لیے امریکہ کی نظر میں آیا اور پھر امریکی خود پرستی کی دلدل میں غائب ہو گیا۔

یہ قطعی کوئی مبالغہ نہیں کہ امریکہ نے حال ہی میں افغانستان کو دریافت کیا ہے۔ 11 ستمبر کے واقعہ اور اس کے بعد کے حالات پر بے تحاشا تحریروں کے ذریعے اور جیسا کہ میں اس کتاب میں بار بار لکھتا آیا ہوں کہ اپنی تحریروں سے ایک خاص قسم کے سامراج کا چہرہ سامنے آیا اور یہ بھی کہ اب انکار یا اختلاف کی گنجائش اور کم ہو گئی ہے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ نائن الیون کے فوراً بعد یہ فرض کر لیا گیا کہ دہشت گردی اور دوسرے مظالم خرد افروزی کے مقابل آ گئے ہیں اور امریکہ میں دو شعبے اور ان کے ماہرین ایسے ہیں جو لوگوں کو دہشت گردی اور خرد افروزی یا روشن خیالی سے پوری طرح آگاہ کر سکتے ہیں۔ ایک تاریخ سیاست اور مشرق وسطیٰ کے معاشروں اور ثقافتوں کے ماہر اور دوسرے امریکی خارجہ پالیسی کے ماہرین۔ امریکہ، ہندوستان، برطانیہ اور دوسرے ممالک کے بائیں بازو والوں نے دہشت گردوں کے حملوں کو عمومی طور پر امریکہ کی خارجہ پالیسی کی ناکامی سے تعبیر کیا۔ اس ضمن میں دوسرا موقف مشرق وسطیٰ کی سیاست اور اسلامی تاریخ اور مذہب

کے ماہرین کا ان حملوں کے بارے میں یہ تھا (اور میں اس سے پہلے اس پر بات کر چکا ہوں) کہ سارا کچھ پہلے سے موجود اسلامی بنیاد پرستی کا شاخسانہ ہے۔ مگر اس ضمن میں یہ نہیں سوچا گیا کہ افغانستان کی تاریخ کا زیادہ تر تعلق تو جنوبی ایشیا کی تاریخ سے ہے۔ علوم کے نقشے میں افغانسان کہاں ہے؟۔ اس کے زمرے کون کون سے ہیں اور پھر اگر ان زمروں کے حوالے سے اس کو دیکھا جائے تو نتائج کیا ہوں گے؟

ان سوالات کا شائد بہت بہتر جواب ہم گاندھی جیسی شخصیت کے حوالے سے حاصل کر سکتے ہیں۔ گاندھی نے عدم تشدد کے سخت معیار بنا رکھے تھے اور اس لحاظ سے انہوں نے پٹھانوں کو عدم تشدد پر بہترین انداز میں کاربند لوگ شمار کیا تھا اور یہ پٹھان آج کے طالبان کے آباؤ اجداد تھے اور انہی کو آج وحشی کہا جا رہا ہے۔ گاندھی نے 1920 کی دہائی کے آخر میں کہا کہ عدم تشدد میں یقین رکھتے ہوئے جتنے لوگوں سے بھی میں ملا ان میں پٹھان جیسا عدم تشدد کا عملی مظاہرہ کرنے والا میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ 1920 کے آخر میں پٹھان راہنما خان عبدالغفار خان عرف سرحدی گاندھی آئے اور گاندھی کے ستیہ گرہ (۴۶) کے اصول کو قبول کر لیا۔ غفار خان نے رضا کار اکٹھے کیے اور انہیں ستیہ گرہ کے اصول و ضوابط سکھائے۔ گاندھی کے معترضین کی زبان میں ان پٹھانوں میں نہ تو سبزی اور چاول خور تھے نہ بنیا لوگ تھے۔ لیکن یہ بہت قد آور لوگ تھے ان کی فوجی یا جنگی صلاحیتوں کا زمانہ معترف تھا۔ انہیں خدائی خدمت گار اور اللہ کا خادم کہا جاتا۔ انہی لوگوں نے پشاور میں برطانوی انتظامیہ کو مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ (۴۷) پٹھانوں کو اپنے مسلمان ہونے پر بڑا ناز اور فخر ہے۔ کئی سالوں بعد ان پٹھانوں نے دوقومی نظریہ کو مسترد کر دیا اسی نظریہ کی بنا پر ہندوستان کے اندر مسلم اکثریتی علاقوں میں پاکستان بنایا گیا تھا۔ پٹھانوں نے تقسیم ہند پر اپنی ناخوشی کا اظہار کیا۔ افغانستان بھی واحد ملک تھا جس نے اقوام متحدہ میں پاکستان کی رکنیت کی مخالفت کی تھی۔ یہ تاریخ کہاں ہے اور اس اختلاف یا عداوت والی (موجودہ) سیاست کہاں ہے؟ لگتا ہے کہ افغانستان میں سوویت یونین کے آنے کی دیر تھی کہ یہ مغرب کے علم اور توجہ میں آ گیا اور پھر مغرب کے وجود کی خاطر افغانستان خود کچی بستی بن کر پسماندگی کا شکار ہو گیا۔ دھرتی کی خاک کی یہی کیفیت ہے۔ اب تاریخ کے صفحات میں جگہ پانے کے لیے ضروری تھا کہ وہ یورپ کے ذہن میں گھر کریں یا ایسی نظریاتی تحریک

سے رشتہ جوڑیں جس کا منبع یورپ ہو۔ عبدالغفار خان اور پٹھانوں کو ایک طرف کر دیا گیا اور انہیں اطاعت پر مجبور کر دیا گیا تو پھر پیچھے کون سے سیاسی امکانات رہ گئے تھے۔ اگر دنیا پٹھانوں کی آواز پر کان دھرتی تو کیسی مختلف تاریخ لکھی جاتی۔

ہندوستان کی طرح امریکہ میں بھی بائیں بازو والے ان ساری باتوں سے دور ہوتے ہیں جنہیں بائیں بازو کی مستند تاریخ کے تصور کے ذریعے نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ میں نے اس کتاب میں مسلسل ادھر اشارہ کیا ہے کہ تخیل کی یہ ناکامی ان تک ہی محدود نہیں اور جگہوں پر بھی ایسی ہی صورت حال ہے۔ امریکی علمی اداروں میں دو شعبوں پر زیادہ دھیان ہے، شعبہ جاتی صورتیں اور علاقائی مطالعے مگر ان دونوں شعبوں میں افغانستان کہیں بھی نہیں یعنی اس پر کوئی توجہ اور کام بھی نہیں ہوا۔ مشرق وسطیٰ کی تاریخ اور اسلامی مطالعے کے ماہرین صرف مشرق وسطیٰ کے بارے میں سوچتے ہیں اور مشرق وسطیٰ بھی اختراع ہے علاقائی مطالعہ کے پروگرام کی۔ پھر اسے اسلام کا مستند گھر سمجھا گیا۔ مختصراً یہ کہ ان ماہرین نے افغانستان میں معمولی سی دلچسپی بھی نہیں لی۔ ہاں عالموں کی ایک چھوٹی سی ٹولی ہے جو ہند اسلامی تاریخ پر کام کرتی ہے۔ لیکن جنوبی ایشیا کے اسلام پر توجہ نہیں۔ اسلام کے عالموں کے ذہنوں میں مسلسل یہ احساس رہا ہے کہ جنوبی ایشیا کے چالیس کروڑ مسلمانوں کے پاس اسلام کا غیر مستند، ملاوٹ والا، دوغلا بلکہ لاول قسم کا تصور ہے۔ ارنسٹ گیلز کی معروف کتاب مسلم سوسائٹی (۴۸) (1981) کا ضمنی عنوان بھی کوئی نہیں یعنی یہ نہیں بتایا گیا کہ موضوع کہاں تک پھیلا ہے۔ نہ ہی یہ کسی جغرافیائی حوالے سے لکھی گئی ہے، مگر اس میں ہندوستان کا حوالہ بھی مشکل سے ملتا ہے حالانکہ دنیا میں دوسرے نمبر پر مسلمانوں کی سب سے زیادہ آبادی یہاں رہتی ہے۔ اسی طرح آر سٹیفن کی کتاب اسلامک ہسٹری: اے فریم ورک فار انکوائری (1991) (۴۹) خاصا بڑا احاطہ کرتی ہے مگر اس میں جنوبی ایشیا کا حوالہ تک نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ بت پرستی والے ہندومت کی وجہ سے جنوبی ایشیا میں اسلام میں ملاوٹ ہو گئی ہے اس لیے اسلام یعنی خالص اسلام کا مطالعہ وہیں ہو سکتا ہے جہاں یہ پیدا ہوا اور علما نے اس کا آبائی یا پیدائشی گھر مشرق وسطیٰ ہی کو قرار دیا ہے۔ اب جب طالبان کے بارے میں مغرب کی توجہ ہوئی ہے تو اس کے بعد ان مسلمانوں کے بارے میں

مضامین کا ایک انبار لگ گیا۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ان مضامین کے ذریعے یہ ثابت کیا گیا اور کسی حد تک جواز کے ساتھ کہ طالبان خالص وہابی تحریک سے بہت متاثر ہیں اور سعودی عرب کا سرکاری مذہب بھی وہی (۵۰) اسلام ہے جو سعودی عرب کے عبدالوہاب نے پیش کیا ہے۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب اٹھارہویں صدی میں ہوئے اور ان کا موقف یہ تھا کہ ستر ھویں صدی عیسوی میں اسلام کی جو صورت تھی آج بھی اسی تعبیر پر عمل کیا جانا چاہیے۔ ایڈورڈ سعید نے کہا کہ سامیوں کی محدود ترقی یا ارتقا مشرقی علوم کے ماہرین کے عالمی (۵۱) نکتہ نظر کے حوالے سے خاص توجہ کا مرکز بنا رہا اور ان کے نکتہ نظر سے طالبان کا معاملہ سمجھنے کے لیے لازم ہے کہ رسوم کی ابتدائی تاریخ اور اس کے سر چشموں کے بارے میں بصیرت حاصل کی جائے۔ طالبان چاہے جتنے بھی قابل نفرت ہوں وہ مغرب کے عالموں اور سائنسدانوں کے لیے دلچسپی کا باعث ہیں کیونکہ وہ انسانیت کے فوسل (جامد متحجر) ریکارڈ کا ایک حصہ ہیں۔

علم کی سماجی تنظیم و ترتیب ایسی ہے کہ متعدد وجوہ کی بنا پر افغانستان کو امریکہ کے جنوبی ایشیا کے مطالعاتی پروگرام کے تحت جنوبی ایشیا کا حصہ نہیں دکھایا گیا۔ افغانستان اسلامی اور ہندوستانی بلاکوں کے درمیان میں سینڈوچ بنا ہوا ہے اور اسے ان میں سے کسی کا بھی حصہ نہیں بنایا گیا۔ چنانچہ اس کا مقدر یہ بن گیا کہ یہ کسی کا بھی حصہ نہیں ہے یعنی علم کے زمروں کے حوالے سے نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ 11 ستمبر سے پہلے کسی بھی امریکی یونیورسٹی میں پٹھانوں کی زبان پشتو نہیں پڑھائی جاتی تھی حالانکہ پشتو افغانستان کی اکثریتی آبادی کی زبان ہے۔ (۵۳) جنوبی ایشیا کے امریکی ماہرین کے لیے یہ کوئی اہم بات نہیں کہ خود جنوبی ایشیا والے تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے افغانستان سے دیرینہ تعلقات ہیں اور افغانستان، پاکستان اور ہندوستان کی تاریخ کا ایک حصہ مشترک بھی ہے۔ ہر چند نوآبادیاتی دور میں ایک خاص قسم کی عداوت بھی رہی مگر بین الثقافت کے حوالے سے یہ تعلقات عوامی سطح پر جاری رہے۔ ہوسکتا ہے بہت سے ہندوستانیوں کو علم نہ ہو کہ دوسری ہزاری کے دوران شمالی ہندوستان پر افغانوں کی حکومت رہی۔ تاہم دہلی میں لودھی بادشاہوں کے مقبرے واضح طور پر یاد دلاتے ہیں کہ ایک وقت تھا جب افغانستان دہشت گردوں کے نیٹ ورک کا نہیں بلکہ حکمران خاندانوں کے لیے قوت کا منبع تھا۔ اور اس بات سے بھی

بہت ہی کم ہندوستانی آگاہ ہوں گے کہ نومبر 2001 تک افغان مسائل کے حل کے حوالے سے ایک انقلاب کا نام لیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں افغانستان کے جلاوطن بادشاہ اسی سال سے زیادہ عمر کے محمد ظاہر شاہ کو واپس افغانستان میں لایا گیا۔ ظاہر شاہ گزشتہ تین دہائیوں سے یورپ میں مقیم تھا۔ (۵۴) کوئی ڈیڑھ سو سال قبل جب ہندوؤں اور مسلمانوں نے مشترکہ طور پر ہتھیار اٹھائے اور پل بھر میں ہندوستان میں برطانوی راج کو شدید خطرہ لاحق ہو گیا۔ وہ مارچ کرتے عظیم مغل خاندان کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے پاس پہنچے۔ اسے قیادت کی پیش کش کی، انگریزوں نے بہادر شاہ ظفر کو برائے نام بادشاہ بنا رکھا تھا اور اس کی بادشاہی صرف لال قلعہ تک محدود تھی۔ تب سے اور کسی حد تک اب تک عوامی رائے رہی اور غلامی کے دنوں میں بہت سے ملکوں میں بھی یہ رائے رہی ہے کہ جمہوری نظام ان لوگوں کو قبول نہیں اور 1857 کے حوالے سے ان کے نزدیک ایک بادشاہ ہی مختلف مذہبوں، نسلوں اور زمانوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو متحد کر سکتا ہے۔ خواہ اس بادشاہ کی عمر بے شک کتنی ہو اور بے شک وہ عوام سے کتنا دور ہو مگر انہیں وہی قبول ہے۔ تو پھر افغانستان کے عوام کے لیے کیا کیا کچھ تبدیل ہوا ہوتا؟

بے خبری میں جنگ: امریکہ کی خواب کاری

افغانستان پر حملہ کے چار سال بعد افیون کی پیداوار میں ریکارڈ اضافہ ہو گیا ہے۔ ان کے علاوہ حملے اور قبضے پر افغانستان کے لوگوں سے وعدہ کیا گیا تھا کہ ان کے روزگار کے لیے ایسے مواقع فراہم کیے جائیں گے کہ انہیں افیون کی فصل پر انحصار نہیں کرنا پڑے گا۔ جنگ کا نقشہ تیار کرنے والوں نے جو پروگرام وضع کیا تھا واقعات اس حساب سے آگے نہیں بڑھے نہ ہی افغانستان میں اس نقشے کے مطابق تعمیری کام ہوا ہے۔ مگر امریکی افسر یہ حقائق تسلیم نہیں کریں گے۔ یہ بات عام ہے اور مانی جاتی ہے کہ طالبان کی نئی گروہ بندی ہوئی ہے اور جنوبی اور مغربی افغانستان کے بہت بڑے علاقے پر اپنی حکمرانی سے صوبہ قندھار، زابل اور ارزگان میں جنگ تیز ہو گئی ہے اور امریکہ اس مزاحمت کو ختم کرنے کے لیے اپنے بڑے بڑے جنگی ہتھیار استعمال کر رہا ہے اور کرتا رہے گا۔ امریکہ نے یہی کچھ کئی مرتبہ دوسرے ملکوں میں کیا ہے اور ایک کے بعد دوسرے ملک میں کیا، اور امریکہ ستمبر میں

ہونے والے پارلیمانی انتخابات کے بارے میں بلند بانگ دعوے کرے گا اور کہے گا کہ افغانستان آہستہ آہستہ جمہوریت کی طرف آ رہا ہے۔ پھر ہم بش کو یہ کہتا سنیں گے" آزادی آگے بڑھتی ہے"۔ یہ افغانستان کی بدقسمتی ہے کہ سامراجی طاقتوں نے اس کی موجودگی کو ایک اہم موقع پر محسوس کیا اور پھر اسے نظر سے اوجھل کر دیا۔ سوویت یونین نے جب پسپائی اختیار کر لی، امریکہ کی افغانستان میں دلچسپی ختم ہو گئی۔ پھر جب عراق میں وسیع تباہی کے ہتھیار بنائے جانے کے آسیب کا سایہ مغربی ممالک کے صدر مقامات پر پڑنے لگا تو عراق کے خلاف طبل جنگ بجا دیا گیا۔ افغانستان خبروں میں سے بھی غائب ہو گیا۔ امریکہ کے فوجی منصوبہ سازوں نے مبینہ طور پر کہا کہ افغانستان اب کوئی ہدف نہیں رہا۔ وہاں پہاڑوں پر دو ہزار پاؤنڈ کے بم پھینکنا دراصل اسلحے کا بہت بڑا زیاں ہے۔ طالبان نے جو بھی زیادتیاں کیں اور بلاشبہ بہت زیادتیاں کیں مگر انہوں نے شاہانہ شان وشوکت سے گریز کیا اور بادشاہوں کی شان کے شایاں محلوں میں رہنے کی بجائے عام رہائش ہی جاری رکھی۔ اس کے ساتھ ساتھ امریکہ کے پاس پہلے ہی بہت بھاری تعداد میں اسلحہ تھا مگر اسے مزید ڈیزی کٹر بم بھی دے دیئے گئے۔ (یہ بم جہاں گرایا جاتا ہے وہاں فٹ بال کی گراؤنڈ کے برابر کھڈا ڈال دیتا ہے) بے بہا اسلحہ کے ساتھ ساتھ امریکی طرز حیات کے مخالفوں کی تعداد بھی اسی حساب سے بڑھتی جاتی ہے اس لیے اسلحہ کی فراہمی اسی شرح سے مسلسل بڑھائی جاتی ہے۔ بندہ کہہ سکتا ہے کہ افغانستان میں مزید توانائیاں اور وسائل صرف کرنے میں امریکہ کچھ ہچکچا رہا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ افغانستان کو تو پہلے ہی کسی حد تک بنجر بنا دیا گیا ہے۔ پہلے روسیوں' پھر عرب اور پاکستانی جہادیوں کے بعد شمالی اتحاد کے جنگ بازوں اور طالبان نے افغانستان میں اتنی تباہی مچائی ہے کہ اب اس کے تن کی صرف ہڈیاں رہ گئی ہیں اس کو جلا کر بھسم کیا گیا۔ لوٹا گیا اور برباد کیا گیا۔ اور یہ سب کچھ امریکہ کی طرف 2001 کے موسم خزاں میں شروع کی گئی بمباری سے پہلے ہو چکا تھا۔ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ امریکی آغاز کار صاف سلیٹ یا الف سے کرتے ہیں۔ تازہ زمینوں کو حاصل کرنے کا خیال، یا علاقے کا حصول یہ سارے دلکش ہدف تو ہو سکتے ہیں مگر ان سب پر یہ خیال مقدم ہے کہ دنیا کو دراصل امریکی تخیل اور تصور کے مطابق نیا روپ رنگ دیا جائے۔

امریکہ کے لیے عراق میں بہت زیادہ ہدف موجود تھے اور مزید یہ کہ امریکہ دنیا پر

ثابت کرنا چاہتا تھا کہ "وسیع بربادی کے ہتھیار" (ڈبلیو ایم ڈی اس کے پاس ہیں۔ عراق میں داخل ہوتے وقت مقصد صرف وسیع تباہی والے ہتھیاروں کو تباہ) کرنا تھا کیونکہ ان ہتھیاروں کے بارے میں کہا گیا تھا کہ ان کا نشانہ مغربی دنیا کے معصوم لوگ تھے۔ (ہر چند یہ حوالہ بھی دیا گیا کہ اگر ضروری ہوا تو صدام حسین ان ہتھیاروں کو اپنے عوام کے خلاف بھی استعمال کرنے کو تیار ہے) امریکہ کے وزیر کولن پاول نے اقوام متحدہ میں معاملہ پیش کیا اور کہا کہ عراق خود کو وسیع تباہی والے ہتھیاروں کے ساتھ لیس کر رہا ہے مگر اس خود ساختہ کہانی کی فوراً ہی تردید ہوگئی۔ تاہم اس پر امریکہ نے بس نہیں کی اور وہ عراق، القاعدہ وسیع تباہی کے ہتھیاروں اور دہشت گردی کو ایک ہی لڑی میں پرونے کا کام کرتا رہا۔ ایک طریقہ یہ تھا کہ صدام حسین کو عہد حاضر کا ہٹلر یا سٹالن ثابت کیا جائے۔ (مغرب کی لغات میں ہٹلر کے معنی ایک بہت بڑے عفریت کے ہیں) یہ دونوں نام مغرب میں وسیع معنے رکھتے ہیں اور ان معنوں میں ہر برائی کو شامل کیا جاسکتا ہے اور اس کے لیے کسی شہادت، کسی دستاویز کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ انفال کے نام پر صدام حسین نے کردوں کے خلاف مہم میں گیس بموں کا استعمال کر کے اپنے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا تھا۔ مگر گیس کا یہ استعمال سب سے پہلے 1965 میں جرمنوں نے پیرس میں جمع فرانسیسی سپاہیوں کے خلاف کیا تھا۔

یہاں یہ بیان بھی دیا جاسکتا ہے اور نحیف آواز میں کہ صدام حسین نے گیس کے استعمال کا طریقہ ونسٹن چرچل سے سیکھا تھا جو 1910 کی دہائی کے آخر میں 1920 کی دہائی کے شروع میں نوآبادیات اور فضائی جنگ کا وزیر بھی رہا تھا۔ سلطنت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد برطانیہ نے عراق پر انتداب حاصل کر لیا تھا تاہم برطانیہ والوں کو بار بار عربوں اور کردوں کی بغاوتوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ مغربی محاذ انسانی جانوں کا بڑا اتلاف ہوا دوسری طرف چرچل اور اعلیٰ برطانوی افسروں نے دیکھا کہ فضائی جنگ نسبتاً سستی پڑتی ہے۔ چنانچہ جنوبی ایشیا، مصر، دارفر اور عراق میں انہوں نے بڑی بمباری کی۔ چرچل کو دو مقاصد کے لیے بڑی جدوجہد کرنا پڑی ایک وسیع وعریض سلطنت کی بقا اور حکمرانی اور دوسرے جانوں کے کم سے کم اتلاف اور دفاعی اخراجات میں کمی۔ چرچل نہ صرف فضائی بمباری کے انتہائی حق میں تھا بلکہ وہ باغی عربوں پر تجربے کے طور پر کیمیاوی ہتھیار استعمال کرنے کا

بھی قائل تھا۔ اس نے فضائی جنگ کے باہر سرہیو ٹرینچارڈ سے مل کر کچھ اس قسم کے بم چلانے کے امکانات کا جائزہ لیا تھا جس سے نشانہ بننے والے کی موت تو واقع نہ ہو مگر وہ لڑنے کے قابل بھی نہ رہے۔ یہ بم شروع میں باغی قبائل کے خلاف استعمال کیے جانے تھے۔ جن لوگوں نے کیمیاوی ہتھیاروں کے استعمال کی مخالفت کی ان کے لیے چرچل کا یہ جواب تھا ''مجھے سمجھ نہیں آتی کہ گیس کے استعمال کو کیوں ناپسند کیا جا رہا ہے کیونکہ میں غیر مہذب قبائل کے خلاف زہریلی گیس استعمال کرنے کا پرزور حامی ہوں''۔ (۵۵)

اگر صدام پر شک تھا اور کسی حد تک صحیح بھی کہ وہ حیاتیاتی کیمیاوی اور ایٹمی ہر طرح کے ہتھیار بنا کر بے پناہ تباہی لانے کی خواہش کر رہا تھا تو اس کے مخالفین یہ ماننے کے لیے بالکل تیار نہیں کیونکہ خود انہوں نے اس قسم کی مثالیں قائم کر رکھی ہیں۔ امریکہ نے حسب معمول دوسروں کے مقابلے میں انتہائی سرعت کے ساتھ وسیع تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کا سوال اخلاقیات کے حوالے سے اٹھایا جبکہ اس وقت دنیا کا واحد اعزاز امریکہ کو حاصل ہے کہ اس نے اپنے مخالفوں کے خلاف کیمیاوی، حیاتیاتی اور ایٹمی ہتھیار استعمال کیے۔ (۵۶) ان میں سے بعض نمایاں واقعات کا ذکر یوں ہے کہ اس نے کوریا کی جنگ میں حیاتیاتی ہتھیار استعمال کیا اور امریکی رضامندی کے ساتھ یہ استعمال جنگ عظیم دوم کے جاپانی جنگی مجرموں کے ذریعے کرایا گیا کیونکہ انہوں نے جنگ کے دوران چین اور اتحادی فوجوں کے قیدیوں کے خلاف ایسے ہتھیار استعمال کیے تھے لیکن دنیا کو ان کی زیادہ خبر نہیں۔ (۵۷) تو پھر سوال یہ ہے کہ صدام حسین نے کس شے کی خلاف ورزی کی؟ یہ وہ خلاف ورزی ہے جو دنیا کی جمہورتیوں، آمرتیوں اور نوآبادیاتی سلطنتوں کے سیاستدانوں اور راہنماؤں نے کی۔ یعنی یہ سانجھا کام ہے۔ یہ سچ ہے کہ صدام نے ان کی زندگی سے نفرت کا اظہار کیا، وسیع پیمانے پر قتل کی تحریک دی، اور بڑے جابرانہ انداز میں مخالفت کو دبایا؟ تو کیا اس کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اس نے وہ کچھ حاصل کرنے کی کوشش کی جو سفید فام حاصل کر چکا تھا۔ صدام، یہ خصوصی امتیاز صرف سفید فاموں کے پاس نہیں رہنے دینا چاہتا تھا۔ صدام نے نسل پرستی کے حوالے سے یورپی اور امریکی حکومتوں کے منہ سے نقاب اٹھانے کی جرأت کی تھی اور حوالہ وسیع تباہی کے ہتھیار بنانے کا بن گیا؟ اتی ابراہام ہمیں اس موقع پر ایک معروف مقولے کی یاد دلاتا ہے کہ بندوقیں بندے نہیں مارتیں انسان مارتی

ہیں، یہ مقولہ عوامی امریکی ثقافت کا بھی حصہ ہے انٹرنیشنل رائفل ایسوسی ایشن کا بھی۔ اس منطق کے حوالے سے ابراہام کہتا ہے کہ وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار اگر مضبوط اخلاق والے ذمہ دار لیڈروں... (جو معروف سفید فام لیڈروں کے علاوہ اور کون ہوسکتا ہے) کے ہاتھ میں ہوں تو وہ ایک ایسی قیمتی ویکسین ہے جس سے ایک نسل ایک گروہ کو بچایا جاسکتا ہے لیکن اگر یہی ہتھیار ایک بدمعاش ملک کے لیڈر کے ہاتھ میں ہوں تو وہ عالم انسانیت اور زندہ ماحولیات کے لیے بہت بڑا خطرہ ہیں۔ ابراہام لکھتا ہے کہ ان ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے کی کوشش اس طرح سے کی جائے کہ ان (لیڈروں قوموں اور ملکوں) پر کنٹرول حاصل کیا جائے جو وسیع تباہی کے خیال سے بقائمی ہوش وحواس یہ ہتھیار استعمال کر سکتے ہیں۔ ہم نے ہتھیاروں پر کنٹرول پانے کی بجائے معاملہ ان کے استعمال کرنے والوں پر کنٹرول پانے تک پہنچا دیا ہے۔(۵۸) شائد بدقسمت عرب اور کرد قبائلی ونسٹن چرچل کے شکر گزار تھے کہ اس نے نہ صرف ان کو غم آلود زندگی سے نجات دلائی بلکہ اس لیے بھی کہ انہیں مغربی فوجی ٹیکنالوجی کے شاندار ارتقا میں حصہ ڈالنے کے لیے بھی چنا گیا۔

اس ساری بحث کے دوران میں یہ معلوم کرنے کے لیے بھی نہیں رکا کہ یہ پتہ کروں کہ وسیع پیمانے پر تباہی کے ہتھیار ہوتے کیا ہیں۔ تاہم اس سے پہلے والے باب میں ان لفظوں اور موضوع کی تنگ دامنی اور کم معنویت کے باعث کچھ کچھ اکھڑ رہا ہوں کہ مغرب کے لیڈروں اور سفیروں نے ان کے معانی اتنے محدود کیوں رکھے ہیں۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ ترقی کا نظریہ دنیا کے لاکھوں دروازوں پر موت کی صورت میں طلوع ہوا پھر عراق کے خلاف لگائی گئی پابندیوں کے باعث ایک ایسا انتظام تباہ ہو گیا جس کی وجہ سے گزشتہ دو دہائیوں میں ہزاروں جانیں تلف ہوئیں، ان انسانی جانوں کے حوالے سے ہم بجا طور پر بندوشوں کو وسیع پیمانوں پر تباہی پھیلانے والا ہتھیار قرار دے سکتے ہیں۔ 1970 اور 1980 کی دہائی میں کسی کو ''وسیع تباہی پھیلانے والے ہتھیار'' کی اصطلاح سے واسطہ نہیں پڑا تھا نہ اسے عام گفتگو میں بولا یا سنا گیا تھا۔ اس کا یہ استعمال کوئی ایک دہائی پہلے شروع ہوا یعنی جب سوویت یونین مقابل کے منظر سے ہٹ گیا اور امریکہ عالمی امور کا واحد گولیتھ (جالوت دیو) بن کر سامنے آیا۔ اس طرح وسیع تباہی پھیلانے والے ہتھیار یا

ایک پرانے زمرے کے احیا کی اس صورت نے جنوب اور شمال اور مغرب اور باقی دنیا کے درمیان طاقت اور علم کا بہت بڑا عدم توازن پیدا کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ نے عراق میں جنگ اس بنا پر لڑی تھی کہ وہ عراق کے وسیع پیانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار ضائع کر کے انسانیت کو ایک بڑے خطرے سے محفوظ کرے گا۔ عراق کے پاس تو یہ ہتھیار تھے ہی نہیں لیکن یہی بات اب امریکی سیاستدانوں اور جنگی منصوبہ سازوں کی سمجھ میں نہیں آ رہی یعنی وہ اس کا اعتراف کرنے کو تیار ہی نہیں۔ یہ امکان بھی غالب ہے کہ بش اور اس کے مشیروں نے 11 ستمبر کا واقعہ ہونے کے فوراً بعد یا اس سے پہلے ہی عراق کو سزا دینے کا سوچ لیا ہو۔ اب وہ بحث فضول اور بے کار ہے اور اس مباحثے کی شرائط کو قبول کرنے کا مطلب وہی ہے جو میں نے اس کتاب کے شروع سے لے کر اب تک ملحوظ رکھا ہے یعنی یہ مختلف زمروں کا استعمار ہے۔ اگر عراق میں وسیع تباہی پھیلانے والے ہتھیار برآمد ہو جاتے تو کیا جنگ پر اعتراض اور نکتہ چینی کرنے والے خاموش ہو جاتے؟ پھر اب انکار یا اختلاف کی اس وقت کتنی گنجائش رہ جاتی ہے جب امریکہ کے وزیر دفاع ڈونلڈ رمز فیلڈ نے ناراض نقادوں کے اعتراضات کو یہ کہہ کر کنارے لگا دیا کہ اگر انسپکٹر عراق میں تباہی والے ہتھیاروں کا پتہ لگانے میں ناکام ہو گئے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ''شہادت کا نہ ہونا نہ ہونے کی شہادت ہے'' رمز فیلڈ کا سیاست کے میدان میں اتنی دیر تک کامیابی سے موجود رہنے کی امریکہ میں بڑی تعریف کی جاتی ہے۔

رمز فیلڈ کو ایک نفسیاتی مریض سمجھ کر بآسانی مسترد کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے بے اخلاق امریکی انتظامیہ کے لوگوں کے ساتھ یہی کام کیا ہے۔ اس نے معقول لوگوں کے استعمال میں آنے والے ان لفظوں ''شہادت''، ''ثبوت''، اور وجہ'' کو بالکل ہی بے معنی بنا دیا ہے۔ یعنی اب ان لفظوں کے بارے میں سوچنا بھی ممکن نہیں رہا۔ امریکہ نے جن حالات اور پس منظر میں عراق پر حملہ کیا اور جس انداز میں امریکہ کے اس ''خواب'' کی تعبیر کے لیے کام کیا گیا اور اس وقت خودسر امریکی کارروائی کے بارے میں جس قدر ناپسندیدگی اور خاموشی کا اظہار کیا جا رہا ہے تو لازم ہے کہ ان کے بارے میں ایک بار پھر چہرہ کشائی کی جائے۔ میں اس سے پہلے بھی اس کتاب میں ایک ایسی ناقابل تردید خوفناک حقیقت کے بارے میں لکھ چکا ہوں جو تاریخ کے اس موڑ پر عالم انسانیت کو درپیش ہے۔

امریکہ زندگی کے تمام شعبوں پر بے پناہ طاقت اور جبر کے ساتھ سایہ فگن ہے۔ بلاشبہ کچھ ایسے سماجی ماہرین بھی ہیں جن کی رائے اس کے برعکس ہے اور اب بھی اپنے خیالات پر مصر ہیں اور امریکی طاقت پر ان کا تبصرہ یہ ہے کہ اگرچہ امریکہ کا مقابلہ تو کسی نے نہیں کیا مگر ویت نام کی جنگ کے بعد یہ مسلسل زوال پذیر ہے (۵۹) مگر ویت نام جنگ کے دنوں میں تو امریکہ کی فوجی طاقت کے مقابلے میں ایک اور طاقت موجود تھی لیکن اب تو امریکہ کی فوجی برتری کا کوئی مقابل رہا ہی نہیں اور یہ بدیہی بات ہے جس پر کوئی تنازعہ بھی نہیں۔ (۶۰) امریکہ بلاشبہ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے، دنیا کی آنکھیں اس پر لگی ہیں۔ اس کے بارے میں لوگوں کے تاثر مندرجہ ذیل عناصر کے ساتھ ملے جلے ہیں حیرت، لاتعلقی، خوف، نفرت، تعریف اور عقیدت اور یہ سب تاثرات دراصل ملک کی نیشنل سیکورٹی سٹریٹیجی سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس وقت امریکہ اسی سیکورٹی سٹریٹجی کا پابند ہے۔ اس دستاویز میں صاف طور پر اعتراف کیا گیا ہے ''اس وقت امریکہ بے مثال فوجی طاقت ہے اور اس کے معاشی اور سیاسی اثرات بہت ہیں'۔ اسی (دستاویز) سے امریکی سیاستدان اور ''خیال امریکہ'' کے قائل لوگ انتہائی ڈھٹائی کے ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا میں اس وقت کارخیر کرنے والی واحد عظیم طاقت امریکہ ہے چنانچہ جو کوئی بھی امریکہ کی طاقت کم کرتا ہے وہ دنیا کی طاقت کم کرتا ہے۔ نیشنل سیکورٹی سٹریٹجی میں کہا گیا ہے کہ کہ دفاع پر اس قدر خرچ کرو اور خود کو اتنا مضبوط کرو کہ کوئی ہمسری نہ کر سکے، امریکی فوجی طاقت اتنی ہونی چاہیے کہ دوسرا کوئی اس کے برابر آنے یا اس سے آگے بڑھنے کا سوچ بھی نہ سکے۔ (۶۱)

اب کوئی پندرہ برس ہونے کو آئے ہیں جب اقوام متحدہ نے عراق پر امریکی بمباری کے اثرات کا سروے کروایا تھا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ عراق پر اتنی تباہی آئی ہے کہ اسے ماقبل صنعتی دور میں بھیج دیا گیا ہے۔ (۶۲) یہ جائزہ اب اتنے برس بعد تو صحیح نظر نہیں آتا اب تو خرابی اور بھی بہت بڑھ گئی ہے۔ اگر عراق کو کویت سے نکالنے اور صدام حسین کی فوجی طاقت توڑنے کے لیے امریکہ نے غیر معمولی بلکہ فضائی طاقت کا بے مثال استعمال (1993) میں کیا تھا تو اس بمباری کا کیا حال ہوگا جو 1999 میں یوگوسلاویہ پر کی گئی جس میں امریکہ کے یورپی اتحادی بھی اس کے ساتھ تھے اور پھر اس ''تحیر اور صدمے'' والی

کارروائی کو کیا کہیں گے جو روشنی اور آواز کی صورت میں 2003 میں بغداد پر کی گئی؟ ایک خوفناک دہشت گردی کا منظر بیان کرنے کے لیے تفریح و تماشا کی زبان استعمال کرنا تو مناسب نہیں مگر امریکہ نے جبلی بربریت کے اور جو تحفے تہذیب کو دیئے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ فضا سے دہشت گردی کرنے کی بھی ایک طبعی تاریخ ہے اور میں پہلے اس کا اشارہ دے چکا ہوں، بہرطور اب بات زیادہ واضح ہوئی ہے کہ ہر نئی فضائی جنگ میں پہلی جنگوں کے مقابلے میں زیادہ شدت آجاتی ہے۔ (۶۳) کہا جاتا کہ دوسری جنگ عظیم کی پوری مدت میں جتنے بم گرائے گئے اس سے کہیں زیادہ بم 1991 میں عراق پر گرائے گئے اور اب جو تازہ حملہ یعنی ''تحیر'' اور صدمہ والے حملوں میں بمباری کی اور سرحدیں عبور کر لی گئی ہیں۔ بہرطور 1991 کی خلیج کی جنگ کی کیا خاص خاصیت تھی۔ یہ مابعد سرد جنگ کے زمانے میں پہلی جنگ تھی۔ اس وقت بھی پہلے (سینئر) صدر بش کویت کو عراقی جبر و ستم اور غلامی سے آزاد کرانا چاہتا تھا۔ ساری دنیا کو باخبر کیا جانا تھا کہ امریکہ بدمعاش ملکوں سے بات چیت نہیں کرے گا اور وحشیانہ فوجی طاقت کو ہزار پوائنٹ کی روشنی کا تڑکا (یا جاگ) لگایا جائے گا۔ پھٹتے ہوئے بم اور چیختے چنگھاڑتے ہوئے میزائل رات کو آتشبازی کا منظر پیش کرتے ہیں مگر بش سینئر نے ہزار پوائنٹ روشنی کے حوالے سے دنیا کو منور کرنے کا زیادہ اعلیٰ تصور دیا۔ 1990 کی ساری دہائی میں امریکہ نے اپنے دشمنوں اور بدکاروں پر بمباری کی۔ اس کے ذریعے دراصل یورپی دنیا کو یہ تاثر اور اطلاع پہنچانا تھا کہ امریکہ اپنے جانی دشمنوں اور نقادوں کو بھی اس روشنی سے منور کرے گا یعنی انہیں بھی گرم جوشی، نیکی اور لامحدود عنایت دے گا۔ ایک بڑی مکروہ اصطلاح ''کولیٹرل نقصان'' ہم باز و نقصان'' سول انسانی جانوں کے اتلاف کے لیے استعمال کی گئی اور دنیا کو یقین دہانی کرائی گئی کہ امریکہ قوم کے طور پر مکمل طور پر اس خیال سے متفق ہے کہ انسانی جان بڑی مقدس ہے'' (۶۴) اور وہ صرف ٹھیک نشانوں کی جنگ کر رہا ہے۔ انسانی زندگی کی بقا کے لیے بے حد و حساب اربوں ڈالر ہتھیار بہتر سے بہتر بنانے اور ڈیلیوری سسٹم کو ترقی دینے پر خرچ کیے جا رہے ہیں۔ اس نظریے پر جنگ کے دنوں میں بھی عمل پیرا امریکہ ایک طرف زندگی بچانے کا دعویدار تھا دوسری طرف ایک ایسی غیر انسانی سرگرمی دکھا رہا تھا جس کے ذریعے موت اور تباہی وارد کی جاتی ہے۔

پہلی خلیجی جنگ (٦۵) کے دس سال بعد طیارے ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹا گان کی طرف ایسے بڑھے جیسے میزائل امریکہ کے امن کو زیر و زبر کر رہے ہوں۔ بش سینئر نے عالمی برادری سے امداد چاہی۔ بش جونیئر نے دہشت گردی کے خلاف مخلوط جہدوجہد کا منتر پڑھنا شروع کر دیا۔ امن بحال رکھنے کے لیے آخری راستہ جنگ کا ہے۔ یہ دلیل فوری طور پر چلا دی گئی۔ (٦٦) 11 ستمبر کو قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یہ وہ دن ہے جب امریکہ کے ہر شعبہ حیات کے لوگوں کو متحد ہو کر ''انصاف اور امن' کے لیے جدوجہد کرنے کا عہد کرنا ہے۔ جو قوم جنگ کی عادی ہو چکی ہو اس کا ایک دن امن اور امان کے خیالات کے لیے وقف کرنا ایک بڑا کارنامہ ہوگا۔ تاہم جو کوئی آج کے سیاسی رخ اور دھارے سے آگاہ ہے وہ ایک دم جان جائے گا کہ نائین الیون تو نامعلوم مستقبل تک دہشت گردی کے خلاف جنگ کی علامت بن گیا ہے۔ اس کے زیادہ تر دشمن نامعلوم ہیں۔ ان کی کوئی تعریف نہ ان کا نام ونشان ہے جو لوگ اب بھی 11 ستمبر کے نام سن کر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں ان کے لیے تو امن ایک بہت ہی دور کی شے ہے۔ اس کے علاوہ جو کوئی امریکی سیاست کا شاہد ہے اس کا ایک ناگزیر تاثر یہ ہوتا ہے کہ امریکہ میں عام بات چیت میں ''امن'' کا کوئی مقام ہی نہیں ہے۔ اور قومی کامیابی کے لیے نیشنل سیکورٹی سٹریٹیجی کا نسخہ ہی تیر بہدف سمجھا جاتا ہے جس کے مطابق آزادی، جمہوریت اور آزاد سرمایہ داری (سوداکاری) ہی اصل مقصود ہیں اور ''دہشت گردی کی لعنت'' غلامی، چوری اور نسل کشی کے مترادف ہے۔ جنگ ایک لعنت ہے اور ہمیں اسے ختم کرنا ہے لیکن اگر جنگ برائیوں میں سے ایک برائی نہیں ہے تو پھر مذہبی اور سیاسی اعتبار سے امن کا مقام کون سا ہے؟ امریکہ کہتا ہے کہ وہ بڑی احتیاط اور بغیر مکمل رضامندی کے جنگ کر رہا ہے۔ چنانچہ بہت سے نقادوں کا خیال ہے کہ مندرجہ بالا وجوہ کے علاوہ بھی امریکہ کا یہ حرمت تاریخ پر حملہ ہے۔ امریکہ نے اپنی ظاہر کردہ منزل کے حوالے سے دنیا کو یہ کہا تا کہ وہ امریکہ کو اپنے ہتھیاروں کے ساتھ رہنے دے۔ اگر امریکہ اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا تو پھر یہ ظاہر کردہ منزل دراصل میثاق توسیع (وسعت پسندی) ہے۔

مرتد مورخ ولیم ایپل مین ولیمز نے زیادہ تر تحقیقی کام ''بابائے امریکہ'' (ان کے تھیوڈور روزویلٹ ایسے جانشینوں کو بھی نظر انداز کر دیا) کی اس خواہش کے بارے میں کیا

کہ امریکہ بھی ایک سلطنت بن جائے۔ یہ ان کی شدید خواہش (بھوک) تھی۔ روز ویلٹ جیسے ان کے جانشینوں نے تو پھر (دنیا کو ہنکانے کے لیے) ڈنڈا اٹھا ہی لیا (۶۷) اور اسے اپنا اخلاقی فرض بھی قرار دیا۔ عراق پر امریکہ کے موجودہ حملہ کی داستان اصل میں بش، چینی، رمزفیلڈ، ولفووٹز اور بیرل جسے شکروں ہی کی داستان ہے جنہوں نے عرصہ ہوا یہ کہا تھا کہ صدام حسین کو نکالا جائے، تاہم زیادہ بہتر یہ یاد رکھنا ہے کہ امریکہ کی تاریخ میں کئی بار ایسے ہی سازشی لوگ آئے ہیں جنہوں نے امریکہ کی سامراجی خواہشوں کا اظہار سرعام کیا۔ وارن زمرین نے حال ہی میں انیسویں صدی کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے جس میں اس زمانے کو ''پیداواری زمانہ'' قرار دیا گیا جب فلپائنز، پورٹیوریکو، گوام اور کیوبا امریکہ کے مطیع تھے۔ یہ کتاب ہمیں یاد دلاتی ہے کہ پنچ سنگتی، ٹیڈی روز ویلٹ، سینیٹر کیٹ لاج، سیکرٹری آف سٹیٹ جان ہے بحری جنگ کا ماہر الفرد وتھیئر ماہاں اور وزیر جنگ ایمھو روٹ نے کس طرح امریکہ کو ایک سلطنت بنا دینے کی سازش کی کیونکہ اس کی اپنی سرحدیں تو محدود ہو گئی تھیں یہ لوگ ذرا موٹی عقل کے تھے مگر دیانتدار تھے۔ جنگ کے لیے جنگ کا ہی محکمہ قائم کیا گیا اور اس کے وزیر ماہاں نے یہ اعلان کرنے میں ذرا دیر نہیں کی ''سچ پوچھیں تو میں استعماری ہوں'' (۶۸) محکمہ دفاع نے ملک کے دفاع کے جو بھی دعوے کیے ان سے قطع نظر وہ جارحانہ جنگ کرتا ہے۔ جیسے ویت نام اور عراق کی جنگ اس کا ثبوت ہیں۔ ''وطن'' ایک لفظ ہے جس کے اندر بہت پیچیدہ معانی اور اشارے ہیں۔ اس میں ایک آباد جگہ کی تاریخ کا مطلب بھی موجود ہے اور اگلے مرحلے کے نامعقول تصور کا بھی (۶۹) (یعنی اپنے ملک سے باہر نکل کر دوسرے ملکوں میں حاکم کی طرح حکومت کرنے کا)

ایک گروپ کا یہ نظریہ ہے کہ امریکی کاروبار کی روح جنگ بازی سے اور اس کی آزادی کی تمام دستاویزات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تو دراصل ایک سلطنت یا قلمرو کا میثاق ہیں۔ دوسرا گروہ وہ ہے جن کی نظر میں اور سخت الفاظ میں امریکہ ہمارے عہد کا بہت بڑا بدمعاش ملک ہے۔ (۷۰) یہ دونوں قسم کے دلائل ان گروہوں کی طرف سے دیئے جاتے ہیں جو امریکہ کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ ہمارا کہنا ہے کہ امریکہ کو روائتی طور پر استعماری طاقت نہیں کہا جا سکتا اور ماسوائے ایک چھوٹے سے عرصے کے امریکہ نے کبھی نوآبادیاں نہیں بنائیں۔ اگر امریکہ کی کوئی سلطنت ہے بھی تو وہ ہے امریکی ثقافتی استعمار،

اشیائے صارفین کی بے تحاشا پیداوار اور ساری دنیا میں امریکہ کی ثقافتی پیداوار کی کھپت جو آدھی سے زیادہ دنیا میں موجود ہے۔ اس نظریہ کے حامل لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بھی عالمی امور میں ایک تضاد ہے۔ ہارورڈز کے صدر اور کلنٹن سرکار کے سابق اعلیٰ افسر لارنس سمرز کے الفاظ میں امریکہ ایک غیر استعماری سپر پاور ہے (۷۱) ایک مثال 2003 میں میکلڈ ونلڈز کی۔ 121 مما لک میں تیس ہزار شاخیں تھیں اور ہر روز ساڑھے چار کروڑ گاہکوں کو بھگتاتا تھا۔ بہرطور جو لوگ اس دلیل یا حقیقت کو بڑا اچھال رہے ہیں انہیں خبر ہونی چاہیے کہ جڑواں ٹاوروں پر حملے اور افغانستان پر بمباری کے بعد امریکی فوجی دنیا کے ایک سو چالیس مما لک میں موجود تھے، کیا کوئی سلطنت اس سے بڑا کام کر سکتی ہے؟ ساری دنیا تو امریکی فوجی اڈوں کے دائرے میں گھری ہوئی ہے تو کیا ہمارے پاس یہ بیان کرنے کے لیے الفاظ ہیں کہ امریکی فوج ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے ساری دنیا میں پہنچی ہوئی ہے؟

بہرطور ایک زیادہ زور دار دلیل یہ ہے کہ امریکہ صرف ایک تو ہے ہی نہیں کہ یکتا یا یک سنگی امریکہ ایک سے بڑھ کر ایک امریکی فوجی دیو (جگرناٹ) بھی ہے جو ایک کمزور ملک پر گرتا ہے پھر دوسرے کے ہاں پسر جاتا ہے۔ امریکہ ایک ایسا ملک ہے جس کے غیر ملکی تعلقات کے حوالے سے دوسرے ملکوں سے بڑے جھگڑے ہیں اور پھر اس کا اپنی اقلیتوں سے رویہ بھی توجہ طلب ہے۔ (۷۲) امریکہ کے بے باک نقادوں آنجہانی ایڈورڈ سعید، نوم چومسکی اور ارون دھتی رائے کی تقریباً ایک ہی رائے ہے دنیا امریکہ سے نفرت نہیں کرتی بلکہ اعلیٰ امریکی سیاستدانوں کے غرور و تکبر، منافقت، ریاکاری اور جنگ بازی اور امریکہ کی طرف سے بین الاقوامی تنظیموں اور معاہدوں کو ماننے سے انکار کے رویے سے نفرت کرتی ہے۔ (۷۳) رائے نے حال ہی میں امریکہ کے حال پر مزید تبصرہ کیا ہے۔ اس نے بغداد میں بربریت کا مظاہرہ کرنے والوں کی مذمت بھی کی اور پھر ہر شہری سے اپیل کرتی ہے کہ وہ یورپ امریکہ میں جنگ کے خلاف مظاہرہ کریں اور آخر میں کہتی ہے کہ امریکی حکومت اور امریکی طرز حیات پر سب سے زیادہ عالمانہ، نفرت انگیز اور مزاحیہ تنقید امریکی شہریوں کی طرف سے کی جاتی ہے۔ (۷۴) رائے اخلاقی اقدار انداز گفتگو وغیرہ کی بنا پر اپنے طور پر امریکیوں کی خیرسگالی پر ایمان لا سکتی ہے مگر کیا کسی یک سنگی ملک

میں ایسا ممکن ہے؟ اگر ساری دنیا کو برباد کرانے کی ضرورت ہے کہ ایک طرف امریکہ اپنے طور پر آزاد دنیا کا ترجمان بنا بیٹھا ہے دوسری طرف وہاں پر ہمارے خیال سے زیادہ سیاسی تنوع اور رنگا رنگی ہے تو پھر اس کا مطلب ہے کہ کوئی نہ کوئی خامی رہ گئی ہے کوئی شے شمار میں نہیں آئی؟ اس میں شک نہیں کہ امریکی حکومت یا امریکی ریاست خود کو صرف امریکی معاشرے کا ملک یا حکومت نہیں سمجھتے جیسے کہ طالبان خود کو صرف افغانستان کا نمائندہ سمجھتے ہیں تو ایسی صورت میں پھر امریکی عوام سے جواب طلب کیا جانا چاہیے کہ وہی بڑی حد تک اس قسم کی حکومتیں لاتے ہیں۔ اسی طرح افغان عوام کو اپنے اوپر ٹھگ مسلط کرنے کا ذمہ دار قرار دینا چاہیے؟

میری عرض یہ ہے کہ امریکہ کے نوم چومسکی اور ارون دھتی رائے جیسے خوش بخت نقاد اور مائیکل مور جیسے شوریدہ معترض اپنے طور پر بے دھیانی میں امریکہ کو سلطنت (سامراج) بنانے میں مدد دے رہے ہیں۔ چومسکی کو امریکی نسل پرستی اور امریکی سامراج کے خلاف غصے میں زوردار خطبہ پڑھنے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ یہ بات سارے امریکہ کو پتہ ہے اس نے بڑی محنت سے اعلیٰ درجے کی دستاویز کی مدد سے بڑھ چڑھ کر تنقید کی مگر امریکہ کی خارجہ پالیسی میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں پڑا۔ مائیکل مور نے فارن ہیٹ 9/11 کے نام سے فلم بنائی۔ امریکہ میں بڑی پسند کی گئی اور اسے انقلابی اختلاف کا نام دیا گیا۔ حالانکہ اس میں سول سوسائٹی کے اداروں پر کوئی تنقید نہیں کی گئی، اس میں امریکہ کی خارجہ پالیسی کے کچھ پہلوؤں کو بھی سامنے لایا گیا ہے مگر اسرائیل ریاست کی نمود و پرداخت میں امریکہ کے غیر معمولی کردار کا اشارتاً بھی ذکر نہیں آیا۔ مگر جب فلم سٹیج پر بڑی کامیاب ہوگئی تو ہر کسی کو یہ سوچ کر خوشی ہوئی کہ امریکی جمہوریت پھل پھول رہی ہے۔ مور' چومسکی کے مقابلے میں اس سوال کو زیادہ واضح صورت میں پیش کرتا ہے کہ غیر سرکاری اور اختلافی نظریات ان لوگوں کے اسلحہ خانہ کا حصہ کیسے بن گئے۔ جو یہ جانتے ہیں کہ آزادی کا علمبردار ہونے کی بنا پر امریکہ کو ایک غیر معمولی کردار ادا کرنا ہے۔ چومسکی کو ہمیشہ اس امر کی مثال بنا کر پیش کیا جاتا ہے کہ امریکہ میں کس طرح اختلاف رائے کو برداشت کیا جاتا ہے۔ اس کی کڑی تنقید کو بھی شکریے سے قبول کیا جاتا ہے اور اس سے ثابت کیا جاتا ہے کہ امریکی جمہوریت' آمریت یا کلیت پسندی سے کتنی دور ہے۔ دریں اثنا آبدوز کی گھنٹیاں بجتی رہیں گی اور قوم

کی صحت کا تعین سٹاک مارکیٹ کی کارکردگی کے حوالے کیا جاتا رہے گا۔ ولیم اپیل مین ولیمز نے جب یہ کہا تھا کہ ''جب کسی کو اپنی ضرورت سے زائد مل جائے تو جان جائیے کہ ایمپائر (سلطنت) اب طرز حیات بننے کو ہی ہے۔ (۷۵) اس تبصرے سے لگتا ہے کہ ولیمز نے اندر کی بات پوری طرح سمجھ لی ہے۔ امریکہ کو (ری پبلکن ایمپائر) بنانے کے خیال کے ابتدائی نظریہ سازوں کو احساس ہوا کہ جب تک آبادی کے بڑے حصے کو اپنے معاشی تجارتی کام کرنے اور مذہبی احساسات میں ایک حد تک آزادی یا کشادگی نہیں دی جائے گی اس وقت تک وہ سلطنت کو سمندر پار قائم کرنے کے بارے میں لاتعلق رہیں گے یا زیادہ سے زیادہ بات سن لیں گے اور قبول بھی کر لیں گے۔ اگر ملک کے اندر یا گھر کے اندر آزادیوں کا تحفظ مطلوب ہے تو پھر اس مطلوب بات کو سائنسی اعتبار سے غلط ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اسے الٹی طرف سے باندھ کر نیشنل سیکورٹی سٹیٹ کے نظریے سے منتج کرنے پر یعنی سمندر پار مداخلت کے لئے فوجی مشین کو ایک دم تیار کیا گیا اور صدر کو پوری آزادی دے دی گئی۔

جس کسی نے بھی امریکہ کی تاریخ کا غور سے مطالعہ کیا حیران ہوتا ہے کہ امریکہ میں دوسرے جمہوری ممالک کے مقابلے میں اختلاف اور انکار بہت کم رہا۔ جہاں کئی دہائیوں سے سیاسی مقابلہ صرف دو پارٹیوں میں رہا اور بعض معمولی گھریلو معاملات کو چھوڑ کر باقی سارے معاملات پر ان میں اتفاق رہا اس کے باوجود یہ ملک جیفرسن کے الفاظ میں دنیا کی بہترین امید گاہ ہے۔ امریکہ کا خواب استعمار کی بجائے سلطنت (ایمپائر) سے بنا ہوا ہے یعنی وہ استعمار کے نہیں سلطنت کے خواب دیکھتا ہے۔ بہت سے لوگ یہ سوچیں گے کہ امریکہ کے اس وصف سے تو ہم صرف ہالی وڈ تک پہنچیں گے جس نے تقریباً ساری دنیا پر اپنا غلبہ قائم کر رکھا ہے۔ یا چند لوگ یہ اصرار کریں گے کہ ہالی وڈ کو صرف ایک بڑا اسٹوڈیو ہی نہ تصور کیا جائے جو بڑے تمکنت اور وقار والے ایکٹر پیش کرنے میں ہی ممتاز نہیں بلکہ یہ امریکی میڈیا کا بھی ایک نیٹ ورک ہے جس پر زبردست تفریح تماشا پیش کیا جاتا ہے جو کل عالم تک پہنچتا ہے۔ مگر میں تو اپنی انتہائی مختصر سی بات آپ تک پہنچانا چاہتا ہوں اور اس ترکیب کے ذریعے۔ 'کارخواب': اس میں کوئی شک نہیں کہ ہالی وڈ خوابوں کی ایک بہت بڑی کامیاب فیکٹری ہے اور دنیا میں امریکہ کے بارے جو خیال یا ہیولا بنتا ہے وہ بڑی حد

تک امریکی فلموں، خبروں کے نکاس اور ٹی وی شو سے بنتا ہے۔ دنیا میں فلم سازی کی جو نوع بنوع روائت قائم ہوئی ہے وہ بھی دراصل ہالی وڈ کی ثمر باری اور امریکہ کے آزاد فلم سازوں کی مرہون منت ہے۔ کارخواب سے میری مراد ہے امریکی خواب میں کیے گئے وعدے سے بھی زیادہ اور اس سے بھی زیادہ بھرپور اور اس کے ساتھ اس کی دعوت۔ یہ سب کچھ لبرٹی کے مجسمے پر کھدی سطور میں جھلکتا ہے بلکہ یہ سب کچھ لبرٹی اور اس کی مشعل پر بھی کھدا ہوا ہے ان سب کے لیے امریکہ میں آنے کی دعوت ہے جو دنیا کے لاوارث، دھتکارے ہوئے، کمزور، بے بس اور مظلوم ہیں اگر گزشتہ دو دہائیوں کی امیگریشن (ملک میں آنے) اور نیچرلائزیشن (آئی این ایس) کی پالیسیاں راہنما بنائیں۔ امریکہ اور میکسیکو کی سرحدوں پر فوج کے پہرے کو دیکھیں اور ایف بی آئی کی طرف سے نوجوان مسلمانوں کو گھیرنے پر نظر کریں اور پھر آئی این ایس (اب یہ محکمہ ہوم لینڈ کے محکمہ میں مدغم کر دیا گیا ہے) اس بات کا ناقابل تردید ثبوت پیش کرتا ہے کہ اب غریبوں، مظلوموں، لاوارثوں اور صرف معاشی آسائش کے متمنی لوگوں کو واضح طور پر کہہ دیا گیا ہے کہ وہ اپنے خوابوں کی تعبیر دوسری سرزمینوں میں تلاش کریں۔

اب امریکی خواب یعنی امریکہ میں آنے کا خواب بہت ہی کم لوگوں کا پورا ہوگا۔ ہندوستانی، ہانگ کانگ کے چینی، ایرانی جو یہاں آئے وہ زیادہ تر اپنے ملک کے نسبتاً کھاتے پیتے طبقے سے تعلق رکھتے تھے مگر امریکہ کے کارخواب میں بہت غیر معمولی لچک ہے۔ کمبوڈیا پر کی گئی خفیہ بمباری اور کسانوں کے ایک ملک پر جنگ تھوپ کر تیس لاکھ لوگوں کو مارنے والے کے بارے میں کمبوڈیا اور ویت نام والوں کے دلوں میں بڑی تلخی پیدا ہونی چاہیے تھی۔ امریکی سیاست پر ویت نام کے آسیب کا سایہ بڑا لمبا ہے مگر ویت نامیوں کے لیے اس کے کوئی معنی نہیں۔ ویت نام کے بارے میں امریکہ کے آزادیا جنگ میں مارے جانے والوں کی یاد میں ہونے والی تقریب میں ان تینتیس لاکھ مارے جانے والے ویت نامیوں کا کہیں تذکرہ نہیں ہوتا۔ اس بارے میں اکثر بحث اس نکتہ پر ہوتی ہے کہ ویت نام کی جنگ نے امریکیوں سے کیا کیا اور اس بات پر نہیں ہوتی کہ امریکہ نے ویت نامیوں کے ساتھ کیا کیا۔ خیر جو ہوا سو ہوا آج امریکیوں کو ویت نام میں کیسے قبول کیا جاتا ہے؟ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جو لوگ جنوبی ویت نام سے بھاگے امریکہ میں آن ٹھہرے وہ تو

اس ملک کے شکر گزار ہوں گے کہ اس نے انہیں کمیونزم کی سخت کوش بلکہ خطرناک زندگی سے بچا لیا۔ اب ویت نام میں امریکی سرمایہ کاری' امریکہ کے ثقافتی اداروں کے لیے تپاک اور بڑھتے تجارتی تعلقات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ویت نامیوں نے بڑی حد تک اپنے ملک پر ہونے والی بربریت کو بھلا دیا ہے۔ بہر طور ویت نامی زیادہ عملی اور حقیقت پسند لوگ ہیں۔ وہ ایک قدیم تہذیب کے وارث ہیں اور ایک قدیم تہذیب ہی کھلے دل کے ساتھ معاف کرنا جانتی ہے اور دل کی سخی ہوتی ہے۔

امریکہ میں آ بسنے والوں میں سے مواقع اور اظہار کی آزادیوں سے فیضیاب ہونے اور اس زرخیز سرزمین کے بارے میں بڑے جوش سے رطب اللسان ہونے والوں میں سے کتنوں کو یورپیوں کی امریکہ کے قدیم باشندوں سے لڑائیوں کی تاریخ سے واقفیت ہے؟ ریڈ انڈینز کے ساتھ جنگوں، غلاموں کی تجارت، کاشت کے غلاموں، جم کرو ساؤتھ کے بارے ان آنے والوں کو کیا پتہ ہے اور انہیں اس غیر معمولی حقیقت کا کہاں تک علم ہے کہ تین کالے امریکیوں میں سے کم از کم ایک کالے نے کچھ عرصہ ضرور قید میں گزارا ہے۔ پھر یہ سوال بھی ہے کہ قدیم امریکیوں کو ملیا میٹ کرنے کا کام تو تقریباً مکمل ہو گیا تھا امریکیوں نے مرکزی اور جنوبی امریکہ، فلپائن اور ہند چینی میں توڑے جانے والے مظالم کی اپنی تاریخ کو کیسے نظر انداز کر دیا۔ جو کوئی جرمنی کی تاریخ پڑھے گا وہ لازماً لاکھوں یہودیوں، خانہ بدوشوں، ہم جنس پرستوں اور معذور اور بے کار ناپسندیدہ لوگوں کی ہلاکتوں اور قتل کو کیسے بھول جائے گا، یہ ہولوکاسٹ (نسلوں کا قتل عام) ہے جرمنی میں تو ہولوکاسٹ سے انکار کرنا قابل سزا جرم ہے۔ جرمنی میں عسکریت پسندی کے خلاف زبردست جذبات پائے جاتے ہیں۔ ان کا منبع بھی یہ ہے کہ جنگ سے ہر صورت گریز کیا جائے اور اگر جنگ کی بھی جائے تو انتہائی صورت حال میں اور وہ بھی صرف اپنے دفاع میں۔ امریکہ کے بے شمار مداح جو ویزے پر امریکی ساحلوں پر پہنچنے کے لیے بے تاب ہیں اور امریکی شہریت سے وابستہ فوائد سے فیض یاب ہونا چاہتے ہیں وہ امریکیوں کے ہاتھوں امریکہ کے اندر کیے گئے مظالم کا بھولے سے بھی ذکر نہیں کرتے حالانکہ ان مظالم کی بھی وہی حیثیت اور نوعیت ہے جو جرمنی کے ہولوکاسٹ کی ہے۔

امریکیوں، سیاستدانوں اور عام لوگوں کی بات سنیں تو وہ کہتے ہیں کہ بانیان امریکہ

نے اپنی تیرہ نوآبادیات کو بھی آزادی کا تحفہ دیا اور پھر جتنی دنیا یہ تحفہ لینے پر رضامند تھی اسے یہ تحفہ ملا۔ تاثر یہ دیا جاتا ہے کہ صرف سفید فام آبادکاروں نے انگریزوں کی ظالمانہ حکمرانی میں لڑ کر یہ آزادیاں حاصل کیں۔ جب کبھی امریکی صدر ''امریکی عوام'' سے خطاب کرتا ہے اور اخلاقیات کا درس دیتا ہے۔ اس میں بانیان کا حوالہ تو ہوتا ہے مگر کبھی بھی قدیم امریکیوں کے قتل، کالوں کی مسلسل غلامی کا کوئی حوالہ کوئی اشارہ نہیں ملتا اور کہا جاتا ہے کہ یہ سب رضائے خدا تھی۔ جارج واشنگٹن نے 7 ستمبر 1783 کو لکھا ''میری یہ واضح رائے ہے پالیسی اور معیشت دونوں کا تقاضا ہے اور ہماری غرض بھی ہے کہ انڈینز (ریڈانڈینز) کے ساتھ اچھا سلوک روا رکھا جائے اور انہیں بزور شمشیر ان کے علاقوں سے نکالنے کی بجائے ان سے زمینیں خریدی جائیں۔ انہیں ان کی زمینوں سے نکالنا ایسا ہی جیسے درندوں کو ان کے جنگلوں سے مار بھگانا... جیسے جیسے ہماری آبادیاں پھیلتی جائیں گی ویسے ویسے وحشی بھی بھیڑیوں کی طرح پیچھے ہٹتے جائیں گے۔ دونوں درندے... خواہ شکل وصورت میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں (۷۶) امریکی آئین کو ایک ایسی دستاویز کہا جاتا ہے جس میں انسانی معصومیت اور آزاد لوگوں کی اپنے آپ پر حکمرانی کرنے کی حتمی آرزو کا اظہار دراصل ایک معجزے سے کم نہیں اس آئین کے تحت ریاستوں (صوبوں) کو اجازت دی گئی تھی کہ ایوانِ نمائندگان اور انتخابی کالج میں اپنی نمائندگی کے لیے اپنی غلام آبادی کے پانچ میں سے صرف تین (یعنی ساٹھ فیصد) حصوں کو شمار کریں۔ (۷۷) انگریزی کے سادہ الفاظ میں یہ کہ بانیان کا اتفاق ہے کہ ایک کالا پورا ایک انسان نہیں ایک انسان کے صرف تین حصے (60 فیصد) ہے۔ پھر اس بات کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ جب کالوں پر عزت کی یہ عنایت ارزاں کی گئی تھی اس پر اس وقت آزادی کے متوالوں میں سے کسی نے بھی اظہار ناراضگی کیا تھا؟

اس کے باوجود ان تضادات کے حوالے سے کسی نے وضاحت نہیں کی کہ کوئی ایسی کارروائی نہیں کی گئی جو مظلوموں کو بھی ان سے الگ کرنے کی کوشش سمجھ جاتی جو طاقت کے بل بوتے پر ستم کر سکتے تھے۔ ہر قوم تو یہ دعویٰ نہیں کرتی کہ وہ نہ صرف اپنے لیے بلکہ ساری دنیا کے لیے آزادی کی مشعل بردار ہے۔ کوئی قوم یہ نہیں سوچتی جیسا کہ سوچنا چاہیے کہ آزادی ناقابل تقسیم ہے اور اس کے ساتھ ہی ایسی پالیسیوں پر عمل کرتی ہو جس کے ذریعے

بعض لوگوں کو آزادی سے محروم کر دیا جائے اور پھر ایسے نتائج حاصل کرے جو آزادی اور جمہوریت کی علی الاعلان تصدیق کے بالکل الٹ ہوں۔ اس قوم نے آمروں کو شکست دی، موت کے کیمپ ختم کیے اور ہر غلام اور مقبوضہ سرزمین میں آزادی کا چراغ لے کر پہنچی۔ بش نے یہ الفاظ اپنے ٹیلی ویژن کے خطاب میں امریکیوں کو یاد دلائے اور پھر ایسے ایسے انداز اختیار کیے جو بش ایسے سیاستدانوں سے توقع کی جاتی ہے۔ امریکہ کا یہ آدرش ساری نوع انسانیت کے لیے ایک امید کا پیغام ہے، یہ امید لاکھوں کو یہاں لائی ہے۔ یہ امید اب بھی ہماری راہیں منور کرتی ہے اور اندھیروں میں یہ روشنی اور بھی چمک اٹھتی ہے اور ظلمت کبھی اس پر غلبہ نہ پا سکے گی (۷۸) یعنی پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا) بعض کا خیال ہے کہ بش مذہبی الہام کی سی زبان بولتا ہے۔ مثلاً عراق کو تنبیہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ عراق کا یوم حشر بہت قریب ہے۔ یہ انداز تخاطب عیسائی مذہبی محاورہ کے مطابق ہے اور یہی اس کا مذہب ہے۔ امریکی تاریخ کے بارے میں علمی روائت ہے کہ یہ مذہبی محاورہ بہت دیر سے امریکی تاریخ میں چل رہا ہے اور دوسرے یہ کہ امریکیوں میں یہ نظریہ عام پایا جاتا ہے کہ امریکہ کو خدا کی طرف سے چن لیا گیا ہے کہ وہ دنیا کو آزادی اور خوشحالی کی معراج پر لے جانے میں اس کی قیادت کرے۔ اگر امریکہ کا یہ دعویٰ ہے کہ انسان کے آزادی کی طرف سفر کی کہانی میں امریکہ کو ایک ممتاز اور بے مثال مقام حاصل ہے اور اس کے معاملات طے کرنے میں آسمانی ہاتھ بھی ہے تو پھر اس کے معیار بھی اسی حساب سے بلند ہوں گے۔ امریکہ میں ابتدائی لکھنے والی مذہبی تحریروں میں بھی یہ بات پائی جاتی ہے کہ خدا امریکہ پر خاص طور پر مہربان ہے انہی تحریروں میں سے پیری ملر نے لکھا ''صحرا میں پیغام حق'' اور یہ زعم اتنی طویل مدت سے اب بھی موجود ہے۔ ان لکھنے والوں نے امریکہ کا ایک مقدس جغرافیہ بھی وضع کیا انہوں نے اس طرف بالکل توجہ نہیں دی کہ امریکہ کے قدیم باشندوں نے اپنی کائنات کی لغات میں ہر پتھر، درخت، پہاڑ اور ندی اور دریاؤں کو مقدس معنی دے رکھے ہیں۔ جان کاٹن، کاٹن، میتھر، جوناتھن ایڈورڈز اور دوسرے لکھنے والوں کی تحریروں نے ہی امریکی طرزِ حیات کو ایک روپ دیا ہے، انہیں یقین دلایا گیا تھا کہ امریکہ میں یورپی عیسائیوں کی آبادکاری ایک مقدس تاریخ کی تکمیل کا نام ہے۔ امریکہ دراصل دھرتی کا آخر ہے اور یہاں پر ہی پیش گوئی مکمل ہوگی۔ جان کاٹن نے 1630 میں لکھا

''دوسرے لوگوں (قوموں) کو مقدر سے زمین ملی، ہمیں ایک وعدے کے مطابق یہ سرزمین حاصل ہوئی''۔ (۸۰) امریکہ میں سفید فام عیسائیوں کی آبادکاری تاریخ کا کوئی حادثہ نہ تھا۔ یہ اس سے بلند تر شے ہے۔ یہ اللہ کی رضا ہے اور وعدہ ہے کہ ہر شے کو پیداواری بنایا جائے (آباد کیا جائے) یورپی مفکرین نے جن یوٹوپیاز (خیالی ملک اور جنتوں) کی تصویر کشی کی ان کا تعلق ماضی سے تھا۔ مگر یہاں امریکہ میں حضرت عیسیٰؑ کی زمین پر بادشاہت کے قیام کو بالکل نئے معنی دے دیئے گئے۔ یہاں ان مذہبی لکھنے والوں کے لیے نہ تاریخ نہ ہی روایات نے مشکلات پیدا کیں اور وہ بڑی آسانی کے ساتھ انفرادی اور کارپوریٹ سطح پر روحانی اور مادی سربلندی کا اہتمام کرتے رہے۔ جغرافیہ، زمان اور تاریخ کے پس منظر میں سیکوان پرکووچ نے تبصرہ کیا ''امریکہ حضرت عیسیٰؑ کی سب سے کم عمر اور سب سے حسین دلہن ہے اور عالم انسانیت جانتا ہے یا نہیں مگر یہ انسانیت کی بہترین امید ہے'' (۸۱)

امریکیوں کے مذہبی طرز احساس پر نظر رکھنے والے سماجیات کے عالم رابرٹ بیلہ نے امریکہ کے ایک مقبول اندازِ نظر پر یوں تبصرہ کیا ہے۔ ''خدا، تاریخ خاص طور پر امریکہ کو تاریخ کے بارے میں بڑی دلچسپی رکھتا ہے اور مائل بہ کرم ہے'' (۸۲) دنیا میں کہیں بھی سیاسی راہنما اپنی تقریروں اور پند و نصائح کے آخر میں اتنے تواتر سے اپنی قومی ریاست پر خدا کی رحمت کے لیے دعا نہیں کرتے۔ جتنے تسلسل سے امریکی لیڈر کرتے ہیں جیسے خدا سیاسی گروہوں اور قوموں کے ان جدید انتظامات پر نظر رکھے ہوئے ہے اور اس نے انسانی معاملات میں امریکہ کو ایک غیر معمولی مرتبہ دے رکھا ہے۔ امریکیوں کی اپنے بارے میں اس خودنگری کو بہت سے لکھنے والوں نے قبول بھی کر رکھا ہے جن پر خدا کی خاص نظر کرم ہے اور اس پر وہ ''امریکہ کی استثنائیت'' کی سرخی کو سجاتے ہیں اس استثنائیت کے بارے میں میں نے پچھلے باب میں لکھا ہے کہ یہ ہزاروں ڈھنگ اور غیر معمولی انداز میں خود کو ظاہر کرتی ہے۔ امریکہ میں ایسے بہت سے مظاہر ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ملک انسانی معاشروں کی معروف ثقافتی اور سیاسی تاریخوں میں کھپ نہیں سکتا۔ دنیا میں جس چیز کو قوم پرستی سمجھا جاتا ہے امریکہ میں اسے حب الوطنی میں ڈھال دیا جاتا ہے... یہ اتفاقاً نہیں ہوتا۔ امریکہ سے محبت کے خیال کا درجہ قومی ریاست سے محبت کے خیال سے بلند تر مقام کا حامل ہے۔ جو کچھ امریکہ قبول کر لیتا ہے اس پر کمینگی، بدکاری اور برائی کا الزام آ

ہی نہیں سکتا جبکہ ان کی نظر میں قوم پرستی پر یہ سارے الزام آتے ہیں۔ نظریہ ساز ''اچھی'' اور ''بری'' قوم پرستی کے بارے میں جو چاہے کہیں، امریکہ کا اپنی نظر میں اپنا روپ ہر قسم کی قوم پرستی کو مسترد کر دیتا ہے۔ حب الوطنی سے سیاسی اعتبار سے یہ اطمینان بخش خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہم سب سے فائق ہیں۔ یوں امریکی قومی ریاست کے نام پر جو برائی کی جاتی ہے اسے اس پردۂ رحمت میں چھپا لیا جاتا ہے کہ امریکہ تو سماجی اور ثقافتی حسن وخوبی کا خزانہ ہے اس سے برائی سرزد ہو ہی نہیں سکتی۔ امریکہ کے کسی اقدام کے باعث اگر ساری دنیا کو دھچکا لگے، وہ مایوس ہو اور تلخ بھی ہو جائے تب بھی امریکہ کے تصور اور خیال پر کوئی حرف آ ہی نہیں سکتا۔

میں نے امریکہ کی خواب کاری کی اصطلاح میں جو کچھ پیش کیا ہے اس کی بھرپور نمائندگی تو لفظ ''امریکی استثنائیت'' بھی نہیں کر سکتے۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا، قدامت پسند مبصر فرانسس فوکویاما نے ''خاتمہ تاریخ'' کا ذکر کیا تھا وہ درصل ان بہت سے لوگوں کو بتانا چاہتا تھا جنھوں نے اپنے سامنے سرد جنگ کا خاتمہ ہوتے دیکھا مشرقی یورپ میں اور دنیا کے دوسرے حصوں میں آزاد تجارت کی فوری پذیرائی دیکھی جہاں آزادہ روی سے ہمدردی رکھنے والی حکومتیں قائم کی گئیں، یہ لوگ ان امکانات کو دیکھ کر انتہائی خوش تھے کہ قومی ریاستیں سرمایہ دارانہ جمہوریت کو بہترین آدرش سمجھ کر قبول کر رہی ہیں۔ اگر وہ یہ کہتا ہے کہ امریکہ ہم سب کے مستقبل پر قبضہ کرنا چاہتا ہے اور اس کے ساتھ ہی (مستقبل) پیش گوئی (آئندہ کی سوچ) کا دروازہ بھی بند کر دے گا تو شائد زیادہ سچ ہوتا۔ امریکہ میں پہنچ جانے کا مطلب ہے کہ اب آئندہ کی سوچ اور خیال کی ضرورت ہی نہیں رہی، آپ خود ہی پیش گوئی یا مستقبل بن گئے ہو۔ دنیا کی کسی نو آبادیاتی حکومت نے اپنی رعایا کے دل ودماغ پر اس قدر قبضہ نہیں کیا جس قدر امریکہ نے کیا ہے۔ امریکہ کے کارنامے جو بھی ہیں اس کے باوجود یہ کہنا ''دنیا ہم (امریکہ) پر بھرپور اعتماد کرتی ہے اور دنیا صحیح کہتی ہے۔'' (۸۰) اس سے پہلے کسی نے اپنی معصومیت پر اتنی ڈھٹائی اور بے شرمی کے ساتھ اس طرح فخر نہیں کیا۔

عراق میں جنگ جاری ہے یہ جنگ میری اس دلیل کی واضح گواہی ہے کہ یہ سلطنت صرف تیل اور موٹے ٹھیکوں کے لیے نہیں، اور بلاشبہ امریکی منصوبہ میں یہ کام کم اہمیت کے اور نظر انداز کیے جانے والے نہیں بلکہ یہ سب کچھ امریکی خواب کاری یعنی امریکی خواب کی

تکمیل کے لیے ہے۔ فلم فارن ہیٹ نائین الیون کی ایک بڑی ناکامی یہی ہے یعنی امریکی خواب سے پہلو تہی ورنہ یہ فلم ہر لحاظ سے کامیاب ہے اور دیکھی جانی چاہیے۔ فلم کا ڈائریکٹر واضح طور پر ان سازشی نظریوں کا حامی لگتا ہے جو تیل کے کاروباریوں اور سازش کے نظریہ سازوں کے درمیانی خونی بندھنوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ کچھ لوگ انہیں (سازشیں نہیں) حقیقت کہتے ہیں۔ سازش کے یہ نظریے بش کی حکومت کے بندوں اور ان کمپنیوں کے روابط کا پتہ دیتے ہیں جنہوں نے عراق کی تعمیر نو کے بھاری ٹھیکے لے رکھے ہیں اور لگتا ہے کہ ڈائریکٹر بھی امریکہ کی اس خواب کاری میں گرفتار ہے۔ ایک عورت جس کا بیٹا عراق میں مارا گیا ہے، مائیکل مور اس کے باورچی خانے میں کھڑا ہے اور کہتا ہے ''یہ عظیم ملک ہے'' ہیں نا؟ جملے کی ادائیگی سے پہلے اور بعد میں خاموشی کا طویل وقفہ جملے کی سنگینی کو بڑھا دیتا ہے۔ یہ مشاہدہ بظاہر ایک ٹھوس حقیقت اور اظہر من الشمس ہے اس لیے یہاں کسی دیکھنے والے یا سننے والے کی ہمنوائی (گواہی) کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔

اس جنگ سے کم از کم ایک ایسی ہوشربا کہانی ابھرتی ہے جو ہماری توجہ کی طالب ہے۔ امریکہ میں آباد افریقیوں اور ہسپانوی لوگوں کی امریکی فوج میں نمائندگی شرح تناسب سے بہت مختلف (زیادہ) ہے حالانکہ ان دو اقلیتوں کے امریکہ میں بہت کم حقوق ہیں مگر انہیں یقین دلایا گیا ہے کہ ان کے لیے جیل اور فوج کے دروازے بروقت کھلے ہیں اس طرح وہ معاشرے میں کوئی فتور بھی پیدا نہیں کرتے اور اپنے ہم نسبوں کی سول معاشرے میں تعداد بھی گھٹاتے رہتے ہیں بلکہ ان کے دم سے سفید فام امریکیوں کو زیادہ اہم کاموں مثلاً پیداوار میں اضافہ کرنے، روپیہ کمانے اور دنیا بھر میں اپنی مارکیٹیں قائم کرنے کی آزادی مل جاتی ہے۔ اور معاملہ کچھ یوں ہے کہ امریکہ کے ان مستقل رہائشیوں کے پاس گرین کارڈ دیکھ کر دنیا بھر سے امریکہ میں آ کر ''اجنبی رہائشی'' کی حیثیت کی تمنا رکھنے والے حسد سے جل جاتے ہیں۔ ان گرین کارڈ والوں کو امریکی الیکشن میں تو ووٹ ڈالنے کے زیادہ مواقع نہیں ملتے مگر انہیں قوم کے لیے جان قربان کرنے کا اذن عام ہے۔ امریکہ کی سیاسی اشرافیہ کو ان نوآبادکار اقلیتوں کے بارے میں رائے شماری کا حق نہ دینے کا فیصلہ تو بڑا معقول نظر آتا ہے۔ اس لیے کہ وہ قابل نفرت ہیں مگر فوج میں ملازمت کے لیے

دماغ کی نہیں مضبوط جسم کی ضرورت ہے۔ اس لیے انہیں فوج میں لینے سے کبھی انکار نہ کیا جائے۔ یہ بات بھی اب سامنے آئی ہے کہ جنگ کے ابتدائی دنوں میں مارے جانے والے دو میرین گرین کارڈ والے ہسپانوی لانس کارپورل جوزے گنسیریز اور کارپورل جوزے گیری بے تھے اور ان کر بعد از مرگ فوراً امریکی شہریت عطا کر دی گئی (۸۵) ہمیں یقین ہے کہ امریکی شہری بننے کے بعد وہ اپنے ماضی سے آزاد ہو گئے ہوں گے وہ اپنی زندگی کا اعلیٰ ترین مقام حاصل کر چکے ہیں۔ خدا' نہ جانے بہشت میں عراقیوں کے مقابلے میں امریکیوں کا زیادہ خیر مقدم کرتا ہے مگر ہم کہہ سکتے ہیں ہر چند زیادہ وثوق سے نہیں کہ بہت سے اور عراقی' میکسیکن یا گوئٹے مالن کی حیثیت سے نہیں امریکیوں کی حیثیت سے جنت میں جانا چاہیں گے؟

زندگی میں بھی امریکی ہونا اچھا لگتا ہے موت میں بھی اچھا ہی لگتا ہے

باب 8

کوڈا: گاندھی، دہشت گردی کے خلاف جنگ اور عدم تشدد کا مقدر

لاس اینجلز 10 جولائی 2005 کہا گیا ہے کہ کتابوں کا کوئی انت نہیں اور اس کتاب کا بھی کوئی انت اخیر نہیں خاص طور پر ان زمانوں میں جب کہ جنگ کا بھی کوئی انت نہیں۔ جب نیو یارک میں طیارے ورلڈ ٹریڈ سنٹر سے ٹکرائے تھے کتاب تقریباً مکمل ہو چکی تھی میں نے کتاب کے ساتھ ایک بعد از تحریر نوٹ لکھ دیا تھا۔ کتاب چھپنے کے فوراً بعد ہی امریکہ نے عراق پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ جب اس کتاب کا ہندوستانی ایڈیشن مکمل کیا گیا تھا تو چند روز پہلے چار دھماکوں نے مرکزی لندن کو ہلا کر رکھ دیا۔

لندن میں بم دھماکوں کے ایک مربوط سلسلے نے ہولناک تباہی اور موت پھیلا دی۔ اس وقت شائد بہت ہی کم لوگ ہوں گے جنھوں نے اس مجسمے کے مقدر کے بارے میں سوچا ہو۔ 1984 میں میں پہلی بار لندن گیا، میں نے اپرو پرن پلیس میں قیام کرنے کے لیے پہنچا سامان رکھا اور فوراً ہی میں نے ٹیویسٹاک سکوائر کا رخ کیا۔ اس جگہ ایک بم کے پھٹنے سے بس تباہ ہو گئی تھی۔ تیرہ یا شائد زیادہ جانیں ضائع گئیں۔

وسطی لندن میں بہت سے خوبصورت سکوائر ہیں، ستانے، سوچنے اور خیالی آرائی کے لیے نخلستان۔ ہر ایک سکوائر کی کوئی نہ کوئی تاریخی حیثیت ہے لیکن ٹیویسٹاک کی اہمیت ہی اور ہے۔ سکوائر کے عین درمیان میں موہن داس گاندھی کا ایک بہت ہی نادر قسم کا مجسمہ

نصب ہے... دنیا میں بالکل ممتاز۔ 1966 میں لندن میں ہندوستانی ہائی کمشنر نے یہ مجسمہ تحفہ کے طور پر لندن کو دیا تھا۔ مجسمہ ساز برطانوی فریڈا بریلینٹ نے بنایا اور اس کی نقاب کشائی برطانوی وزیراعظم ہیرلڈ ولسن نے کی۔ یہاں ہیروشیما میں مارے جانے والوں کو خراج تحسین پیش کیا جاتا ہے۔ 1986 میں لیگ آف جیوش ویمن نے یو این انٹرنیشنل ایئر آف پیس (اقوام متحدہ کا سال امن) کے موقع پر ایک درخت سیپل (اس کی ایک قسم سے چینی بھی بنائی جاتی ہے) لگایا تھا۔ حال ہی میں دنیا کے ان لوگوں کی یاد میں ایک لاٹھ قائم کی گئی ہے جو اپنے ضمیر کی آواز پر آواز حق اٹھایا کرتے تھے۔ ان کوائف کی بنا پر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اہل لندن نے کیوں اسے پیس پارک (امن پارک) کہنا شروع کر دیا۔

بندہ کہہ سکتا ہے کہ اس مجسمے نے اس چوک کو خاص قسم کی متانت دی۔ یہاں گاندھی کا مجسمہ نشست کی حالت میں بنایا گیا، چہرے پر تفکر اور محویت۔ یہ وہ مجسمہ نہیں جس میں گاندھی کو ہاتھ میں لاٹھی لیے، نمک کے مسئلے پر احتجاج کے سلسلے میں چلتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے معماروں کے مجسموں میں گاندھی کا زیادہ تر متذکرہ مجسمہ ہی نظر آتا ہے۔ لیکن گاندھی کا یہی بیٹھی حالت میں مجسمہ ہی ہندوستان کے سرکاری ٹیلی ویژن چینل میں 1970 اور 1980 کی دہائیوں میں خبروں کے نشر کرنے سے پہلے دکھایا جاتا تھا۔ ٹیویسٹاک سکوائر یونیورسٹی کالج لندن سے تھوڑے سے فاصلے پر ہے۔ اس یونیورسٹی کی ویب سائٹ پر بتایا جاتا ہے کہ گاندھی نے اس یونیورسٹی سے گریجوایشن کی تھی۔ گاندھی اپنی انیسویں سالگرہ کے فوراً بعد قانون کی تعلیم کے لیے 1888 میں لندن آئے۔ بھلا ایک ایسی سلطنت کو گرانے کے لیے قانون سے بہتر کون سا مضمون ہو سکتا تھا جس کا دعویٰ تھا کہ اس نے بے قانون سرزمینوں میں قانون کی حکمرانی قائم کی ہے۔ تاہم ان دنوں گاندھی کے ذہن میں یہ نہیں تھا کہ انہوں نے خود کو اس سلطنت سے الگ کرنا اور اسے شکست دینا ہے۔ گاندھی کے بیرون ملک قیام کا آغاز لندن سے ہوا اور اختتام بھی لندن پر ہی ہوا۔ لیکن وہ پہلے لندن کیوں آئے ان کا اپنے الفاظ میں ''انگریز بننے کے لیے'' اور پھر آخری مرتبہ اسی طرح خراج تحسین پیش کیا جیسے ماتحت رعایا رسماً اپنے ظالم حکمران کو پیش کرتی ہے۔ آخری مرتبہ وہ وائسرائے سے برابری کی سطح پر گفت وشنید کرنے کے بعد ہندوستان کی آزادی پر مکالمہ کرنے لندن آئے تھے۔ اس سارے عرصے میں گاندھی نے بہت سا

سامان اتار پھینکا ٹاپ ہیٹ، کوٹ ٹیلز، انگریزوں کے بارے میں مقامیوں کا تحیر اور مغربی تہذیب کی تشدد اور دہشت گردی کی عادت اور علت۔

گاندھی عدم تشدد کے زبردست ماننے والے اور مبلغ تھے۔ اور تشدد کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے۔ عدم تشددی بننے کے لیے ضروری نہیں کہ پہلے تشدد کے مدرسے میں تعلیم و تربیت حاصل کی جائے مگر ضروری ہے کہ تشدد سے پاک زندگی گزاری ہو۔ گاندھی نے جنوبی افریقہ میں نسلی تشدد کو بارہا اپنے سامنے دیکھا۔ جب 1898 میں جنگ بوئر شروع ہوئی تو گاندھی نے انگریزوں کی مدد کے لیے ایمبولینس کا دستہ کھڑا کیا اور جب چند سال بعد زلو قبائل کی بغاوت شروع ہوئی تو انہوں نے پھر یہ دستہ کھڑا کیا۔ بہت سے مبصرین نے اس طریق کار سے بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ گاندھی اس بات میں پختہ یقین رکھتے تھے کہ ہندوستانی برطانوی سلطنت کے اندر صرف اس وقت اپنے حقوق کے دعویدار ہو سکتے ہیں جب وہ سلطنت کے مخالفوں کے خلاف سلطنت کے دفاع میں مدد کریں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سیاسی طریق کار اور بحث و مباحثہ کی لغات میں حقوق کی زبان بھی شامل ہو گئی تھی۔ لیکن گاندھی ان دنوں اس بات پر مصر تھے کہ ہر کسی کو اپنے فرائض کے بارے میں باخبر ہونا چاہیے۔ گاندھی کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ تشدد سے فرار یا وحشتوں اور مظالم کے باعث عضو معطل بننے یا امن پسندوں کا انداز اختیار کرنے کی بجائے وہ ایک مسیحا کے طور پر تشدد ہی کے میدانِ جنگ میں اترے اور عدم تشدد کے سٹریچر پر سچائی (جیسی سچائی ان دنوں انہوں نے سمجھی اور دیکھی) کو ڈال کر آگے بڑھے اور پھر عدم تشدد کا جدلیاتی، مکالماتی اور روحانی شعور حاصل کیا۔ تشدد کے پرچارک عدم تشدد کے پیروکاروں سے کم ہی بات کرتے ہیں۔ اور دوسری وجوہ کے علاوہ گاندھی نے تشدد پر عدم تشدد کو ترجیح دی تاکہ اس کے پیروکار تشدد پر تلے لوگوں کو گفت و شنید کرنے کی دعوت دیں۔ عدم تشدد والے تو تشدد کو ماننے والوں کے ساتھ ہمیشہ ہم کلام رہتے ہیں۔ تشدد اور عدم تشدد کے اس باہمی تعلق نے گاندھی کو اس حقیقت کا شعور دیا کہ عدم تشدد کی بعض صورتیں تشدد ہی کے برابر ہیں۔ تشدد سے گریز کا ہمیشہ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہر کوئی صورت عدم تشدد کی ہی صورت ہے اور ایسا موقع بھی ہو سکتا ہے جب تشدد ہی عدم تشدد کی روح کو قائم رکھنے کا واحد طریقہ ہو۔

یہ سوچنا ایک طرح کی خوش فہمی ہو گی کہ جس بمبار نے لندن کے پیس پارک میں گاندھی کے مجسمے سے ہٹ کر بم چلایا اس کو اپنے ہولناک انداز میں گاندھی اور عدم تشدد کے مبلغین

سے مکالمہ کرنے کا خیال آیا ہو۔ اپنے زمانے میں گاندھی عدم تشدد پر عمل کرنے والے واحد فرد تھے جبکہ دوسرے تمام نظریہ ساز اور انقلابی دوسرے راستے پر تھے۔ ان بڑے لوگوں لینن، ٹراٹسکی، فینن، ماؤ، کاسترو، چی گویرا میں گاندھی بالکل الگ مقام پر کھڑے تھے۔ ان لوگوں نے نہ صرف تشدد کو عظمت دی بلکہ انہوں نے عدم تشدد کو ایک وحشی صورت قرار دے کر مسترد کر دیا تھا۔ گاندھی کے نزدیک ٹالسٹائے قابل تقلید فرد تھا۔ مگر لینن نے اپنے وطن کے اس فلسفے کو بڑی نفرت سے مسترد کر دیا کہ وہ برائی کا مقابلہ طاقت سے کرنے کی مخالفت کرتا ہے اور اس نظر (عدم تشدد) کا مبلغ ہے۔ ان ایام میں عدم تشدد کا تذکرہ بھی کم ہی ہوتا۔ اور اب یہ دلیل بھی دی جا سکتی ہے کہ ٹراٹسکی، فینن اور چی گویرا کی طرح جہادیوں یا خودکش بمباروں کے لیے عدم تشدد اتنا ہی نا معلوم تھا جتنا گاندھی۔ اور یہ کہ ان دہشت گردوں کی تربیت ہی سراسر مختلف انداز کی ہے۔ بلاشک یہ بھی سنا جاتا ہے کہ القاعدہ نے برطانیہ میں مدرسوں میں ''سلیپنگ سیل'' بنا رکھے ہیں جہاں مسلمان مردوں کو سکھایا جاتا ہے کہ مغرب اور اس کی آزادی (بش کے الفاظ میں) سے نفرت کریں۔ دہشت گردی کے ماہرین کی ایک الگ ہی نسل ہے اور بیسویں صدی کے بین الملی صنم بنائے جا رہے ہیں۔ بم بنانے، منصوبہ بنانے اور انتہائی محفوظ علاقوں میں بیک وقت حملہ کرنے اور پرہجوم عوامی جگہوں پر بم کے ساتھ محفوظ علاقوں میں بیک وقت حملہ کرنے اور پرہجوم عوامی جگہوں پر بم کے ساتھ خود کو اڑا دینے کی تربیت کس قسم کی ہوتی ہے۔ ٹیویسٹاک سکوائر اور ٹیوب سٹیشنوں پر حملہ کے لیے کسی مدرسہ یا مساجد میں تربیت کی کوئی ضرورت نہیں، انہوں نے اسلامی دنیا کی یونیورسٹیوں کی بجائے مغرب کے اعلیٰ درجے کے سیکولر اداروں میں تعلیم حاصل کی ہے۔ بلکہ بندہ یہ کہہ سکتا ہے کہ انہوں نے گلیوں میں یہ تربیت حاصل کی، تیسری دنیا کی گلیوں میں آوارہ پھرنے والے لونڈوں کی طرح نہیں بلکہ انہوں نے بڑے غور سے افغانستان اور عراق میں امریکی عذاب کا مشاہدہ کیا۔ انہوں نے یہ سبق تاریخ کی کتابوں اور اپنے سامنے ہونے والے تشدد کی ثقافت اور تشدد کے خلاف جنگ کرنے والوں سے سیکھا ہے۔ دہشت گردی کرنے والوں نے سمجھ لیا ہے کہ اس پیشے (دہشت گردی) میں جانے کے کئی ایک راستے ہیں۔ تشدد کی ثقافت سب طرف محیط ہے۔

ہاں یہ بات دیکھنے والی ہے کہ کیا لندن کا ٹیویسٹاک سکوائر کو مستقبل میں امن کے پارک

کے نام سے ہی پکارا جائے گا یا نہیں۔ غالباً اسے اسی نام سے پکارا جائے گا بشرطیکہ لندن والوں کا جوش، طاقت اور عزم ویسا ہی رہے جیسی ان کی شہرت ہم سنتے چلے آئے ہیں۔ یہ خیال سکون تو بڑا دیتے ہیں مگر یہ تشدد کے کلچر کو اتنا واضح نہیں دکھاتے بلکہ زیادہ تر اسے چھپائے رکھتے ہیں اور یہ تشدد کا ہی کلچر ہے جس نے جدید معاشرے کو باہم جوڑ رکھا ہے۔ ہمیں یاد ہے کہ گاندھی کی جان ایک قاتل کی گولی نے لے لی تھی۔ بجا کہ عدم تشدد کا جواب تشدد کے علمبردار کی طرف سے تشدد ہی ہو سکتا تھا تشدد کے خوفناک پہلو اور بھی ہیں۔ یہ بدلا نہیں جا سکتا نہ ہی تشدد کرنے والوں کو بدلا جا سکتا ہے کیونکہ ان کا یقین ہے کہ وہ سب کے مقابلے میں سچے اور مکمل طور پر سچے ہیں۔ گاندھی نے نوآبادیاتی صورت کے بارے میں کہا تھا کہ یہ ایک معاہدہ ہے۔ ان معاہدوں میں دھوکہ، دھونس اور کشش یہ سب عناصر ہوتے ہیں۔ معاہدہ نوآبادیاتی طاقتوں اور ان کے ماتحتوں میں ہوتا ہے اور جب اس کے بارے میں آگہی حاصل ہو جاتی ہے تو پھر اسی سے تشدد کی جدید ثقافت جنم لیتی ہے۔ نوآبادیات میں آباد لوگوں کا یقیناً استحصال کیا گیا انہیں مارا گیا مگر جدید مغرب کی چمک نے ان کی آنکھیں بھی خیرہ کر دیں۔ مغرب کے لیڈر اور زعما نے یقیناً وحشیانہ تشدد کے باعث پسپائی اختیار کی۔ وہ اس بات پر خوش بھی ہوتے ہیں جیسے وہ صرف یہی زبان سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ بھلا اس احمقانہ، بے وقوف کرنے، فحش اور تشدد سے بھرپور اصطلاح... ''دہشت گردی کے خلاف جنگ کی'' تعبیر کیسے کریں گے؟ یہی تو ان کی آرزو ہے۔

ہم ایک وحشیانہ اور نہ ختم ہونے والے تشدد کے دور میں داخل ہو گئے ہیں۔ دہشت گرد اور دہشت گردی کے خلاف جنگ کے محرک کے درمیان ایک ہولناک معاہدہ ہے۔ تشدد کا منہ بہت بڑا ہے۔ یہ کسی مخالفت کو خاطر میں نہیں لاتا۔ گاندھی کے قاتل اور اس کے لاتعداد سرپرستوں نے بوڑھے شخص کو تو ٹھکانے لگا دیا اور تب سے تہیہ کیے ہوئے ہیں کہ تشدد کو شہنشاہ کے طور پر تخت پر بٹھائیں گے۔ بندہ حیرت سے سوچتا ہے کہ جب تک عدم تشدد کے قاتل اپنا کام مکمل کر لیں گے کیا تب تک گاندھی کا کوئی مجسمہ باقی بھی رہ جائے گا

حاشیے

تعارف

۱) انگریزی

۲) انگریزی

یہ تعداد بیس کروڑ ہو سکتی ہے، دوسری جنگ عظیم میں پانچ کروڑ چالیس لاکھ جانیں تلف ہوئیں ان میں سے ساٹھ فیصد سویلین (شہری) تھے۔

۳) امریکہ ان اداروں میں جنہیں وہ مکمل طور پر زیر اثر سمجھتا ہے، کسی صورت اختلاف کی اجازت نہیں دیتا۔ اس کی بہترین مثال روی کنبر کی ہے جس نے ورلڈ بنک کی طرف سے نامزد ورلڈ ڈیویلپمنٹ برائے غربت کی رپورٹ مرتب کرنے والوں میں نمایاں کام کیا اور جب اس نے اس رپورٹ میں غریب لوگوں کے تاثرات کو بھی رپورٹ کا حصہ بنانے کا عندیہ دیا، دوسرے معاشی ماہرین کے مقابلے میں کنبر کا رویہ مختلف تھا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ غربت کے کم آمدنی کے حوالے سے اور بھی بہت سے مسائل پر توجہ دی جانی چاہیے۔ اس کے علاوہ یہ کہ جو مجموعی اعداد و شمار اس وقت دیے جا رہے وہ غربت کے شکار گروپوں میں سے زیادہ کمزور گروپوں کا صحیح جائزہ لینے کے لیے ناکافی ہیں۔ کنبر نے یہ بھی کہا کہ اس وقت عالمگیریت کا جو ماڈل تیار کیا گیا ہے وہ اس قسم کے مسائل کے بارے میں بے بہرہ ہے۔ جو پالیسیاں غریبوں کی مدد کرنے کے لیے بنائی گئی ہیں یہ ماڈل ان کی راہ میں بھی رکاوٹیں ڈال رہا ہے۔ کنبر نے اس لیے استعفیٰ دے دیا کہ اس کے تاثرات کو رپورٹ میں شامل کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ کنبر نے تحریری طور پر یہ بھی لکھ دیا کہ اس وقت کے امریکہ کے وزیر خزانہ لارنس سمر نے اس پر بے جا دباؤ بھی ڈالا کہ

میں اپنی رپورٹ تبدیل کروں جب کنبر نہ مانا تو سمرز نے کنبر کی رپورٹ کے قابل اعتراض حصے حذف کر کے انہیں دوبارہ لکھا۔ دیکھیں۔

۴) اصل انگریزی

۵) " "

۶) " "

۷) " "

پہلا باب

۱) " "

۲) " "

۳) " "

۴) " "

۵) " "

۶) " "

۷) " "

۸) " "

۹) ایس ڈی گوئیٹین نے لکھا ''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جمعہ کا روز خاص طور پر اجتماعی عبادت کی خاطر اس لیے چنا کہ مدینے والے جمعہ کے روز خرید و فروخت کیا کرتے تھے۔ ان کی نیت پہلے والے مذہبوں سے کوئی حجت نہیں کرنا تھا۔ یہودی بہت کی شام شاپنگ کیا کرتے تھے۔ خرید و فروخت کے لحاظ سے بڑا معروف دن ہوتا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کو ایک چھت کے نیچے اکٹھا کرنے کے لیے جمعہ کا روز بڑا موزوں تصور کیا گیا'' گوئیٹین نے مزید کہا کہ مذہب کے علاوہ دوسرے پہلوؤں سے بھی جمعہ کی بہت اہمیت تھی کیونکہ اس روز بہت سے دوسرے لوگ بھی آیا کرتے اور جمعہ کی نماز میں شرکت سے مسلمانوں کی طاقت کا بھی اندازہ ہوتا...

۱۰) انگریزی

۱۱) " "

۱۲) " "

۱۳) " "

۱۴) " "

۱۵) " "

۱۶) گبن کی رائے دلچسپ ہے۔ ڈاؤ کلیکسٹن (4284-3051) اور اس کے ساتھی میکسیمیاں کے عہد میں عیسائیوں کی حالت زار کے بارے میں لکھتا ہے ''کہ جولوگ سلطنت روم اور اپنے بزرگوں کا فطرت کے مذہب کو مسترد کرتے تھے، ان کے بارے میں لازم قرار دیا گیا کہ ان پر اتنا جبر وستم کیا جائے کہ وہ اپنے موقف سے تائب
ہو جائیں جو شخص آزاد خیال تھا (یعنی سلطنت کے مذہب کا پابند نہیں تھا) اس پر روٹی روزگار اور عزت واحترام کے سب دروازے بند تھے غلاموں سے کبھی آزاد ہونے کی امید بھی چھین لی گئی اور اس قسم کے سارے لوگوں، ساری آبادی کو قانونی حقوق سے محروم کر دیا گیا (انگریزی دوسطر)

۱۷) انگریزی

۱۸) انگریزی

۱۹) دیکھیں انگریزی شروع کی سطر ب
ایک مثال یہ ہے کہ پوپ نکولس پنجم نے 1454 میں ہنری دی نیویگیر کو ہندوستان تک تمام علاقوں کو فتح کرنے کا مذہبی اختیار (فتوی) دے دیا تھا اور ہنری کو یہ بھی کہا گیا تھا کہ وہ ان ملکوں کے ان لامذہب لوگوں کو بھی فتح کرے جن کو ابھی تک اسلام کی پلیگ نہیں لگی۔ اس کے بعد پوپ کی طرف سے ایک اور حکم جاری ہوا جس کے ذریعے بادشاہ افونسو کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ ان تمام لوگوں اور ملکوں کو فتح کرے جو حضرت عیسیٰ کے دشمن ہیں، یہاں اس نے عربوں اور لامذہب مقامی باشندوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ (انگریزی)...

۲۰) انگریزی...) اس فتوے کے باعث ایک اور تضاد پیدا ہوا 1566 کا سال 14 اپریل سے شروع ہو کر 31 دسمبر کو ختم ہو گیا۔ گویا یہ سال صرف آٹھ مہینوں اور سترہ دن کا

تھا۔ اسی طرح ستمبر اکتوبر، نومبر اور دسمبر کے مہینے رومن سال کے آغاز کی روائت کے مطابق جو مارچ سے شروع ہوتا تھا جو ان مہینوں کے ناموں کے معنی تھے اس اعتبار سے وہ علی الترتیب ساتواں، آٹھواں، ناںواں اور دسواں مہینہ قرار پائے مگر اب بڑے بے ڈھنگے انداز میں انہیں۔ ناتواں و جواں، گیارھواں اور بارھواں مہینہ بنا دیا گیا۔ (ص ۵۵)

۲۱) 1572 کے قتل عام میں قتل ہونے والوں کی تعداد دس ہزار سے ایک لاکھ تک بتائی جاتی ہے۔ اس موقع پر جارج سیزدھم (تیرھواں) نے ایک یادگار سکہ جاری کیا تھا اور مصور سادی کو کہا گیا کہ وہ ویٹکین میں قتل عام کے بارے میں دیواری تصویریں بنائے۔ وساری کو شہرت اس کی ان تصویروں سے ملی جو اس نے دوسرے مصوروں کی حیات کے حوالے سے بنائی تھیں یعنی مصورانہ سوانح حیات بنائی تھی۔

۲۲) انگریزی

۲۳) " "

۲۴) " "

۲۵) " "

۲۶) " "

۲۷) " "

۲۸) " "

۲۹) " "

۳۰) " "

۳۱) " "

۳۲) " "

۳۳) " "

۳۴) " "

۳۵) " "

۳۶) " "

۳۷) " " "

۳۸) " " "

۳۹) ایک اچھی مثال ہندوستان میں وقت کے تصور کے بارے میں ہے۔ اس تصور کو صنعتی دور سے پہلے کے یورپ، قدیم آسٹریلیا اور چین میں رائج تصور زمان کے آمنے سامنے رکھ کر دیکھا گیا ہے۔ کتاب (انگریزی)...
جیمز مل نے ہندوستان میں زمانے کے تصور کے بارے میں تفصیل سے لکھا اور کہا ہے کہ یہاں زمانے کے بڑے بڑے حصے بنائے جاتے ہیں۔ مگر یہ جحت صرف ہندوستان سے ہی مخصوص نہیں۔ ''بہت فاصلے کے ماضی سے وابستگی میں بڑی طمانیت اور فخر محسوس کیا جاتا ہے۔ کیلیڈ بک کی تاریخ کے حوالے سے ہمیں بتایا گیا ہے کہ یہ بات تحریری صورت میں موجود ہے جس میں دس دس ہزار سال کے سمے (یونٹ) بتائے گئے ہیں۔ چین کے بادشاہوں کے دورِ حکومت کی طوالت اب بھی حیران کن ہے۔ مصر کے ایک بادشاہ کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اس نے تین لاکھ یا تیس ہزار سال حکومت کی۔ (1:107)

۴۰) (انگریزی)

۴۱) ہندوؤں کے بھی خاص اعداد ہیں انہیں پہلے تو بڑا تمسخرانہ انداز دیا جاتا تھا تاہم جدید جدیدیت کے فاخرانہ انداز کے حوالے سے اب ان کی ''عجب ہونے کی'' خاصیت کم ہوگئی ہے یعنی حیرت کا عنصر کم ہوگیا ہے۔ یہاں پر ایک اور مزاحیہ سی بات کا تذکرہ ہندو احیا پرست کہتے ہیں کہ آج کی تمام جدید ایجادات کا ذکر ویدوں اور دوسری پرانی کتابوں میں موجود ہے تاہم مجھے اس لفظ ''عجب'' اور اس معیار پر اعتراف ہے جس کے ذریعے ہم کسی دوسری تہذیب کا فکری اور تخیلاتی اظہاریوں کا ناپ تول کرتے ہیں۔

۴۲) انگریزی

۴۳) " "

۴۴) " "

۴۵) " "
۴۶) " "
۴۷) " "
۴۸) " "
۴۹) " "
۵۰) " "
۵۱) " "
۵۲) " "
۵۳) " "

دوسرا باب

۱) " "
۲) " "
۳) " "
۴) " "
۵) " "
۶) " "
۷) " "
۸) " "
۹) " "
۱۰) " "
۱۱) " "
۲۱) " "
۱۳) " "
۱۴) " "
۱۵) " "

۱۶) " "

۱۷) " "

۱۸) " "

۱۹) " "

۲۰) " "

۲۱) " "

۲۲) " "

۲۳) " "

۲۴) " "

۲۵) انگریزی بارہ سطر

... ان میں نوآبادیات کے خاتمے کا ذکر نہیں۔ دراصل نوآبادیات کے خاتمے سے یہ مطلب نہیں لینا چاہیے کہ آزادی حاصل ہوگئی بعض مبصرین کا خیال ہے کہ دراصل یہ حلقہ بگوشی ہی کی ایک اور صورت ہے۔ اور اس باب میں ہرگز کوئی مبالغہ نہیں کہ ان لوگوں نے کہنا شروع کر دیا ہے کہ افریقی حکومت کرنے کے اہل نہیں اس لیے افریقہ کو دوبارہ نوآبادیات بنالیا جائے۔ ہمارے زمانے کے پیش پا افتادہ جملوں میں سے ایک یہ ہے کہ دنیا ایک ''عالمگیر گاؤں'' بن گئی ہے۔ اس لیے اگر ایک حصے (نصف کرہ) میں بدامنی ہوگی تو لازمی امر ہے کہ اس کا اثر دوسرے حصے پر بھی پڑے گا، اس کا صاف مدعا یہ ہے کہ افریقہ کو قابو کیا جائے وگرنہ یہ بحران، یہ وبائیں اور غربت دوسرے حصے میں بھی پھیل جائے گی۔ ایک معروف مبصر نے لکھا ہے ''جنوبی افریقہ دنیا کے لیے آبادی، ماحولیاتی اور معاشرتی حوالے سے ایک علامتی مسئلہ بنتا جا رہا ہے جس کا سب سے بڑا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک مجرمانہ افراتفری پیدا ہو گی۔ مغربی افریقہ میں مندرجہ ذیل افسوس ناک صورتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ کثرت آبادی، بیماریاں، بے تحاشا جرائم، وسائل کی قلت، مہاجروں کی نقل مکانی، قومی ریاستوں اور بین الاقوامی سرحدوں کے بارے میں جذبات میں شدت، پرائیویٹ فوج اور سیکوریٹی کمپنیوں کا قیام اور منشیات کی وسیع پیمانے پر تجارت (ص ۴۵)

انگریزی

۲۶) " "

۲۷) " "

۲۸) " "

۲۹) " "

۳۰) " "

۳۱) " "

۳۲) " "

۳۳) " "

۳۴) " "

۳۵) " "

۳۶) " "

۳۷) " "

۳۸) " "

۳۹) " "

۴۰) " "

۴۱) " "

۴۲) " "

۴۳) " "

۴۴) " "

۴۵) " "

۴۶) " "

۴۷) " "

۴۸) آئین کے مطابق ایک ریاست ایوان نمائندگان اور انتخابی کالج میں اپنے نمائندوں کی تعداد مقرر کرانے کے لیے غلاموں کی صرف تین بٹہ پانچ یعنی ساٹھ فی صد

آبادی کا اندراج کرائے گی۔ (سٹوری آف امریکی فریڈم (نیو یارک: ڈبلیو ڈبلیو نورٹن 1998) ص ۳۵

۴۹)

۵۰)

۵۱)

۵۲) واضح استثنائی صورت ڈبلیو ای بی ڈوبوئس جیسے دانشوروں کی ہے جو کالے امریکیوں کے لیے سفید فام امریکیوں کے مساوی حقوق کے دعویدار ہیں۔ نیشنل ایسوی ایشن فار دی ایڈوانسمنٹ آف کلرڈ پیپل (این اے اے سی پی) کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے ڈوبوئس نے کہا "ہم چھوٹے موٹے بخشے گئے استحقاق سے ہرگز مطمئن نہیں ہوں گے، ہمیں مکمل حقوق درکار رہیں۔ وہ سارے سیاسی، شہری اور معاشرتی حقوق جس کے حقدار آزاد جنم لینے والے امریکی ہیں جب تک ہمیں یہ حقوق حاصل نہیں ہوتے ہم نہ احتجاج ترک کریں گے نہ امریکیوں کے کان کھانا چھوڑیں گے" (انگریزی))

۵۳) انگریزی

۵۴) " "

۵۵) " "

۵۶) " "

تیسرا باب

۱) " "

۲) " "

۳) " "

۴) " "

۵) " "

۶) " "

۷) " "

۸) " " "

۹) " " "

۱۰) " " "

۱۱) " " "

۱۲) " " "

۱۳) " " "

۱۴) " " "

۱۵) " " "

۱۶) " " "

۱۷) " " "

۱۸) " " "

۱۹) " " "

۲۰) " " "

۲۱) " " "

۲۲) انگریزی دوسطر
امریکی کے ایک سرکاری بیان میں جاپانیوں سے خطاب میں یہ الفاظ شامل کیے گئے اور ٹرومین کی ڈائری میں بھی شامل کیے گئے ''وحشی، بے رحم، سنگدل اور جنونی'' ''اگر وہ اب ہماری شرائط نہیں مانیں گے تو پھر ان پر فضا میں سے ایسی بربادیاں نازل ہوں گی جو اس جہاں میں نہ کبھی دیکھی اور نہ سنی گئیں'' نیو برٹ فیس کی کتاب (انگریزی)

۲۳) انگریزی

۲۴) انگریزی

۲۵) مرنے والوں کی تعداد کے تخمینوں میں بڑا فرق پایا جاتا ہے، 10 مارچ کو ٹوکیو پر جو حملہ کیا گیا اس میں کم سے کم اموات کا اندازہ اسی ہزار کا ہے۔ دوسری طرف یہ کہا جاتا ہے کہ ہیروشیما اور ناگاساکی دونوں میں جتنے لوگ مرے تھے ٹوکیو میں ان سے

۴۷)

۴۸)

۴۹)

۵۰)

۵۱)

۵۲)

۵۳)

۵۴)

۵۵)

۵۶)

۵۷)

۵۸) انگریزی دوسطر

یہ بات ہرگز واضح اور شفاف نہیں ہے کہ عراقیوں کی اکثریت عراق کی مسلسل تباہی کا ذمہ دار صدام حسین کو سمجھتی ہے۔ نیو یارک ٹائمز کے ایک رپورٹر نے ایک عراقی دانشور سے کہا کہ ساری تباہی کی ذمہ دار عراقی قیادت ہے" عراقی دانشور نے کہا "کیسے؟ کیا صدام حسین نے پابندی لگائی ہے؟ پھر امریکہ کون ہوتا ہے دوسرے ملکوں کے لوگوں کو یہ کہے کہ انہیں اس قسم کی قیادت چاہیے؟ جس ملک کی تاریخ اور ثقافت ہزاروں سالوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ آج وہ اپنے بچوں کو بھوک سے مرتا دیکھ رہا ہے۔(انگریزی)

۵۹)

۶۰)

۶۱)

۶۲)

۶۳)

۶۴)

مطالعوں میں طبقات کا معاملہ بہت پیچھے ڈال دیا گیا ہے۔امریکہ والے سماجی تجربہ میں طبقات والی بات بھول جاتے ہیں ان کی تحریروں میں اس کی بازگشت کم ہی سنائی دیتی ہے۔اس کتاب کے چوتھے باب میں کی گئی بحث دیکھیں۔

۷)

۸)

۹)

۱۰)

۱۱)

۱۲)

۱۳)

۱۴)

۱۵)

۱۶)

۱۷)

۱۸)

۱۹)

۲۰) انگریزی سات سطر

ہندوستانی حکومت نے اوڑیسہ کے ضلع بلاسپور کے علاقہ بالیا پال میں میزائلوں کے ٹیسٹ کے لیے رینج بنانے کا منصوبہ وضع کیا جس سے اندازاً ستر ہزار کسان بے دخل اور بے گھر ہونے کا خدشہ تھا مگر اس کی اس قدر شدید مزاحمت کی گئی اور یہ مزاحمت کئی سال تک جاری رہی تا آنکہ حکومت کو یہ منصوبہ ترک کرنا پڑا۔ پیپلز کمیٹی کے سیکرٹری نے مجوزہ رینج کے بارے میں کہا ''دنیا کی کوئی سی زمین اس زمین کا متبادل نہیں ہوسکتی جو ہمیں اپنے پرکھوں سے ورثے میں ملی۔ (ص 76 پر گیا گیا اقتباس) (انگریزی)

بڑے ڈیم اس زمانے میں بہت اہم بن گئے اور انہیں ریاستی ترقیاتی کام میں اولیت

حاصل ہوگئی اور بڑے ڈیموں کے بارے میں ڈیمز اور ترقی کے عنوان سے عالمی کمشن نے ایک رپورٹ تیار کی جس میں اجتماعی رائے یہ تھی کہ ہر چند اس سے بڑی ترقی ہوئی مگر اس کے لیے بڑی بھاری غیر ضروری قیمت ادا کی گئی۔ بے گھر کیے گئے لوگوں، دریاؤں کی نچلی طرف رہنے والے لوگوں اور قدرتی وسائل کے حوالے سے سماجی اور ماحولیاتی اعتبار سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ یہ بھی کہا گیا کہ ان ڈیموں کا ترقی کے سارے متبادل وسیلوں سے مقابلہ کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان سے تو پانی اور بجلی کے شعبے میں بھی کوئی زیادہ فائدہ نہیں ہوا۔ انگریزی.......................... تیار

اور اس رپورٹ پر بارہ دستخط کنندگان میں سے حکومتوں اور افسر ب ھی ہیں ڈیموں کی تعمیر کے لیے سامان فراہم کرنے والی فرم کا چیف ایگزیکٹو بھی صرف ایک رکن سیدھا پاٹکر نے اس رپورٹ میں ایک طویل اختلافی تحریر شامل کر دی۔ سیدھا پاٹکر نے دریائے نریدا پر ڈیم کے خلاف زیدہ بچاؤ اندرون ناتی تنظیم کھری کی اور اس زبردست جدوجہد میں حصہ لیا۔ تیسری دنیا کے ممالک بعض اوقات بڑے ڈیم بنانے کے خبط کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یاد رہے کہ جن دنوں ان ڈیموں کے خلاف کوئی بڑی مزاحمت نہیں تھی امریکہ نے ان میں بڑی سرمایہ کاری کی۔ اب تو صنعتی ممالک (جاپان) نے بڑے ڈیم توڑنے شروع کر دیے ہیں۔ (آخر سطر انگریزی)

۲۱) امریکہ اور یورپی لٹریچر میں اس بات کا بڑا چرچا کیا گیا ہے کہ نوآبادیاتی علاقوں کے لوگوں نے اپنے قدرتی وسائل کو بہت کم استعمال کیا ہے اس طرح خدا کے اس انعام کو ضائع جانے دیا۔ تاہم اس دلیل کے پردے میں لوگوں کو نوآبادیاتی (غلام) بنایا گیا۔ انگریزی.......................... ہند چینی کے

ایک گورنر نے اس بات پر احتجاج کیا کہ اگر ان علاقوں کو نوآبادیاتی نہ بنایا گیا تو نااہل مقامی لوگوں کی غفلت کے باعث قدرتی وسائل استعمال نہیں ہو سکیں گے۔ اسی طرح ایک مذہبی راہنما نے بھی اسی محاورے اور اسلوب میں بات کرتے ہوئے کہا کہ ''انسانیت ان غیر مہذب لوگوں کی سستی، نااہلی اور غفلت کو کسی صورت برداشت نہیں کر سکتی نہ کی جانی چاہیے جن کی وجہ سے اللہ کی طرف سے غفلت کیے گئے قدرتی

وسائل ہی پوری طرح استعمال میں نہ لائے جاسکیں گے۔ حالانکہ اللہ نے پر فرض عائد کیا تھا کہ وہ اجتماعی بھلائی کے لیے ان وسائل کو پوری طرح استعمال کری۔ انگریزی ....

۲۲) انگریزی .... عرب میں صنعتوں میں ترقی اور اضافہ کے ساتھ خطرناک فضلہ کوٹھکانے لگانے کا مسئلہ بھی پیدا ہو گیا ہے۔ ان دنوں اس موضوع پر بڑا کچھ لکھا جارہا ہے کہ امریکہ کے اندر فضلے کوٹھکانے لگانے کے لیے الگ علاقوں پر نظر ہے جہاں زیادہ کالے لوگ، ہسپانوں، قدیم امریکی وغیرہ آباد ہیں۔ انہیں ماحولیاتی مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ انگریزی 5 سطر ....

نقصان دہ یعنی خطرناک فضلے کوٹھکانے لگانے کے حوالے سے بعض اوقات اشاروں کنایوں میں اور بعض اوقات کھلے بندوں کہا جاتا ہے کہ خطرناک فضلے والی صنعتیں ہی تیسری دنیا میں لگائی جانی چاہئیں۔ وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ وہاں زندگی کی کوئی زیادہ قیمت نہیں۔ غریب لوگوں کو نوکری چاہیے اس کے بعد انہیں سب کچھ قبول ہے۔ اس ضمن میں ان لوگوں اور علاقوں کا بھی ذکر آتا ہے۔ جو پہلی دنیا کے اندر ایک تیسری دنیا کی صورت میں موجود ہے۔ الباما کے کالوں کے غریب علاقوں میں لگائی گئی کا غذمل سے اٹھنے والی بدبو سے گورنر جارج ولیس کا یادگار تبصرہ یاد آ گیا۔

''واہ... یہ خوشحالی کی خوشبو ہے یہ بڑی شیریں خوشبو ہے... ہے نا؟ (انگریزی)

۲۳) یہ بات دی اکنانومسٹ کے فروی 1992 کے شمارے میں چھپی تھی جس کے بعد برازیل کے سیکرٹری ماحولیاتی جوزلٹزن برگر نے سمرز کو خط لکھا کہ تمہاری دلیل بازی میں یقیناً منطق ہے مگر یہ ہے انتہائی احمقانہ'' لٹزن برگ نے کہا۔ تمہارے خیالات تو بالکل ہی عجیب وغریب ہے کہ یقین نہیں آتا کہ یہ تم ہی کہہ رہے ہوتمہاری سوچ تنگ (چھانٹی کرنے والی) ہے۔ اس پر اسی قسم کی سماجی سنگدلی اور فاخرانہ جہالت کا سایہ ہے جو ہمارے روایتی، معاشی ماہرین، ہماری دنیا کے بارے وضع کیے بیٹھے ہیں۔ لٹزن برگ کا خیال تھا کہ اگر سمرز جیسے لوگ عالمی بنک میں رہے تو یہ بنک ہی ختم ہو جائے گا اور پھر آزادی اظہار رائے کے نام نہاد معیاروں کا تیا پانچہ ہوا اور فوراً ہی لٹزن برگ کی چھٹی ہوگئی۔ غربت کے بارے میں عالمی ترقیاتی رپورٹ تیار کی گئی

سربراہ مصنف روی کنبر تھا جب سمرز کے کہنے پر اس کی لکھی رپورٹ میں ترمیم اور تبدیلی کر دی گئی تو جون 2000 میں روی کنبر نے استعفیٰ دے دیا۔ سمرز کا کہنا تھا کہ رپورٹ میں یہ نہیں بتایا گیا کہ آزاد منڈی کے نظام سے کس حد تک غربت میں کمی آئی ہے۔ (انگریزی)

(۲۴
(۲۵
(۲۶
(۲۷
(۲۸
(۲۹
(۳۰
(۳۱
(۳۲
(۳۳
(۳۴
(۳۵
(۳۶
(۳۷
(۳۸
(۳۹
(۴۰
(۴۱
(۴۲
(۴۳
(۴۴

۱۵) انگریزی دوسطر
پانی کے حوالے سے تذکیر و تانیث کا بھی ایک پہلو ہے۔ بہرطور میں یہاں اس کی تفصیل میں نہیں جا سکتا۔ ہندوستانی دیہات اور دیہی علاقوں میں عورتیں کنوؤں سے پانی بھر کر لاتی ہیں۔ پانی لانے کے لیے انہیں کئی کئی میل چلنا پڑتا ہے۔ اور پھر بھاری گھڑے اٹھا کر یہ فاصلہ طے کرتی ہیں۔ قصبوں اور شہروں میں جب واٹر ٹینکر ہوتے ہیں تب عورتیں ہی ہوتی ہیں جو برتن لیے قطاروں میں کھڑی ہوتی ہیں۔ یا پھر اگر کوئی واحد سرکاری نل ہے تو اس کے نیچے (............) برتن رکھ کر پانی بھرتی نظر آتی ہیں۔ ان عورتوں کی زندگیوں کے بارے میں کسی قصے کہانی کی تخلیق نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس بہادرانہ قصے تو اس بارے میں کہ کس طرح لاس اینجلز میں پانی لایا گیا تھا اور یہ کارنامہ سگارنوش بڑے بڑے لوگوں نے سرانجام دیا تھا۔ اکٹھے کرنے یا پھرنے والوں اور شکار کرنے والوں پر جو فرق ہے وہ جدیدیت کے کئی کئی ڈھنگ میں جھلکتا ہے۔

۱۶)

۱۷)

۱۸)

۱۹)

۲۰)

۲۱)

۲۲)

۲۳)

۲۴)

۲۵)

۲۶)

۲۷)

۲۸)

۲۹)

۳۰)

۳۱)

۳۲)

۳۳)

۳۴)

۳۵)

۳۶)

۳۷)

۳۸)

۳۹)

۴۰)

۴۱)

۴۲) ہندوستان میں ٹیلی ویژن کا ایک معروف پروگرام ''کون بنے گا کروڑ پتی'' معروف ایکٹر امیتابھ بچن کرتا ہے یہ انگریزی پروگرام ہوانٹس ٹوبی ملینئر کی طرز پر ترتیب دیا گیا تھا۔ پروگرام ہندی میں ہے اس لیے ''ملینئر کی جگہ کروڑ پتی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس پروگرام میں آنے والوں کا تعلق نہ تو ٹیکنالوجی کے ماہروں سے ہوتا ہے نہ ہی کمپیوٹر کے داتاؤں سے، بلکہ اس میں مختلف شعبوں سے متعلق لوگ حصہ لیتے ہیں۔ ''کروڑ پتی'' کی اصطلاح کو بحال رکھنے سے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا کیونکہ ایسے مقامی لفظ اور اصطلاحین نئی معیشت کی زبان میں ڈھل جاتی ہیں۔

۴۳) ۱۶ سطریں انگریزی

جدید سیاسی مبصرین انہی اصطلاحات کے استعمال کو ترجیح دیتے ہیں۔ پہلی دنیا ترقی یافتہ قومیں اور جیتنے والے یہ سب ایک طرف ہیں۔ دوسرے سرے پر تیسری دنیا ہے۔ عالمی سیاست اور معیشت کا منظر نامہ ''بازی'' کے استعارے سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ امریکہ میں کھیل کے تصور کے حوالے سے نہ جیتا نہ ہارا یعنی ڈرا۔ یعنی

معاوضے کی برابر تقسیم۔ اس صورت کی اجازت ہی نہیں یا بس خال خال۔ امریکی نامکمل بازی دیکھ ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ اگر بازی یا مقابلہ سخت ہے تو مزید رقت دے دیا جائے گا۔ توسیع دے دی جائے گی تا آنکہ ہار جیت کا منصوبہ ہو اور ہارنے اور جیتنے والے سامنے آ جائیں۔ ہر صورت سپورٹس مین .... کے جذباتی نظریے کے خلاف لہرا بھارتی ہے۔ اس لیے جیت کا فیصلہ کے بعد کھلاڑی اور کوچ ہارنے والوں کو گیم کے بعد انٹرویو میں شاندار کھیل پر مبارک باد دیتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ کوئی نہیں ہارا۔ صرف بڑے بڑے کھیلوں باسکٹ بال، فٹ ب ال اور بیس بال میں فیصلے ہوتے ہیں ان کھیلوں پر بیئر، کولا کاروں اور برگر کے مشتہرین بیٹ زنی، بڑی رقمیں انھی اشیا کی فروخت کی۔ اشتہاری بازی پر خرچ آتے ہیں، وہ لوگ اس موقع پر یوں موجود ہوتے ہیں جیسے کوئی بڑا خیراتی کام کر رہے ہیں۔ میرا شبہ ہے کہ امریکہ میں کرکٹ کا کھیل صرف اپنی طوالت ہی کی وجہ سے ہی ناپسند نہیں کیا جاتا۔ یعنی پانچ دن کھیل کے ایک دن آرام کا۔ خیر اب تو ایک دن کا کھیل بھی حل نکلا ہے۔ بلکہ ناپسندیدگی کی ایک وجہ یہ بھی کہ بعض اوقات کھیل کا پیغام ہی نہیں ہوتا اور یہ بغیر ہار جیت کے ختم ہو جاتا ہے۔ فٹ بال (امریکہ میں اسے ساکر کہتے ہیں) کا کھیل بھی ذرا ٹائی ہوتے ہیں صرف ورلڈ کپ میں ٹائی تو ہوتے ہیں مگر فائنل میں فیصلہ ضروری ہے۔ دوسرا ثقافتوں میں مبہم فیصلوں کے ساتھ بھی گزارا ہو سکتا ہے جبکہ امریکہ میں ایسا نہیں ہوتا۔ عہد جدید میں کھیلوں کے بارے میں جو مقبوض قسم کے خیالات وغیرہ ہیں ان سے ہٹ کر ایک خیال یہ بھی ہے کہ کھیل تو کھیل کو جاری رکھنے کے لیے کھیلا جاتا ہے۔ (انگریزی)

۴۴)

۴۵)

۴۶)

۴۷)

۴۸)

۴۹)

۵۰)

۵۱)

۵۲)

۵۳)

چھیواں باب

۱)

۲)

۳)

۴)

۵)

۶)

۷)

۸)

۹)

۱۰)

۱۱)

۱۲)

۱۳)

۱۴)

۱۵) پانچ سطر انگریزی

مؤخرالذکر میں میرے بہت سے دلائل کے شواہد ملتے ہیں۔اس عظیم الجثہ کتاب میں سائنس کے ہر پہلو کو شامل کیا گیا ہے مگر سائنس اور نوآبادیاتی نظام میں کیا رشتہ ہے۔ اس کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں۔ اس کتاب سے یہ بھی پتہ چلتا کہ سائنس کو بھی نوآبادیاتی قبضہ کے لیے باقاعدہ استعمال کرنا طے تھا۔سائنس کے بل بوتے پر لوگوں کو غلام بنایا گیا تھا اور یہ نوآبادیوں سائنس کے تجربات کے لیے

لیبارٹریاں نہیں اور سائنس اور نوآبادیات کی تاریخوں میں بہت کچھ مشترک ہے۔
اس عظیم .... سے یہ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ سائنس نے ہندوستان میں تیزی سے ترقی کی اور سائنس کے بارے میں مغرب سمیت ہونے والے کام اور مباحث میں مندرجہ ذیل عالموں کے کام کو نظر انداز کیا ہی نہیں جا سکتا ہے۔ جیت سنگھ اوبرائے کلاز العررس، اشیس نندی، شووسوا ناتھن، دیپک کمار اور جنوب کے ضیاء الدین سردار اور سوسنتھا گونا تلک میں حرف اس شعبہ میں دو پلڑوں کو برابر رکھنے کی کوشش نہیں کر رہا نہ ہی ہندوستان یا تیسری دنیا کے عالموں کو گنواتا رہا ہوں۔ دراصل اس قسم کا علم فضل اس لیے اہم ہے کہ یہ ایک دوسرے پس منظر کے حوالے سے سامنے آتا ہے۔

۱۵)

۱۶)

۱۷)

۱۸)

۱۹)

۲۰)

۲۱)

۲۲) جلیانوالہ باغ کے قتل عام کا ذمہ دار بریگیڈیئر جنرل ڈائر تھا اس نے اس ہزار کے قریب ہنتے لوگوں پر اس وقت تک گولیاں برسائیں جب تک ساری گولیاں ختم نہیں ہوگئیں۔ اس طرح کوئی چار سو جانیں ضائع ہوگئیں۔ ڈائر نے سرکاری تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے گواہی دیتے ہوئے کہا کہ جب اس نے یہ سنا کہ ایک انگریز عورت کو کچھ ہندوستانیوں نے بنا تھا۔ جبکہ ''عورتیں مقدس ہوتی ہیں'' اس لیے اسے بہت غصہ تھا۔ (انگریزی)

۲۳)

۲۴)

۲۵)

۲۶) اکیڈیمی یعنی تدریسی اداروں سے باہر کسی کو معلوم نہیں کہ جو امریکی طالب علم ایک غیر یورپی زبان میں گریجوایشن کر رہے ہوتے ہیں، انہیں وزارتِ دفاع کی طرف سے مالی امداد دی جاتی ہے۔ (فیلوشپ)

۲۷)

۲۸)

۲۹)

۳۰)

۳۱)

۳۲)

۳۳)

۳۴) پہلی آٹھ سطر انگریزی

انیسویں صدی میں انگریزوں نے ہندوستان کے مختلف اضلاع کے جو گزیٹر تیار کیے مجیب نے ان گزیٹروں سے ایسی بڑی مثالی دیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کی اور مسلمانوں نے ہندوؤں کی بہت سی رسومات اپنا رکھی ہیں اور تو اور اسلام اور ہندومت کے بارے میں یہ بھی غلطی سے کہا گیا کہ ایک سنگی مذہبی میں تاہم ہندوستان میں جدید مذہبی صف بندی کے تیز ہونے سے پہلے ہندوستان میں مذہبی تال میل کیا تھا۔

۳۵)

۳۶)

۳۷)

۳۸) لیوی کی مسلمانوں کی جڑیں۔ لیوی اپنے دلائل میں صرف سفید فام کو معتبر سمجھتا ہے۔اور اس کی خاصیت یہ ہے کہ وہ غلامی کے خاتمے میں غلاموں کی بغاوت کے حصے کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ نئی دنیا میں غلامی کے خاتمے کے لیے جدوجہد کا آغاز غلام تو سینٹ نے کیا تھا۔ لیکن ایک معتبر عالم نے یہ بھی لکھا کہ تاریخی ریکارڈ میں سے ہیٹی کے انقلاب کا بہت سا تذکرہ حذف کر دیا گیا اور ایرک ہوبس بام قسم کے

ترقی پسند لکھنے والوں نے بھی دنیائے جدید کی تاریخ لکھتے ہوئے اسے نظر انداز کر دیا۔ انگریزی سطریں

۳۹) اس رجحان کی عکاسی ہندوستان کے بائیں بازو والوں کی طرف سے ان ہندوستانی دانشوروں پر خوفناک حملے کرتے ہیں جن دانشوروں کو جدید سائنس اور خرد افروز تعقل پسندی پر شبہ تھا یا ان کے بارے میں یہ تصور کیا گیا اور کہا گیا کہ وہ نوآبادیات سے پہلے کے زمانے یا دیسی وابستگی یا قدامت کو رومانوی رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ انگریزی سطریں

۴۰)

۴۱) بائیں اور دائیں بازو کے ہندو تو گاندھی کو ناپسند کرتے تھے مگر عقلیت پسند آزاد منش اور جدیدیت پسند بھی مہاتما گاندھی کی طرف سے جدیدیت اور صنعتی تہذیب پر تنقید کو ناپسند کرتا تھا۔ (انگریزی)

۴۲)

۴۵)

۴۶)

۴۷)

۴۸)

۴۹)

۵۰)

۵۱)

۵۲)

۵۳)

۵۴)

۵۵)

۵۶) گاندھی نے اپنی زندگی میں چار اخبار نکالے اور مرتب کیے، اسی طرح دوسرے قوم پرست لیڈروں بال گنگا دھر تلک اور لاجپت رائے نے بھی اخباروں کو مؤثر طریق

سے استعمال کیا۔ تلک اور گاندھی دونوں پر باغبانہ تحریریں لکھنے پر مقدمے چلائے گئے مگر انہوں نے عدالت کے اندر ایسی زبردست چابکدستی دکھائی کہ خود انگریزوں کو شک ہونے لگا کہ برطانوی حکومت کے مخالفوں کو روکنے کے لیے یہ عدالتی طریقہ زیادہ موثر نہیں ہے۔

(۵۷

(۵۸

(۵۹

(۶۰

(۶۱

ساتواں باب

مجھے خبر نہیں کہ کن حالات میں اور کب 911 امریکہ کا ابتلا (ایمرجنسی) کے وقت کا قومی نمبر بن گیا میں نے اس ضمن میں ثقافت کی جنتی کتابیں دیکھی ہیں ان میں اس سوال کا کوئی جواب نہیں۔ 1937 میں پہلی بار برطانیہ میں ہنگامی صورت حال کی آگاہی کے لیے 999 کا نمبر اختیار کیا گیا اور یہی نمبر امریکہ میں 1950 اور 1960 کی دہائیوں میں استعمال کیا گیا۔ 911 نمبر 1968 میں الباما میں استعمال ہوتا تھا اور 1970 کی دہائی میں یہ ہندسے پورے ملک پر لاگو کر دیے گئے۔ دنیا میں کوئی ایک سا ایمرجنسی نمبر نہیں ہے۔ یہ الگ بات کہ امریکہ نے 11-9 کو فوراً لیا اور اب دنیا کو یوں لگے کہ جب امریکہ کو تکلیف ہوتی ہے اس کا خون بہتا ہے تو ساری دنیا کا خون بہنے لگتا ہے یا یہ کہ امریکہ کی بدقسمتی دنیا کی بدقسمتی ہے۔ 911 کے بحران کو ایسے پیش کیا گیا جیسے دنیا کا کوئی بھی باشندہ اس سے لاتعلق نہیں رہ سکا۔ 911 کو بطور ہندسے دنیا تک .... مشکل تھا مگر اب اسے ایک کیفیت اور جذبہ کی علامت بنا کر آفاقی صورت دنیا آسان ہو گیا تھا۔ بندہ کہہ سکتا ہے یا خیال کر سکتا ہے کہ آج امریکہ کے باقی دنیا سے اس قسم کے تعلقات ہمیں جیسے غلاموں کے آقا کے ہاؤس نیگرو (گھریلو حبشی غلام) سے تھے) میلکم ایکس نے نومبر 1963 میں ڈیٹورٹ میں عوام کے نام پیغام میں کہا تھا کہ ہاؤس نیگرو وہ غلام ہے جو اپنے آقا سے اتنی محبت

کرتا ہے کہ خود آقا کو اپنی ذات سے اتنی محبت نہیں ہوتی۔ مگر آقا کے گھر میں آگ لگ جائے تو ہاؤس نیگرو آگ بجھانے کے لیے اتنا کچھ کرے گا کہ اتنا ایک بھی نہیں کرے گا۔ اگر مالک بیمار پڑ جاتا ہے تو ہاؤس نیگرو اس طرح مزاج پرسی کرے گا" مالک کیا بات ہے، ہم بیمار رہیں"۔ "میلکم کی اس تقریر کی بڑی تشہیر ہوئی دیکھو (انگریزی لائن)

۲)

۳)

۴)

۵)

۶)

۷)

۸)

۹)

۱۰)

۱۱)

۱۲)

۱۳)

۱۴)

۱۵) 911 کے کمشن نے رمز فیلڈ کی باتوں کو بڑی اہمیت دی۔ قابل اعتبار گردانا اور رمز فیلڈ کے میمو (یادداشت) کے اس حصے کو رپورٹ میں شامل کیا گیا اور لکھا گیا کہ رمز فیلڈ اپنے شیروں سے "صحیح سوال" پوچھ رہا تھا... (انگریزی)

مرکونڈو لیزا رائس نے بش کے نیشنل سیکورٹی کے مشیر کی حیثیت سے 9/11 کمشن کے سامنے بیان دیا اور کہا "آپ جانتے ہیں کہ مدرسے بہت بڑا مسئلہ ہیں۔ میں خود ذاتی طور پر دو یا تین بار پاکستان کی ایک شاندار عورت سے ملی جو ملک کی وزیر تعلیم تھی اور میں نے اسے کہا کہ ہم یہ مشکل کام (مدرسوں کا) نہیں کر سکتے۔ آپ کو

خود کرنا پڑے گا۔ (انگریزی)

۱۶)

۱۷)

۱۸)

۱۹)

۲۰)

۲۱)

۲۲)

۲۳)

۲۴)

۲۵)

۲۶)

۲۷) فرائڈ مین نے گزشتہ چند سالوں میں ہندوستان کے تین چار چکر لگائے۔ حیدر آباد بنگلور میں کمپیوٹرز کے اعلیٰ افسروں کے ساتھ ان کے شیشوں والے دفتروں میں ملے۔ یہ ممکن نہیں کہ انہوں نے کمپیوٹر کی صنعت کے مزدوروں کے بارے میں کوئی بات کی۔ تاہم انہوں نے حال ہی نہیں (4 جون 2005) نیو یارک ٹائمز میں (35 گھنٹے ہفتہ؟ یا 35 گھنٹے روزانہ کے عنوان سے مضمون چھپا۔ فرائیڈ مین نیو یارک ٹائمز میں اہم لکھتا ہے۔ اس میں لکھا کہ ہندوستان ایسا ملک ہے جہاں کے مزدور بڑی خوشی سے ہفتے میں 35 گھنٹے کام کرتے ہیں۔ جبکہ یورپ والوں کے لیے 35 گھنٹے ہفتہ وار کام کرنا قبول نہیں۔ جب امریکہ کی طرف سے عراق پر مجوزہ حملہ کے مسئلے پر جرمنی اور فرانس نے امریکہ کا ساتھ نہ دیا تو رمز فیلڈ نے قابض ہو کر انہیں طنزاً ''پرانا یورپ'' کہا۔ یہی اندازِ تخاطب فرائیڈ مین کا بھی ہے جو موجودہ صورت میں یورپ کے مستقبل کے بارے میں کوئی زیادہ توجہ نہیں دیتا۔ کارل مارکس نے کاب کیپٹل کے علاوہ اور دوسری کتابوں لکھیں۔ ان میں مزدوروں کے اوقاتِ قار کے بار میں طویل جدوجہد پر بہت کچھ لکھا اور انسانی عزت و وقار کے لیے یہ سب کچھ قابل

تعریف تھا مگر فرائیڈ مین کی تحریروں میں اس کی (اوقات کار) کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اہم بات یہ ہے کہ وقت کی کچھ درجہ بندیاں بے معنی ہوتی جاتی ہیں۔ خوش وقتی یا فارغ وقتی کی فلسفیانہ علمی معاشرتی تعبیریں یا معنی ختم ہو گئے ہیں۔ عرب اس لفظ کی دنیا میں وقت کی نئی درجہ بندی مثلاً چھٹیاں، اشتراک وقت اور ورکنگ ہالیڈیز کے ساتھ گڈ مڈ کر دیا گیا ہے۔ (انگریزی 4 سطر)

۲۸) وائیڈ مین نے اپنے مضمون ''اصل تصادم تہذیبوں میں ہے'' کہا ہے کہ زیادہ واضح تو نہیں مگر ایک وجہ یہ بھی ہے کہ 11 ستمبر کی دہشت گردوں کی کارروائی کے بعد جس قسم کے جذبات کا اظہار کیا گیا اس سے امریکہ کو دراصل اسلام کے اندر کی لڑائی میں ملوث کر لیا گیا۔

۲۹)

۳۰)

۳۱)

۳۲)

۳۳)

۳۴)

۳۵)

۳۶) پہلے دو سطر انگریزی: 21 ستمبر کو امریکہ کے اخباروں میں کوئی بچپن کے قریب کارٹون چھپنے جو جڑواں ٹاور پر حملہ کے حوالے سے بنائے گئے تھے ان میں سے اکثر میں مجسمہ لبرٹی کی مختلف صورتوں میں دیکھا گیا مثلاً لبرٹی رو رہی ہے، لبرٹی درد سے دوہری ہوتی جا رہی ہے، لبرٹی کے ہاتھ کٹ گئے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

۳۷)

۳۸)

۳۹)

۴۰)

۴۱)

۴۲)

۴۳) بش خاندان کے تیل کی صنعت سے تعلق کے حوالے سے بہت سی تفتیشی رپورٹیں کی گئیں۔انگریزی

۴۴) پہلی دوسطرانگریزی
چرچل کی تقریر کے حوالے سے جو ہلہ گلہ گزشتہ دنوں ہوا میں نے اس کے بارے میں لکھا اور پھر امریکی یونیورسٹیوں میں اختلاف رکھنے والے دانشوروں پر بڑھتے ہوئے حملوں کا بھی ذکر کیا (انگریزی)

۴۵) چرچل کی ایک گستاخی جو امریکہ میں قطعاً نا قابل معافی ہے یہ ہے کہ اس نے اقتدار کے دلالوں میں .... ریشمانوں کا ذکر کیا اور اس نے جرمنی کے ہولوکامسٹ کو ایسے ہی دوسرے ظلم وستم کے برابر اہمیت دی امریکہ میں ایک خاص دانشور حلقہ ہے جس میں یہودیوں کے علاوہ دوسرے بھی شامل ہیں۔ جس کا اصول یہ ہے کہ ہولوکاسٹ تاریخ میں واحد واقعہ ہے جس کی اور کوئی مثال نہیں۔ ان کے نزدیک ہولوکاسٹ دراصل تشدد سے بھری بیسویں صدی میں انسانی تاریخ کی سب سے بڑی بدی کی مثال ہے۔
انگریزی

۴۵) انگریزی دوسطر
اس موسم گرما میں امریکی اخباروں میں دوخبروں کا زیادہ چرچا رہا، ایک خبر طالبان کے ہاتھوں بامیان (افغانستان) میں بدھ کے مجسموں کی تباہی اور دوسری ایک معروف سیاستدان کانگرس کے رکن کے گوئڈٹ کے مستقبل کے بارے میں۔ گونڈت پر الزام تھا اس نے ایک نوجوان عورت چندالیوی (جو انٹرن شپ پہ تھی) سے جنسی تعلق قائم کر رکھا ہے۔ چند ماہ پہلے لیوی اپنے واشنگٹن ڈی سی اپارٹمنٹ سے غائب ہوگئی۔ ایک سال بعد اس کے آثار (کپڑے جسم کی ہڈیاں وغیرہ) ڈھونڈھ لیے گئے تھے۔

۴۶)

۴۷)

۴۸)

۴۹)

۵۰)

۵۱)

۵۲) انگریزی
احمد رشید نے حال ہی میں ایک ٹیلی ویژن انٹرویو•29 اکتوبر) میں کہا کہ گزشتہ دو دہائیوں میں امریکہ کے پاس افغانستان کے بارے میں کوئی قابل ذکر ماہر نہیں تھا۔

۵۳) امریکہ کومختلف زبانوں کے حوالوں سے بڑی مشکلات کا سامنا رہا۔ لیوی لیفام نے کھا ہے کہ مشرق وسطیٰ اور افغانستان میں سی آئی اے کی خفیہ سرگرمیوں کی نگرانی دو سینئر افسر کررہے تھے مگر عربی اچھی طرح بول نہیں سکتے تھے اور یہ کہ ویت نام میں امریکہ بارہ برس تک الجھا رہا اس عرصہ میں صرف ایک امریکی یونیورسٹی میں ویت نامی زبان میں گریجوایشن کرنے کی سہولت تھی'' (انگریزی)

۵۴)

۵۵)

۵۶) جوناتھن شیل کے بارے میں کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ دہشت گردوں کا دوست ہے یا امریکہ مخالف جذبات کا شکار ہو چکا ہے۔ اس نے لکھا ''امریکہ دنیا کی واحد طاقت ہے جس نے وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار استعمال کیے۔ امریکہ دنیا پر غلبہ پانے کے لیے ایک بار پھر اسی قسم کے ہتھیار استعمال کرنے کے لیے بہانے تراش رہا ہے اور ممکن ہے کہ یہ ہتھیار سرزمین امریکہ پر ہی استعمال ہوں۔ (انگریزی)

۵۷)

۵۸)

۵۹)

۶۰) امریکہ کی فوجی مشین پر مؤثر روک تھامی مزاحمت اور مخالفت کے ذریعے ہوسکتی ہے۔ مگر یہ روک اور نی مخالفت بمشکل ہی نظر آتی ہے۔ ویت نام میں امریکہ کی جنگ

کے باعث بے شمار امریکی فوجی مارے گئے۔ ان اموات کی بنا پر امریکی لوگ پریشان ہوئے، جنگ کے خلاف جذبات کا اظہار ہوا، لوگوں نے جنگ کی باقاعدہ مخالفت شروع کی اور آخرکار امریکہ کو فیت نام سے فوجیں نکالنا پڑیں۔ عراق میں امریکہ کے مخالف امریکی فوجوں کو شکست سے دوچار کرنے کی طاقت تو نہیں رکھتے وہ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ مقامی سطح پر امریکی فوجیوں پر .... خون مارتے رہیں، عراق کے معاملے کو اخبارات میں نمایاں جگہ ملتی رہے۔ اور پھر ایک وہ مرحلہ آئے جب امریکی عوام ہی عراق پر قبضہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ یہ بات بھی بتانا ضروری ہے کہ ویت نام اور عراق میں عموماً ایک مماثلیت کی مثال دی جاتی ہے۔ جواب زیادہ مؤثر نہیں۔ ویت نام کی جنگ کے دنوں میں امریکہ میں شہری حلقوں کی تحریک بھی چل رہی تھی اور اسی تحریک کے کالے لیڈر یہ تقریریں کرتے پھرتے تھے کہ ملک کے اندر عوام پر ظلم اور تعلق بھی ملک سے باہر دوسرے علاقوں میں کیے جانے والے ظلم سے ہوتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے یہ ایک طرح کی معجزانہ محنت تھی (حقوق کی تحریک اور جنگ کی مخالفت کی تحریک) جس کی وجہ سے عام امریکی کو اپنے خارجہ امور کا شعور دیا گیا اور یہ تبھی ہو سکتا ہے کہ جب انہیں یہ یقین دلایا جائے کہ اگر جنگ جاری رہے تو ان کے مفادات پر بھی زد پڑے گی۔ موجودہ جنگ مخالف صورت حال ویت نامی صورت حال سے سراسر مختلف ہے۔ اس لیے جب تک یہ نہیں دکھایا جاتا کہ عراق کی جنگ کے باعث امریکیوں کا بھی نقصان ہے۔ اس وقت تک امریکی بالکل ادھر توجہ نہیں دیں گے۔ امریکیوں کی سخاوت، کشادگی، آزادی سے محبت اور عدل کا مجرد تصورات کے بارے میں امریکی سیاستدانوں کی فصاحت بلاغت کا اثر امریکیوں پر ہرگز ہرگز نہیں ہوگا نہ انہیں اس میں کوئی کشش نظر آتی ہے۔

۶۱)

۶۲)

۶۳)

۶۴) مثلاً نائن الیون کی پہلی برسی (11 ستمبر 2002) کے موقع پر جارج ڈبلیو بش

کی قوم کے نام تقریر کی مثال... ''ہمارا پختہ قومی ایماں ہے کہ ہر انسانی جان قیمتی ہے ، یہ زندگی اللہ کا انعام ہے جس کا حکم ہے کہ ہم یہ زندگی آزادی اور مساوات کے ساتھ گزاریں اور پھر سب سے بڑی بات کہ یہی بات ہمارے اور ہمارے دشمن کے درمیان حد امتیاز کھینچتی ہے۔ ہم ہر زندگی کا احترام کرتے ہیں، ہمارے دشمن جن سے ہماری لڑائی ہے کسی کا احترام نہیں کرتے۔ معصوموں کا بھی نہیں حتیٰ کہ اپنی زندگی کی بھی قدر نہیں کرتے۔ (انگریزی)

٦٥)

٦٦)

٦٧)

٦٨)

٦٩) پسین اسرام کے معنی یہ ہیں کہ جرمن نسل کو جرمنی کی سرحدوں کے اندر قید نہیں کیا جا سکتا۔ اور ملک جرمنی جرمنوں کے لیے بہت ہی چھوٹا ہے۔ جرمنی اشراف دراصل اس سے یزادہ کے مستحق ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ لفظ یا تصور ہٹلر نے متعارف کرایا تھا۔ مگر یہ تصور تو پہلی جنگ عظیم سے بھی پہلے جرمنوں میں مقبول تھا۔ پھر جب یورپ کی چھوٹی چھوٹی قومیں اپنی حدود سے باہر کھل کر طالع آزمائی کر رہی تھیں تو ان کی صورت بھی اپنا اپنا پسین سرام والی تھی اسی طرح دنیا بھر میں امریکی فوج کی دوسری جنگ عظیم کے بعد موجودگی کو نہ صرف مطلب سمجھا جاتا ہے بلکہ اسے معمول کی بات سمجھا جا رہا ہے۔ اس کی بھی پسین سرام کی تاریخ کا حصہ بننا چاہیے۔ امریکہ میں ایک اور محکمہ کھولا گیا ہے۔ محکمہ دفاع وطن۔ یہ کئی وجوہ کے باعث ناپسندیدہ بلکہ نجس ہے۔ اور پھر دیکھنا یہ ہے کہ قوم یا ملک سے ''وطن'' تک پہنچنے کے لیے کیا کیا مراحل طے کرنے پڑے اور کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے۔

٧١)

٧٢)

٧٣)

٧٤)

(۷۵

(۷۶

(۷۷

(۷۸

(۷۹

(۸۰

(۸۱

(۸۲

(۸۳

(۸۴

(۸۵